

فرہنگِ تلمیحات









ثوبان سعید

فرہنگِ تلمیحات

یہ کتاب
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

فرہنگِ تلمیحات

ثوبان سعید

کتاب : فرہنگ تلمیحات

ناشر و مصنف : ثوبان سعید

قیمت : ۱۵۵/-

تعداد : ۵۰۰

مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

تقسیم کار : **ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز**

10، میٹرو پول مارکیٹ، 2724-25، پہلی منزل، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Farhang-e-Talmihat (Glossary)

by

Sauban Sayeed

ISBN: 987-93-80934-13-6
Edition :2011
Price: **Rs.155/-**
Library Edition: Rs. 250/-

رابطہ

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی 110006
- انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی 110002
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی 110006
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 200202
- مکتبہ نعیمیہ، صدر بازار، مئو ناتھ بھنجن، مئو 275101

Printed & Distributed by

M. R. PUBLICATIONS

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books
10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 9810784549, 9873156910
E-mail: abdus26@hotmail.com

اپنی اس کاوش کو

والد محترم شفیق الرحمٰن صاحب

اور

والدۂ محترمہ خالدہ خاتون

کی نذر کرتا ہوں

جن کی تربیت

نے

ادب اور زندگی کا شعور پیدا کیا

فہرست

تلمیحات

●●●

پیش لفظ

نطق اور گویائی، اظہار خیال کا ایک بنیادی ذریعہ ہے۔ زبان ہی وہ سہارا ہے جس کے ذریعہ افراد، اپنے خیالات وتصورات، احساسات ومشاہدات اور تجربات کا اظہار کرتے ہیں، اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور ابلاغ وترسیل کی ذمہ داریوں اور پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ زبان کی کہانی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، انسان مختلف حرکتوں اور اشاروں سے ترسیل کا کام لیتا تھا۔ آخر کار زبان کا وجود ہوا اور ابلاغ وترسیل کی بیشتر ذمہ داریاں زبان نے سنبھال لیں۔ رفتہ رفتہ زبان، ارتقا کے منازل طے کرتی رہی اور غیر محسوس طور پر اس کے اصول وضوابط بھی منضبط ہوتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ معصومانہ اور فطری پیرایۂ اظہار کے مقابلے میں صنعت گری اور فنی حسن پیدا کیا جانے لگا۔ کلام کو خوبصورت اور موثر ترین انداز میں بیان کرنے کے لیے طرز ادا کے نت نئے طریقے ایجاد کیے گئے، علم بیان اور علم بدیع کی باقاعدہ ابتدا یہیں سے تسلیم کرنی چاہیے۔

علم بیان جہاں اس امر سے بحث کرتا ہے کہ کس طرح ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے بیان کیا جائے کہ ایک معنی دوسرے سے زیادہ واضح اور دلکش یعنی ایک ہی معنی پر دلالت کرنے کے لیے مختلف طریقے کس طرح استعمال کیے جائیں۔ چنانچہ علم

بیان کی مختلف شاخوں تشبیہہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ میں یہی تقاضا مدنظر رہتا ہے کہ ادائے معنی کے مختلف انداز سامنے آجائیں اور ان طریقوں سے زیادہ وضاحت، صفائی اور دلکشی حاصل ہو سکے۔ اسی طرح علم بدیع میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ معنی کی وہ خوبیاں جو بیان کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں، ان کے علاوہ اور کون سی خوبیاں ہیں جو شعر میں پیدا کی جاسکتی ہیں اور شعر کو مزید لطف و تاثیر کا حامل بنا سکتی ہیں۔ گویا الفاظ کے معنوی اور صوری حسن میں اضافہ کرنے کے لیے علم بدیع کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس کو صنائع بدائع بھی کہتے ہیں۔ تلمیح بھی صنائع معنوی کی ایک صنعت ہے جو بلاغت کے اس تقاضے کو پورا کرتی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں معانی کے خزینے دفن کر دیے جائیں۔

تلمیح کے لغوی معنی 'کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا یا کسی چیز پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنا' مراد لیا جاتا ہے، لیکن علم بدیع کی اصطلاح میں تلمیح اس صنعت کا نام ہے جس میں نظم یا نثر میں اشارے کے طور پر کسی مشہور افسانے، قصے، واقعے، احادیث و آیات قرآنی وغیرہ کا اس طرح ذکر کیا جائے کہ بغیر اس کو جانے ہوئے کلام کا لطف حاصل نہ ہو سکے۔ کلام میں مختصراً دو ایک لفظ کسی واقعے یا قصے کی طرف اشارے کے لیے رکھ دیے جاتے ہیں جس سے فوری طور پر پورے واقعے کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور شاعر تلمیح کا فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔

شاعری یوں تو ایجاز و اختصار کی حامل ہوتی ہے اور رموز و علائم اور ایمائیت کے پردے میں بڑی بڑی باتیں کہہ دینا شاعری کی فطرت اور خاصہ ہے، بالخصوص غزل میں ایمائیت اور اشاریت نے تشبیہات و استعارات کی ایک دنیا آباد کر رکھی ہے۔ اس کی وجہ بہت صاف ہے کہ اختصار، ایجاز اور جامعیت شعر کو نہ صرف موثر اور دل پذیر بناتے ہیں بلکہ اس میں گہرائی، گیرائی اور شان پیدا کر دیتے ہیں۔ نثر میں ادیب کو یہ آزادی رہتی ہے کہ وہ اپنے تصورات اور خیالات کو تفصیل اور وضاحت سے پیش کر سکے لیکن شاعر کے لیے آزادی اور رعایت کی جولان گاہ اتنی وسیع نہیں ہوتی۔ اس لیے شاعر سے اس امر کا تقاضا

کیا جاتا ہے کہ وہ رموز وعلائم، اختصار اور ایجاز کے سروسامان کے ساتھ وادیِ شعر کا سفر طے کرے۔ اس زاویے سے تلمیح ایک مہتم بالشان صنعت ہے کہ اس کی مدد سے شاعر بڑی سے بڑی بات اور طول طویل واقعات کو چند لفظوں کی مدد سے بہ سہولت ادا کر دیتا ہے مثلاً:

کشتیِ مسکین و جان پاک و دیوار یتیم
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

(اقبالؔ)

اقبالؔ کے اس شعر کی تفہیم کے لیے موسیٰ اور خضر کے واقعے کو نہ صرف جاننا لازمی ہے بلکہ کشتیِ مسکین، جان پاک اور دیوار یتیم کی پوری تفصیل سے آگاہی بھی ضروری ہے۔ اس شعر سے اس وقت تک لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا تاوقتیکہ ماضی کے اس واقعے کی پوری تفصیل مع جزئیات کے، قاری کے ذہن میں محفوظ نہ ہو۔ شاعر نے مخصوص الفاظ اور علامتوں کے ذریعہ ایک طویل واقعے کو صرف ایک شعر میں سمو دیا ہے۔ اسی طرح مومن خان مومنؔ کا ایک شعر ہے۔

اے روزِ حشر کچھ شبِ ہجراں بھی کم نہیں
بدنام ہو جہاں میں تیری بلا عبث

(مومنؔ)

مذکورہ بالا شعر میں مستقبل میں پیش آنے والے ایک واقعے کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے اور روزِ قیامت کی ہیبت ناکی اور خوفناکی کو ذہن میں رکھتے ہوئے شبِ ہجراں کی شدت اور سختی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس شعر کی تفہیم کے لیے بھی مستقبل کے اس واقعے کا کلی علم ضروری ہے۔ گویا تلمیح اپنے دامن میں ماضی اور مستقبل کے واقعات کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہے اور شعرائے کرام ان کی مدد سے اپنی شاعری کو آب و تاب اور توانائی عطا کرتے ہیں۔

ماضی اور مستقبل کے یہ واقعات تلمیح کے دامن میں صرف سرسری طور سے محفوظ

نہیں ہیں بلکہ عہد قدیم کی سیکڑوں تاریخی، سماجی، تہذیبی روایات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے تلمیح صرف صنائع معنوی کی ایک صنعت ہی نہیں رہ جاتی، وہ عہد ماضی کی روایات کی نقیب اور ترجمان بنتی ہے اور مستقبل کے واقعات کا اشاریہ اور استعارہ بھی۔

اردو زبان وادب میں جس قدر تلمیحات استعمال ہوئی ہیں ان میں بیشتر عربی اور فارسی زبان کی تلمیحوں سے مستعار ہیں۔ بالخصوص قدیم شعرا کے تلمیحی اظہار انھی زبانوں کے مرہونِ منت ہیں۔ جدید شاعروں نے بھی زیادہ تر عربی اور فارسی زبانوں سے ہی اکتسابِ فیض کیا ہے۔ اب بدلتے ہوئے تاریخی حالات میں ان زبانوں کی مقبولیت اور رواج پر کافی فرق پڑا ہے۔ ہندوستان میں ان زبانوں کا چلن پہلے کے مقابل بہت متاثر ہوا ہے، اب تو ان کے جاننے والے بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اس لیے اس بات کے امکانات اور بھی کم ہوتے جارہے ہیں کہ تلمیحات سے نئے لوگوں کو کما حقہٗ واقفیت ہوگی۔ ایک دوسری اہم وجہ یہ بھی ہے کہ تلمیحات کے موضوع پر اردو میں بے حد کم کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ جب کہ تلمیح ایک ایسی ہمہ گیر صنعت ہے کہ کم وبیش ہر زمانے کے چھوٹے بڑے شاعر نے اس صنعت کو اپنی شاعری میں ضرور برتا ہے۔ جہاں تک موجودہ وقت میں ان تلمیحوں کی تشریحات کا مسئلہ ہے تو عام طور سے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ تشریح کا ضروری مسئلہ 'فٹ نوٹ' کے ذریعہ حل کرلیا جاتا ہے اور یہ تسلیم کرلیا جاتا ہے کہ ہم تلمیح کی ذمہ داریوں اور اس کے تقاضات سے عہدہ برآ ہو چلے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ تلمیح اس سے بہت آگے کی چیز ہے اور جب تک تلمیح کی ایک ایک جزئیات سے آگاہی نہ ہو اور شعر میں مذکور مختلف تلمیحی زاویوں پر ہماری غائر نظر نہ ہو، تلمیح کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور شعر فہمی نامکمل رہتی ہے۔

تلمیحات کے موضوع پر چند کتابیں جو منظر عام پر آئی ہیں ان میں سے کچھ کا ذکر نہ کرنا دیانت داری کے خلاف ہوگا۔ اس سلسلے کی سب سے قدیم کتاب ممتاز حسین جون پوری کی تالیف "تلمیحات' ہے۔ سب سے پہلے مرحوم کے ذہن میں تلمیحات کو یکجا کرنے کا خیال

پیدا ہوا تھا۔ موصوف نے اپنی کتاب میں مختلف تلمیحات کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ تلمیح کی تعریف، غرض و غایت اور حیاتِ انسانی سے تلمیح کے تعلق پر سیر حاصل بحث کی ہے اور شعر میں استعمال ہونے والی مختلف صنعتوں کا ذکر بھی کیا ہے لیکن موصوف نے چند مثالوں کے ذکر کو کافی سمجھا اور تلمیح کی تشریح میں اختصار کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

اس سلسلے کی اگلی کتاب 'تلمیحات' ہے جس کے مرتب محمود نیازی ہیں۔ مذکورہ کتاب میں موصوف نے تقریباً ان تمام تلمیحات کو یکجا کر دیا ہے جو اردو زبان میں مروج اور مستعمل ہیں، ساتھ ہی اس بات کا مشورہ دیا ہے کہ نئی نئی تلمیحات سے ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا جائے۔ موصوف کا طریقۂ کار یہ رہا کہ پہلے کسی تلمیح کی تشریح کی اور پھر ایک دو شعر کسی شاعر کے کلام سے پیش کر دیے، بہت ساری تلمیحات ایسی بھی ہیں جن میں مثالوں کا التزام نہیں کیا گیا ہے اور تلمیح کے استعمال کی مختلف جہات اور سطحیں کیا ہیں، اس نکتے پر بھی ان کا قلم خاموش ہے۔

تلمیحات کے موضوع پر ایک اور کتاب سید حامد حسین کی ہے جس کا نام 'اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات' ہے۔ اس کتاب میں اولاً تو مثالوں کے ذکر سے صرف نظر کیا گیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ موصوف نے تلمیح کی تشریح کرتے وقت مراثی کو پیشِ نظر رکھا ہے، تشریحات بھی بے حد مختصر ہیں اور ان کا ذکر ایک مخصوص فرقے کے اعتقادات کو نظر میں رکھ کر کیا گیا ہے۔ البتہ اس سلسلے کی ایک اہم کتاب، اکبر حسین قریشی کی تالیف کردہ ہے، جس کا عنوان 'مطالعۂ تلمیحات و اشاراتِ اقبالؔ' ہے۔ یہ کتاب ان معنوں میں منفرد کتاب ہے کہ موصوف نے تلمیح کی تشریح تفصیل سے پیش کی ہے اور حوالوں کا خاص التزام بھی کیا ہے لیکن موصوف کا دائرۂ کار اقبالؔ کی تلمیحات تک ہی محدود ہے۔

اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ تلمیحات کی ایک جامع اور مبسوط فرہنگ مرتب کی جائے جس میں پہلے تلمیح کی واضح تعریف پیش کی جائے؛ اور تلمیح کے استعمال کی

مختلف سطحیں اور جہات کیا ہوتی ہیں، ان کا ذکر کیا جائے۔ تلمیح، کہاوت، اصطلاح اور تاریخ سے کن معنوں میں ممتاز ہے اور کہاں کہاں وہ ان کے متوازی نظر آتی ہے، اس نکتے پر سیر حاصل بحث ہو۔ تلمیح کی ادبی اہمیت کیا ہے اور تلمیح کیسے عہد ماضی کی نقیب اور ترجمان ہے اور تلمیح کس طرح مستقبل کے واقعات کو ہماری نظروں کے سامنے کھڑا کرتی ہے۔ جملہ نکات ومباحث کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کتاب کا خاکہ تیار کیا گیا ہے۔

کتاب کی تیاری میں یہ طریقۂ کار اختیار کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے مشاہیر اردو شعرا کے کلیات اور دواوین سے تلمیحات کو یکجا کیا گیا ہے۔ یہ بات جتنی آسانی سے کہہ دی گئی ہے حقیقتاً یہ کام اتنا ہی مشکل تھا۔ قلی قطب شاہ سے لے کر فیضؔ و فراقؔ تک اردو شاعروں کا ایک طویل سلسلہ ہے جن میں سے بیشتر شاعروں کا کلام اس کتاب کی ترتیب کے دوران پیش نظر رہا ہے۔ قلیؔ، ولیؔ، میرؔ، سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور اقبالؔ کا تو سارا کلام ہی پڑھ ڈالا۔ اس کے علاوہ آتشؔ، مصحفیؔ، اور انشاؔ کے جزوی کلام سے استفادہ کیا جاسکا۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مرثیے بھی پیش نظر رہے۔

غرضیکہ ان شعرا کے کلام سے تلمیحات کو اکٹھا کیا گیا، جب تلمیحات یکجا ہو گئیں تو ان کی تشریح کا مسئلہ درپیش آیا۔ یہ بات اوپر کہی جا چکی ہے کہ ہمارے ہاں زیادہ تر تلمیحات عربی اور فارسی زبانوں کی ادبیات سے مستعار لی گئی ہیں۔ تلمیحات کی تشریح کرتے وقت یہ بات صاف ہوئی کہ عربی کی زیادہ تر تلمیحات، اسلامی روایات کی مرہونِ منت ہیں، خاص طور پر انبیاے کرام کی تلمیحات، قرآنی واقعات اور تفسیر سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلے میں، میں نے انبیاے کرام کی تلمیحات کی تشریح کے لیے 'قصص القرآن' مولفہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہے کہ قرآنی واقعات کی بیشتر تشریحات کرتے وقت میں نے موصوف کی کتاب سے خوشہ چینی کی ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر ترجمان القرآن سے بھی استفادہ کیا ہے اور کہیں کہیں قرآن کریم کی مختلف تفسیروں سے بھی فیض اٹھایا ہے۔

فارسی تلمیحات کی تشریح کے لیے ایران بعہد ساسان کے علاوہ میر ادار و مدار 'تاریخ ادبیات ایران' پر رہا ہے لیکن سب سے زیادہ فائدہ شیروس شمسیا کی کتاب 'فرہنگ تلمیحات' سے اٹھایا۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ موصوف کا طریقۂ تشریح بے حد دلچسپ اور دل پذیر ہے۔ میں ان کی کتاب سے اس قدر متاثر ہوا کہ جابجا میں نے بھی انھی کے انداز میں تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ فارسی تلمیحات کی تشریح کرتے وقت یہ انداز کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا۔ عربی اور فارسی تلمیحات کے علاوہ بعض ہندستانی تلمیحات ہیں۔ ان تلمیحات کی بنیاد مشہور رزمیوں رامائن اور مہابھارت پر ٹکی ہوئی ہے۔ اس لیے ان کی تشریح کرتے وقت یہ رزمیے اور ان سے متعلق کتابیں پیش نظر رہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ تلمیح کی تشریح کرتے وقت موقع محل کے لحاظ سے اشعار کو بطور مثال پیوست کر دیا گیا ہے۔ اس لیے شعر فہمی میں یقینی طور پر سہولت پیدا ہوگی، مزید اس شعر کی خوبیوں اور خامیوں کو پہچاننے میں آسانی اور سہولت پیدا ہوگی۔ پھر ایک واقعے کے مختلف زاویے اور جہات ہوتے ہیں اور شعرا نے ان تمام زاویوں اور جہات پر اشعار کہے ہیں، اس لیے اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ کسی مخصوص واقعے کے زیادہ سے زیادہ جہات اور زاویے سامنے آسکیں۔ مثالوں کے ذکر میں خاص معیار اور دقت نظر سے کام لیا گیا ہے تا کہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ تلمیح عبقری شعرا کے ہاتھوں میں پہنچ کر کتنی ہمہ گیر اور آفاقی بن جاتی ہے۔ اگر کسی بڑے شاعر کے کلام سے مثالیں پیش نہیں کی جاسکیں تو دوسرے درجے کے شعرا کے کلام سے ان مثالوں کو درج کیا گیا ہے۔

یہ تصنیف دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ مقدمہ ہے اور دوسرا حصہ تلمیحات کی فرہنگ پر مشتمل ہے۔ مقدمے والے حصے میں مختلف ذیلی عنوانات کے تحت تلمیح کی تعریف و توضیح اور اس کی اہمیت و افادیت سے بحث کی گئی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ تلمیح دوسرے صنائع کی طرح صرف اکہری صنعت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے دامن میں گلہائے رنگارنگ رکھتی ہے۔ مقدمے کے ذیلی عنوانات حسب ذیل ہیں۔

- تلمیح کی تعریف و توضیح
- تلمیح اور تاریخ، تلمیح اور ضرب الامثال، تلمیح اور اصطلاح
- تلمیح بصورت تشبیہہ، تلمیح بصورت استعارہ، تلمیح بصورت مجازِ مرسل، تلمیح بصورت کنایہ
- تلمیح بصورت حسن تعلیل، تلمیح بصورت ایہام، تلمیح بصورت تفریق، تلمیح بصورت ترصیع، تلمیح بصورت تلمیع
- تلمیح بصورت سوال و جواب، تلمیح بصورت لف ونشر، تلمیح بصورت مبالغہ، تلمیح بصورت محاورہ
- تلمیح بصورت ضرب الامثال
- تلمیح کے ماخذ: دیومالائیں، مذہبی قصے اور واقعات، تاریخی واقعات، مذہبی عقائد، فرضی قصے، رسوم ورواج، ضرب الامثال، مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات

دوسرے حصے میں تلمیحات کی فرہنگ پیش کی گئی ہے۔ فرہنگ کے سلسلے میں ایک اعتراف یہ کرنا ہے کہ اس میں صرف تاریخی اور مذہبی قصوں اور واقعات کی تشریح کی گئی ہے۔ کچھ ایک فرضی اشخاص اور ان کی تفصیلات کو پیش کیا گیا ہے۔ کچھ مقامات پر مذہبی عقائد کا بھی بیان کیا گیا ہے لیکن ضرب الامثال، رسوم ورواج اور مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات سے اغماض برتا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ یہ فرہنگ اشخاص اور اعلام اور بعض بنیادی عقائد کی فرہنگ ہے، رسم ورواج اور ضرب الامثال اور محاوراتی تلمیح کی کوئی تفصیل یہ فرہنگ پیش نہیں کرتی۔

اس فرہنگ سے استفادے کا طریقہ یہ ہے کہ تلمیح کو حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے تلاش کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ایک تلمیح 'وادیِ نجد' اور دوسری تلمیح 'ناقۂ لیلیٰ' ہے۔ دونوں ایک ہی تلمیحی واقعے لیلیٰ مجنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اول الذکر کو وادیِ نجد میں تلاش کیا جائے گا اگر اس کی تشریح وہاں دستیاب نہ ہوگی تو یہ ضرور تحریر ہوگا کہ اس کی تفصیل کس تلمیح کے تحت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ موجودہ صورت میں لیلیٰ مجنوں کے ذیل میں وادیِ

نجد کی تشریح دستیاب ہوگی۔ یہی حال 'ناقۂ لیلیٰ' کا بھی ہے۔ ناقۂ لیلیٰ، حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے اپنی اصلی جگہ پر رقم ہوگی لیکن اس کی تشریح لیلیٰ مجنوں کے ذیل میں مل سکے گی۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ بہت ساری تلمیحات ایسی ہیں جن میں تلمیحی پہلو تو کئی ایک ہیں لیکن ان کی تفصیل کم وبیش ایک جیسی ہے۔ ایسی صورت میں بار بار اور جا بجا ذکر کرنے سے تکرار لازم آتی اور کتاب کی ضخامت خواہ مخواہ بڑھتی جاتی۔ اس لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ تلمیحات کی تشریح بنیادی عنوان کے تحت ذکر کردی جائے اور ذیلی تلمیحات کے تحت ان کے اشاریے تحریر کردیے جائیں کہ مذکورہ تلمیح کی تشریح کہاں دستیاب ہوگی۔

یہ تصنیفی سفر میری ذاتی مصروفیتوں اور کوتاہیوں کی بنا پر خاصا طویل ہوگیا۔ یہ بات 1995ء کی ہے۔ جب اس کا تصنیفی خاکہ ذہن میں آیا لیکن ابھی یہ کام ابتدائی مراحل میں ہی تھا کہ میں بہ سلسلۂ ملازمت پیلی بھیت آگیا۔ پھر رفتہ رفتہ دس سال کس طرح گزر گئے، اس کا اندازہ نہ ہوا۔ کبھی کبھی کام چل نکلتا اور جب کبھی رک جاتا تو مدتوں ادھر تاکنے کی فرصت اور ہمت نہ ہوتی۔ لیکن 2005ء کے بعد میں نے موقع نکال کر اس کام کی جانب توجہ دی اور اب، جب کہ یہ کتاب ترتیب وتسوید کے مراحل سے گزر کر تکمیل سے ہم کنار ہوئی؛ خوشی کا مرحلہ ہے۔ عربی زبان کا مقولہ ہے 'اھل البیت ادری بمافی البیت' (صاحب خانہ ہی جانتا ہے کہ اس کے گھر میں کیا ہے) مجھے بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ جو خاکہ میرے دل ودماغ نے مرتب کیا تھا، ویسا کام میں کرنہیں سکا ہوں۔ پھر بھی مجھے امید ہے کہ تلمیحات کی تفہیم میں میرا یہ کام کچھ لوگوں کی تشنہ آرزوؤں کی آسودگی کا سامان فراہم کرسکے گا۔

کتاب کی تیاری میں مختلف دانش گاہوں کی لائبریریوں اور پبلک لائبریریوں کا تعاون شامل حال رہا ہے۔ جن لائبریریوں سے میں نے استفادہ کیا ان میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور بنارس ہندو یونیورسٹی کی لائبریریاں خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں، میں ان کے ذمہ دار حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

پبلک لائبریریوں میں امیر الدولہ پبلک لائبریری، لکھنؤ، صولت پبلک لائبریری، رام پور، دانش کدہ، مئو، لائبریری جامعہ سلفیہ بنارس اور رام پور رضا لائبریری کا ذکر لازمی ہے۔ رام پور رضا لائبریری میں برادر مکرم ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی کی نوازشوں کا ذکر خاص طور سے ضروری ہے کہ موصوف کی اعانت کے بغیر بعض بنیادی اور اہم کتابوں سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے خصوصی دل چسپی لے کر مطلوبہ کتابیں فراہم کیں اور ان کے عکس مہیا کرائے، میں ان کا احسان مند ہوں۔ اپنے جملہ اساتذۂ کرام کا بھی شکرگزار ہوں خصوصی طور سے ڈاکٹر اسلم پرویز اور ڈاکٹر انور پاشا صاحبان کا جن کی رہ نمائی، حوصلہ افزائی، مشفقانہ مشوروں اور تہدید کے بغیر یہ کام موجودہ شکل میں نہیں آسکتا تھا۔ عزیزانِ گرامی فیضان سعید اور محمد جابر زماں کی خاطر میرے لب پر دعائیں ہیں کہ دونوں نے نہ صرف محنت، دل جمعی اور سنجیدگی سے اس کتاب کا پروف پڑھا بلکہ اس کو حسنِ ظاہری سے آراستہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پریس کے حوصلہ شکن چکروں اور طباعت کے بکھیڑوں سے مجھے آزاد رکھا، یقینی طور سے وہ سب خاص شکریے کے مستحق ہیں، ان کا شکریہ!

پیلی بھیت　　　　　　ثوبان سعید

12/ ستمبر 2010ء

مقدمہ

زبان، انسانی جذبات واحساسات اور تخیلات کے اظہار کا موثر ترین وسیلہ ہے۔ زبان کے سہارے انسان اپنے دل ودماغ میں موج زن خیالات واحساسات اور تصورات کو گویائی عطا کرتا ہے اور اپنے مافی الضمیر کو بہتر طریقے پر ادا کرتا ہے۔ یہ بہترین طریقۂ اظہار ہے اور انسانی ذہن ہمیشہ اس امر کا متلاشی رہا ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کے لیے بہتر سے بہترین اور موثر سے موثر ترین طریقۂ اظہار اختیار کرے تاکہ مخاطب بھی اس کی فکر اور سوچ کو اسی شدت اور صداقت کے ساتھ محسوس کر سکے، احساس کی جس شدت اور گرمی نے قائل کے دل ودماغ اور قوت اظہار کو برانگیختہ کیا تھا۔ ایک مفکر کے لفظوں میں ''انسان میں ہمیشہ یہ صلاحیت بڑھتی رہی ہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ وسیع اور زیادہ گہرے معانی حاصل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک تہذیب یافتہ شخص جس کے ذوق جمال کی تربیت ہوتی ہے، تاج محل کو دیکھتا ہے تو اسے اس عمارت میں ایک ایسا حسن دکھائی دیتا ہے جو ایک ناواقف بچے یا ایک جاہل بالغ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتا''۔

غرضیکہ انسان اپنے خیالات واحساسات کے بہتر اظہار کے لیے ہمیشہ کوشاں رہا۔ وہ ہمیشہ اس بات کا متلاشی رہا کہ اس کے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے موثر ترین طریقے اور ترسیل خیالات کے نئے نئے پہلو سامنے آتے رہیں۔ ساتھ ہی ادائے مطلب کے دوران دامنِ ادب بھی ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔ مہذب انسان نے اس کے لیے

رمز واشارہ اور کنایے کے دامن میں پناہ لی، جہاں کچھ اور بھی ذرائع اس کے ہاتھ لگے۔ کبھی تشبیہ کی شکل میں، کبھی استعارے کی صورت میں اور کبھی علم معانی و بدیع کی دوسری مختلف صنائع کی شکل میں۔ ان تمام خوبیوں کو برتنے کے پیچھے یہی جذبہ اور محرک کام کرتا رہا کہ ادائے خیالات کے نئے نئے سانچے مہیا ہوں اور مخاطب کے دل ودماغ میں اشیا اور محسوسات کی صحیح تصویر کشی ہو سکے۔

تلمیح بھی انھیں طریقہ ہائے اظہار میں سے ایک موثر طریقہ ہے۔ علمائے ادب اور شاعروں نے تلمیح کا بے ساختہ استعمال کیا، اس سے کلام میں وسعت پیدا ہوئی، کلام، اختصار کی وادیوں سے نکل کر ایجاز کی سرحدوں میں پہنچ گیا۔ معنی ومطالب کے نئے نئے شگوفے کھلے۔ حقیقت میں تلمیح کی غایت اصلی بھی یہی ہے کہ اس کے اشارے میں لطافت اور دل چسپی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ شاعرانہ تخیل کو برق رفتاری ملے، واقعے اور قصے کی چاشنی اور تجسس بھی ہو، درد واثر اور تڑپ بھی موجود رہے، کوزے میں دریا بھی سمایا رہے اور باوجود ان خصوصیات کے فنی ضرورتوں اور تقاضوں سے اس کا دامن خالی نہ ہونے پائے۔

ادب کے تقاضوں نے تلمیح کی ضرورت کو محسوس کیا اور وہ شاعر کے فکر رسا میں ایک فطری ضرورت بن کر ظاہر ہوئی۔ جس طرح اشیائے خورد ونوش، انسانی حیات اور بقا کے لیے لازمی ہیں اسی طرح بقائے ادب کا حال ہے۔ اس کو بقائے دوام اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس کے دامن میں اشارات، اصطلاحات، واقعات، روایات اور تلمیحات کے وافر ذخیرے موجود ہوں۔ مولوی وحید الدین سلیم، ایک امریکی انشاپرداز آسبورن کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

> ''وہ تلمیحات کیا ہیں؟ ہماری قوم کے قدموں کے نشان ہیں جن پر پیچھے ہٹ کر ہم اپنے باپ دادا کے خیالات، مزعومات، اوہام، رسم ورواج اور واقعات وحالات کے سراغ لگا سکتے ہیں۔''(1)

گویا تلمیح اپنے اندر ماضی کے شاندار کارناموں کا ایک دفتر پنہاں رکھتی ہے۔ اور

سیکڑوں اور ہزاروں سال کی روایات کو صرف ایک لفظ کے تصور سے آنکھوں کے سامنے محاکاتی انداز میں پیش کر دیتی ہے مثلاً طوفانِ نوح کہتے ہی وہ تمام طوفانی واقعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جو حضرت نوح کے زمانے میں پیش آئے تھے۔ صور اسرافیل کا لفظ لاتے ہی ذہن مستقبل کے ان تمام متوقع اور ہیبت ناک واقعات کو محسوس کرنے لگتا ہے جو قیامت کے دن پیش آئیں گے۔ یہ مثالیں ہمارے بزرگوں کی میراث اور نشانیاں ہیں جن کے نقوش سے نہ صرف ہماری رہنمائی اور ہدایت ہوسکتی ہے بلکہ ان کے مزعومات وعقائد اور رسم ورواج کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس افادی پہلو کے ماسوا ہم دیکھتے ہیں کہ تلمیح کے سہارے وسیع اور طویل مطالب کو چند الفاظ کے اشاروں سے نہایت اختصار کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ادائے مطلب میں کوئی پیچیدگی اور گنجلک نہیں ہوتی بلکہ اختصار کے ساتھ معنویت اور اثر میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہی وہ خوبی ہے جو تلمیح میں بلاغت کی شان پیدا کر دیتی ہے۔

بلاغت کے اس قدر معنی ذہن نشین کر لینا نہایت اہم ہوگا:

> ''بلاغت کلام وہ ہے جس میں بات کا مناسب محل ہو اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی پوشیدہ ہوں اور یہ حسن جس قدر تلمیحات میں پایا جاتا ہے الفاظ کی دیگر اقسام میں نہیں پایا جاتا۔''(2)

مندرجہ ذیل شعر میں ایک وسیع مطلب کو تلمیح کے پیرایے میں کتنے موثر انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس کی تفصیل اور تشریح سے ہوسکے گا۔

قصوروار، غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کرسکے آباد
(اقبالؔ)

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کے جسد خاکی کو تیار کر اس میں روح پھونکی تو ان کی جائے قیام جنت بنائی، لیکن آدم کی پیدائش کا مقصد حقیقی یہ نہیں تھا بلکہ آدم کے ذریعہ دنیائے فانی

کو آباد کرنا تھا اور اس دنیا کے اندر ایک نظام ترتیب دینا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے آدمؑ کچھ عرصہ تک جنت میں گزارنے کے بعد اس فرشِ خاکی پر بھیج دیے گئے۔ آدم کو زمین پر بھیجنے کی مصلحت بجز خدا کے، فرشتوں تک کو معلوم نہ تھی۔ اسی لیے اول اول فرشتوں نے آدم خاکی کی تخلیق اور وجود پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا مگر بعد میں پھر انھیں اپنی لاعلمی اور عدم واقفیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ بات خدا ہی کو بہتر طریقے پر معلوم تھی کہ تخلیق آدم کی غایت اصلی کیا ہے، فرشتے اس کے اہل نہ تھے کیونکہ دنیا کا نظام چلانے کے لیے فرشتوں میں وہ صلاحیت نہ تھی جس سے نظام کائنات رفتار پا سکتا۔ دنیا کو آباد کرنے اور اس کے نظام کو مضبوطی عطا کرنے کے لیے آدم خاکی ہی موزوں ومناسب تھا۔ چنانچہ آدم شجر ممنوعہ کا پھل کھا کر جنت بدر کر دیے گئے اور زمین پر آکر خلافت خداوندی کے فرائض اور ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

اس شعر میں اس طول طویل مطلب کو کس خوبی اور حسن کے پیرایے میں ادا کیا گیا ہے۔ غریب الدیار کی تلمیح حضرت آدم کے لیے ہے اور خرابہ کی تلمیح سے غیر آباد دنیا مراد لی گئی ہے جسے آدم نے آباد کی تھی۔ محض تلمیح کے سہارے اس قدر طویل مطلب کو کم سے کم الفاظ میں نہایت موثر انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے یہ نکتہ بھی بخوبی واضح ہوتا ہے کہ بلاغت کا ایک اہم پہلو اور مطالبہ تلمیح سے اجاگر ہوتا ہے۔ اسی سبب سے تلمیح کو بلاغت کا ایک روپ سمجھنا چاہیے جو ضرورتِ انسانی کا لازمی جزو بن گئی ہے۔ تلمیح کا فلسفہ بھی نہایت وسیع ہے۔

تلمیح کا ایک فلسفیانہ پہلو یہ ہے کہ اس میں ہمارے آبا واجداد کی نشانیاں، نقشِ ہائے قدم، اوہام وعقائد اور روایات کا ذخیرہ پوشیدہ ہے۔ تلمیح میں افراد اور قوم کے رمزیات، کنایات، اشارات اور تخیلات کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جو نسلاً بعد نسل خاندانی روایات اور عقائد کے طور پر اگلی نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہے، اس میں اسلاف کے کارناموں کا بیان ہوتا ہے۔

اسلاف کے ان کارناموں میں اس زمانہ کی طرز معاشرت، تمدن، ذہنی نشوونما، افکار و خیالات، الجھنیں اور مسائل، توہمات اور عقائد کی مہریں ثبت ہوتی ہیں اور یہ تمام چیزیں ان کے جذبات و احساسات اور خیالات کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ تلمیح یہیں آکر تاریخ سے آگے کی چیز بن جاتی ہے۔ تاریخ، ماضی کے جن نہاں خانوں تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی، یا جو واقعات اور روایات اس کی نگاہوں سے بچ رہتے ہیں یا جن واقعات کو وہ ناقابل اعتنا سمجھتی ہے، تلمیح انھیں اپنے دامنِ عاطفت میں پناہ دیتی ہے۔ واقعۂ کربلا اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ تاریخ کے اوراق میں کربلا کے واقعات کا ذکر مختصر طور سے ہی ملے گا لیکن تلمیحات کے ہزار پہلو اور زاویے ہیں، شاعروں نے کربلا کے واقعات بیان کرتے وقت جن سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح سے تلمیح کی آنکھوں سے تاریخ کے پوشیدہ پہلو بھی اجاگر ہوتے ہیں اور ہم تلمیح کی آنکھوں سے تاریخ کا دیدار کرتے رہتے ہیں۔ تلمیح کا یہ فلسفہ نہایت اہم اور وسیع ہے اور اس خوبی کی بنا پر تلمیح، انسان کے خیال اور حیات کی مجمل تاریخ کہلائی جانے کی مستحق ہے۔

یہ بات صاف ہوگئی ہے تلمیح کے دامن میں ہمارے آباواجداد کے تصورات و خیالات، اوہام و عقائد اور خرافات و روایات بستے ہیں اور تاریخ جہاں ہماری رہنمائی کرنے سے عاجز رہ جاتی ہے، تلمیح ہمارا دامن تھامتی ہے اور عہد ماضی کی سیر کراتی ہے۔ تلمیح کا کہانیوں سے بھی رشتہ بڑا عجیب ہے۔ قصہ گوئی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ عہد طفلی سے لے کر بڑھاپے تک انسان میں قصہ گوئی کے تئیں دلچسپی باقی رہتی ہے اور تلمیح اس کی خواہش کی تکمیل کرتی ہے۔ دراصل قصہ گوئی، تلمیح کا ایک روشن عکس ہے جو تمدن کے گہوارے میں پرورش پاتا رہتا ہے اور یہ صفت ابتدائے آفرینش سے لے کر زمانۂ حال تک ہمارے آباواجداد کے دامن سے لپٹی چلی آرہی ہے۔

تلمیح کا فلسفہ جان لینے کے بعد ہمارے ذہن میں لاشعوری طور پر یہ بات گردش کرنے لگتی ہے کہ آخر تلمیح کس کو کہتے ہیں؟ وہ ایسی کون سی صنعت ہے جس کے سایے تلے

تاریخ رقم ہوتی ہے اور جس کی وسعت اور گیرائی کے آگے تاریخ بھی اپنا سر تسلیم خم کرتی ہے۔ تلمیح سے کیا مراد ہے؟ تلمیح کی جامع و مانع تعریف کیا ہے؟ اس سلسلے میں حقیقت واقعہ یہ ہے کہ تلمیح کی کوئی تعریف ابھی تک ایسی نظر نہیں آئی جو اتنی اہم اور ہمہ گیر صنعت کی جامع و مانع تعریف کہلائی جانے کی مستحق بن سکے۔ حالانکہ مختلف ادیبوں، نقادوں اور زبان وادب کے ماہرین نے اس سلسلے میں الگ الگ آرا ضرور تحریر کی ہیں۔ لیکن ان سبھی تعریفات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تلمیح کی جامع و مانع تعریف سے علم معانی و بدیع اور بلاغت کی کتابیں خالی ہیں۔ تعریفات، ناقص اور ادھوری ہیں۔ وہ تلمیح کے تمام پہلوؤں اور خصائص کا احاطہ نہیں کر پاتیں۔ مثلاً کسی نے صرف یہ خیال ظاہر کیا کہ اس کا حوالہ کسی قصہ کی طرف ہوتا ہے۔ کسی کے نزدیک آیاتِ قرآنی کا نظم کرنا، علم موسیقی یا علم نجوم کی اصطلاحات کا لانا ہی تلمیح ہے۔ بعض علمائے ادب نے صرف تاریخی واقعات کے ذکر اور اشارے کو ہی کافی جانا وغیرہ وغیرہ۔ ان حالات کے مدنظر زیادہ مناسب اور سائنسی انداز یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم وجدید فرہنگوں، لغات اور علم بیان کی کتابوں سے اقتباسات فراہم کیے جائیں اور ان کے منطقی جائزے سے کوئی ایسی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی جائے کہ تلمیح کی جامع و مانع تعریف کی طرف پیش قدمی ہو سکے اور تلمیح کا ایک واضح اور روشن تصور ہمارے ذہن میں قائم ہو سکے، جو بلاغت کے معیار پر پورا اترے اور ادبی ضروریات کی تسکین کا سامان بھی فراہم کرے۔

عام طور پر کسی بھی صنعت، علمی خیال اور علمی اصطلاح کی تعریف دو حیثیتوں سے کی جاتی ہے۔ لغوی اور اصطلاحی۔ تلمیح کی تعریف میں بھی یہ دونوں حیثیتیں کارفرما ہیں۔ ذیل میں کچھ اہم اہم تعریفات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جواہر الحروف میں تلمیح کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

''کلام میں کسی شعر یا قصہ یا مشہور مثل کی طرف اشارہ کرنا'' (ترجمہ)[3]

معیار البلاغت کے الفاظ ہیں:

''تلمیح یا تملیح وہ صنعت ہے کہ کلام مشتمل ہو کسی قصۂ معروف یا کسی مضمونِ مشہور پر۔''(4)

طور کو نور کے جلوے میں جلایا اس نے
کبھی آتش کو ہے گلزار بنایا اس نے
(سرور)

مصنف غیاث اللغات کہتے ہیں:

''لغوی معنی بجائے مہملہ نگاہ سبک کردن بسوئے چیزے از منتخب و باصطلاح اہل معنی، اشارت کردن درکلام بقصہ یا آوردنِ اصطلاحات نجوم وموسیقی وغیرہ یا درکلام خود آوردنِ آیات قرآنِ مجید یا احادیث۔''(5)

صاحب المعجم، شمس قیس تلمیح کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''تلمیح آن ست کہ الفاظ اندک بر معانی بسیار دلالت کند ولمع جستن برق باشد ولمحہ یک نظر بود، چوں شاعر چناں سازد کہ الفاظ اندک بر معانی بسیار دلالت کند آن را تلمیح خوانند۔ وایں صنعت بہ نزدیک بلغا پسندیدہ تر از اطناب است ومعنی بلاغت آن ست کہ آنچہ درضمیر باشد، بہ لفظی اندک بے آنکہ بہ تمام معنی آں اخلالے راہ یابد، بیان کند۔''(6)

معیار اللغات میں تلمیح کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''تلمیح یا تملیح وہ صنعت ہے کہ کلام مشتمل ہو کسی قصۂ معروف یا کسی مضمونِ مشہور پر۔

حاجت نہیں نماز کی مستی میں زاہدا
کیا مرتبہ خدا نے دیا ہے شراب کو
(ناسخ)

اس شعر میں قرآن کی آیت ''لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ'' کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔''(7)

عربی لغات فیروزی میں تلمیح کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

''تلمیح، کسی چیز کی طرف ہلکی نظر سے اشارہ کرنا، اصطلاحِ علم معانی میں کسی قصے یا علمی اصطلاح کی طرف اشارہ کرنا یا اپنے کلام میں قرآن شریف کی کوئی آیت یا حدیث لانے کو کہتے ہیں۔''(8)

ایک اور لغت موسومہ جامع اللغات میں یوں لکھا ہے:

''کسی چیز کی طرف سبک نگاہ سے دیکھنا اور اپنے کلام کو آیات و احادیث سے ثابت کرنا۔''(9)

قدیم اردو الفاظ کی ایک اور مشہور لغت، لغات کشوری میں تلمیح کی تعریف کے ضمن میں یہ الفاظ تحریر کیے گئے ہیں:

''سبک نگاہ کرنا کسی چیز کی طرف اور اصطلاحِ اہل معانی میں اشارہ کرنا اپنے کلام میں کسی قصہ کی طرف، یا اصطلاحات نجوم یا موسیقی کا لانا یا اپنے کلام میں آیات قرآن شریف یا احادیث کا لانا۔''(10)

فرہنگ آصفیہ کے لفظوں میں:

''تلمیح، اسم مونث، علم بیان کی اصطلاح میں کسی قصے وغیرہ کا کلام میں اشارہ کرنا۔''(11)

عربی کی ایک لغت المنجد میں یوں مذکور ہے:

''تلمیح کے معنی اشارہ کرنا کسی واقعہ کا شعر میں، لمح تلمیحا۔ الی الشئی: اشار الیہ۔''(12)

مختصر المطول میں تلمیح کا ذکر مختصر تفصیل کے ساتھ یوں کیا گیا ہے:

''تلمیح کسی چیز کو یا کسی چیز کی طرف دیکھنا، لغوی معنی۔ کلام میں کسی قصہ یا شعر یا مشہور مثل کی طرف اشارہ کرنا بشرطیکہ قصہ یا مثل یا شعر کو ذکر نہ کیا جائے، اصطلاحی معنی۔''(13)

مولانا شبلی شعر العجم میں تلمیح کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''صنائع شاعری میں ایک چیز تلمیح یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا ایک لطیف صنعت ہے۔''(14)

بحر الفصاحت میں تلمیح کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے، اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

''صنعتِ تلمیح جس کو تملیح بھی کہتے ہیں اور یہ مناسب نہیں، اس لیے کہ تملیح میم کی تقدیم کے ساتھ لام پر شے ملیح کے لانے کے معنی میں ہے جیسے تشبیہ و استعارہ میں اور تلمیح تقدیم لام کی میم پر، کسی چیز کی طرف نظر کرنے کو کہتے ہیں۔ پس یہ معنی خاص ہیں اس لیے کہ شے ملیح کا لانا عام ہے کسی شعر یا قصے یا مثل کی طرف نظر کرنے سے۔

بہر صورت یہ صنعت اس طرح ہے کہ شاعر اپنے کلام میں کسی مسئلۂ مشہورہ یا کسی قصہ یا مثل شائع یا اصطلاح نجوم وغیرہ کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرے جس کے بغیر معلوم ہوئے اور بے سمجھے اس کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے۔

عاشق اس غیرتِ بلقیس کا ہوں میں آتش
بام تک جس کے کبھی مرغِ سلیماں نہ گیا
(آتش)

اس شعر میں اشارہ ہے قصہ بلقیس کی طرف جو مفصل کلامِ الٰہی میں مذکور ہے۔ ہدہد کا خبر دینا اور حضرت سلیمان کا خط بلقیس والیِ ملک سبا تک پہنچانا اور پھر بلقیس کا حاضر ہونا مشہور قصہ ہے۔''(15)

مولانا امام بخش صہبائی نے حدائق البلاغت کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مترجمہ حدائق البلاغت میں تلمیح کی تعریف یوں ملتی ہے۔

''صنعت تلمیح یہ اس طرح پر ہے کہ کتب مستعملہ میں مذکور ہو جیسے شعر سودا کا:

دکھلایئے لے جاکے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا
(سودا)

اس شعر میں اشارہ ہے طرف قصہ حضرت یوسف کے، کہ وہ مشہور ہے۔"(16)

ذخیرۂ ادب المعروف بہ ذخیرۂ ادبیات میں تلمیح کا ذکر یوں ہوا ہے:

"صنعت تلمیح جب کسی شعر میں کسی مشہور قصہ یا واقعہ کی طرف اشارہ یا کسی مسئلہ کی طرف جس کا بیان کسی مسائل کی کتاب میں مذکور ہوا ہو، اشارہ ہو مثلاً:

اس شعلہ رو کے رخ پہ جو خط کی نمود ہے
کیا آتشِ خلیل کا یارب یہ دود ہے

آتشِ خلیل میں تلمیح ہے۔"(17)

فارسی لغت آصف اللغات میں تلمیح کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

"تلمیح بروزن تفعیل، لغت عرب است بمعنی نگاہ سبک کردن بسوئے چیزے وباصطلاح اہل معنی اشارت کردن درکلام بقصہ یا آوردن اصطلاحات نجوم وموسیقی وغیرہ یا آیات قرآن مجید یا احادیث وغیرہ۔"(18)

تلمیح کی تعریف کے ضمن میں مرزا محمد عسکری کے خیالات یہ ہیں:

"تلمیح (allusion) سے مطلب ہے کہ کسی شعر میں تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا جاوے۔ انگریزی میں علاوہ تاریخی واقعات کے رومی ویونانی اصنامیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور اس کی متعدد مثالیں انگریزی میں موجود ہیں۔"(19)

ایک دوسری جگہ تلمیح کا ذکر مختصراً اس طرح ہوا ہے:

"شعر میں کسی مشہور تاریخی واقعہ، قصہ یا مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا۔"(20)

صنعت تلمیح کی ایک اور تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

''تلمیح (بہ یائے معروف) کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا۔ علم بیان کی اصطلاح میں ایک صنعت کا نام جس میں شاعر اپنے کلام میں کسی مشہور مسئلہ یا کسی قصہ یا مشہور مثل یا اصطلاحِ نجوم وغیرہ کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرے جس کے بغیر معلوم ہوئے اور بے سمجھے اس کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے۔ عربی مونث۔ علم بیان کی اصطلاح۔

درِ معنی سے مرا صفحہ: لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ: عمرو کی زنبیل
(غالبؔ)

مشہور ہے کہ لقا کی ڈاڑھی کے ہر ہر بال میں موتی پروئے جاتے تھے اور عمرو کی زنبیل میں جو کچھ پڑتا تھا، غائب ہوجاتا تھا، وہ کبھی پر نہ ہوتی تھی۔ اس شعر میں انھیں باتوں کی طرف اشارہ ہے۔''[21]

ایک اور مقام پر تلمیح کی تعریف اس قدر ملتی ہے۔

''تلمیح: وہ صنعت ہے جس میں متکلم اپنے کلام کے اندر کسی آیت، حدیث، مشہور شعر، قصے یا ضرب المثل کی جانب اشارہ کرے۔'' (ترجمہ)[22]

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اردو زبان کے صنائع بدائع اور علم بیان و معانی کا بیشتر سرمایہ عربی اور فارسی زبانوں سے مستعار لیا گیا ہے۔ اردو نے انھی دو زبانوں کے صنائع بدائع کو معمولی ترمیم و اضافے کے ساتھ قبول کرلیا ہے اور انھیں اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ خواہ ان کا تعلق تعریفات سے ہو یا شعر و نثر میں ان کو برتنے کے طریقۂ کار سے۔ اسی غرض سے مذکورہ بالا سطور میں عربی، فارسی اور اردو کے مستند لغات اور اہم فرہنگوں سے تلمیح کی تعریف نقل اور یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ تینوں زبانوں کی روشنی میں تلمیح کا ایک عمومی تصور اور مجموعی شکل ابھر کر سامنے آسکے اور اس کی روشنی میں تلمیح کی جامع اور مانع تعریف متعین کی جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی یہ نامناسب نہ

ہو گا کہ ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں میں تلمیحات کے تصورات اور تعریفات کو بھی پیش کیا جائے تا کہ تعریف متعین کرتے وقت ان زبانوں کے نقطۂ نظر بھی پیش نظر رہیں۔

ہندی میں تلمیح کے مترادف کے طور پر متعدد الفاظ استعمال میں ہیں۔ اس کو کئی ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بعض لغت نویسوں نے انتر کتھا، بعض نے سندربھ اور بعضوں نے سنکیت کے ساتھ اس کی تعبیر کی ہے۔ اس مقام پر چند ایک رائے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بار مانک ہندی کوش میں لکھا ہے:

> ''تلمیحی پیرایے میں کوئی کہی ہوئی بات کو چھپے ہوئے انداز میں کہنا، وہ بات کوئی حوالہ یا واقعہ ہو۔'' (ترجمہ)(23)

ایک اور ہندی لغت اردو ہندی کوش کے الفاظ یہ ہیں:

> ''مصنف اپنی تصنیف میں کسی قصہ، یا قرآن کی آیت کا ذکر کرے۔'' (ترجمہ)(24)

ایک سنسکرت۔ انگلش ڈکشنری میں یوں لکھا گیا ہے:

> ''تلمیح (سنکیت) وہ ہے جس میں کوئی وصف کی بات بیان کی جائے۔'' (ترجمہ)(25)

اسی ضمن میں انگریزی زبان میں تلمیح کے تصور کی وضاحت ضروری ہے، تا کہ تلمیح کی تعریف کی تعیین کرتے وقت ان تعریفات سے بھی استفادہ کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں ایک انگریزی لغت کے الفاظ یہ ہیں:

> "Allusion: Something that is said or written that refers to or mentions another person or subject in an indirect way"

> ''تلمیح: تحریر و تقریر میں کسی ایسی بات کا ذکر کرنا جس میں کسی اور چیز یا شخص یا مضمون کی طرف بالواسطہ طور پر اشارہ موجود ہو۔'' (ترجمہ)(26)

ایک اور جگہ تلمیح کے بارے میں یہ عبارت درج کی گئی ہے:

"A reference to anything not directly mentioned."

''حوالہ کسی چیز کی طرف جس کا ذکر براہِ راست نہ ہو۔'' (ترجمہ) (27)

ایک اور انگریزی لغت میں یوں مرقوم ہے:

"Allude to make indirectly reference, to hint, to mean, to refer directly, Allusion: A reference to anything not directly mentioned."

''تلمیح کے معنی وہ حوالہ ہے جو براہِ راست مذکور ہو۔ تلمیح وہ اشارہ ہے جو کسی چیز کی طرف منسوب ہو مگر وہ حوالہ صاف صاف مذکور نہ ہو۔'' (ترجمہ) (28)

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''تلمیح، اشارہ، کنایہ (کسی قصہ وغیرہ کی طرف جس میں اشارہ یا کنایہ ہو۔ تلمیح سے مراد ہے کنایہ یا کنایہ آمیز بات۔'' (ترجمہ) (29)

متذکرہ بالا سطور میں لغوی اور اصطلاحی دونوں حیثیتوں سے تلمیح کی تعریف پیش کی گئی ہے۔ تعریف درج کرتے وقت نہ صرف اردو فرہنگوں اور لغات کی تعریفات کو یکجا کیا گیا ہے بلکہ فارسی، عربی، انگریزی، سنسکرت اور ہندی زبانوں کی فرہنگوں اور لغات سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان میں مذکور جملہ تعریفات کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ان سب کے مجموعی اور تنقیدی جائزے سے تلمیح کی مکمل، جامع اور مانع تعریف کے تعین میں مدد ملے گی۔ مطالعے اور تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ کسی ایک مقام پر تلمیح کی ایسی تعریف نہیں ملتی جس پر جامع اور مانع تعریف کا اطلاق کیا جا سکے۔

ہندی ادیبوں اور لغت نویسوں نے تلمیح کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ اس کے متعدد مترادفات کا ذکر ملتا ہے۔ سندربھ، انترکتھا اور سنکیت ان میں سے چند نام ہیں۔ ہندی لغت نویس کی رائے میں سنکیت وہ تلمیحی پیرایۂ بیان ہے جس میں کوئی بات ڈھکے

چھپے انداز میں کہی جائے اور جب تک اس کی تشریح یا وضاحت نہ کی جائے اس بات کا مطلب پوری طرح سمجھ میں نہ آسکے اور نہ اس سے لطف اٹھایا جاسکے۔

انگریزی لغت نویسوں نے بھی تلمیح کی تعریف جداجدا انداز میں کی ہے۔ کسی نے اسے حوالہ سے معنون کیا، کسی نے بالواسطہ حوالے سے، کسی نے آڑیا پردے سے۔ ایک انگریزی ادیب نے تلمیح کے سلسلہ میں اپنے خیالات کی ترجمانی یوں کی ہے کہ تلمیح وہ پوشیدہ حوالہ ہے جو براہِ راست مذکور نہیں ہوتا۔ اس سے مراد وہ شناخت لی جاتی ہے جو لکھنے والے کے ذہن میں ہو مگر اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو یا اس حوالے کو پڑھنے والے کے لیے چھوڑ دیا جائے کیوں کہ وہ حوالہ پوری طور سے واضح نوعیت کا نہیں ہوتا۔

اردو زبان کے ادیبوں، لغت نویسوں اور فرہنگ نگاروں نے بھی دوسری زبان کے ادیبوں کی طرح مختلف نوعیت اور نظریہ کے تحت تلمیح کی تعریف بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ آئندہ صفحات میں ان تعریفات کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی اور ان تمام تعریفات کی روشنی میں تلمیح کی واضح تعریف متعین کی جائے گی۔

جدید معیار البلاغت کا مصنف لکھتا ہے کہ تلمیح وہ صنعت ہے جو کلام میں کسی معلوم ومشہور قصہ یا قول ومضمون کی طرف اشارہ کرے۔ اس تعریف میں یہ نکتہ کہ تلمیح میں مذکور قول، قصہ یا مضمون، مشہور و معلوم ہو غیر معروف نہ ہو، خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس قید کی بنا پر ان قصوں، اقوال اور مضامین کا ذکر تلمیح کی تعریف میں نہیں سما سکتا جو عوام الناس میں مشہور نہ ہوں۔ گویا ہر مثل، ہر مضمون، ہر اشارہ اور ہر قصہ تلمیح کی حد میں نہیں لایا جاسکتا۔ دوسرے فرہنگ نویسوں نے اس خاص اور اہم نکتے کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ عام طور پر فرہنگ نویسوں نے تلمیح کو محض کسی اشارہ یا قصہ یا حوالہ سے معنون کرکے اکتفا کرنا بہتر سمجھا۔ ان معنوں میں تلمیح کی یہ تعریف ایک حد تک جامع کہی جاسکتی ہے لیکن فاضل مصنف اس امر کی وضاحت میں خاموش ہے کہ مشہور قصہ، قول یا مضمون؛ مذکور ہو، پوشیدہ ہو یا مبہم طریقہ پر لایا گیا ہو۔ اس بنا پر یہ تعریف جامع اور مانع کے ضمن میں نہیں آتی۔

مختصر المطول کے مصنف نے اس نکتہ کی جانب خاص توجہ دی ہے۔اس کے خیال میں تلمیح، کلام میں کسی قصہ یا شعر یا مثل کی طرف اشارہ کرنے کو کہتے ہیں بشرطیکہ قصہ یا مثل کا ذکر نہ کیا جاوے۔ تلمیح کی یہ تعریف تھوڑی آسودگی اور اطمینان فراہم کرتی ہے لیکن یہ تعریف بھی مکمل اس لیے نہیں کہی جاسکتی کہ اس میں قصے کے مشہور یا غیر معروف ہونے یا نہ ہونے کا ذکر قطعی طور پر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ مذکور قصہ یا مثل عوام میں مشہور و مقبول ہو یا نہ ہو۔

صاحب غیاث اللغات کی رائے میں تلمیح سے مراد کسی چیز کی طرف سبک نگاہ سے دیکھنا اور اشارہ کرنا کلام میں کسی قصہ کی طرف، پھر کلام میں کوئی اصطلاحِ نجوم یا موسیقی لانا یا کلام میں کسی آیت قرآن مجید یا احادیث لانا۔ اس تعریف میں 'سبک نگاہ سے دیکھنا' تعریف کا نہایت اہم اور خاص جز ہے۔ دوسرے فرہنگ نویسوں نے اس طرف یا تو توجہ نہیں کی یا محض سرسری طور سے اس سے عہدہ برآ ہونا چاہا۔ 'سبک نگاہ سے دیکھنا' نہایت لطیف اور نازک اشارہ ہے جو شعر کے تنِ نازک پر گراں بار بھی نہ ہو اور اس کی معنوی خوبیوں میں اضافے کے باعث بھی بن جائے۔ شعر کی خوبصورتی اور ہمہ گیری میں چار چاند لگا دے۔ کون نہیں جانتا کہ رمز و کنایے اور اشارے میں کہی ہوئی بات جادو کا اثر رکھتی ہے۔ یہی حال تلمیح کا ہے جس میں قصہ یا روایت نہایت لطیف انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ اسی بنا پر یہ صنعت ایک لطیف صنعت خیال کی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا تعریف سے تلمیح کی وسعتِ دامانی اور کشادگی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ خواہ آیتِ قرآنی کا اعجاز ہو یا حدیث کا فرمان، علمِ نجوم اور فلکیات کی لامتناہی وسعتیں ہوں یا علمِ موسیقی کا جادو۔ تلمیح ان سبھی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔

مذکورہ بالا تعریفات کے تجزیے سے کچھ خاص نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں مثلاً تلمیح میں 'سبک نگاہ' کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور تلمیح میں وہی قصہ یا مثل یا واقعہ قابلِ قبول ہوگا جو ایک خاص شہرت اور مخصوص اہمیت کا حامل ہو۔ اس کے ذکر کرتے ہی قاری کا ذہن

کسی خاص واقعے کی جانب فوری طور پر مبذول ہو جائے ورنہ تلمیح کا اشارہ خام ہوگا اور اس کا سارا مقصد فوت ہو جائے گا۔

ان سبھی نکات کو برتتے ہوئے تلمیح کی جامع اور مانع تعریف اس نہج پر کی جاسکتی ہے کہ تلمیح لغوی طور پر عربی زبان کا لفظ ہے، تفعیل کے وزن پر اور مونث کا صیغہ ہے۔ اس لفظ کا مادہ لمح (ل+م+ ح) ہے جس کے معنی اشارہ کرنا مراد لیا جاتا ہے۔ تلمیح، باب تفعیل کا مصدر ہے جس کے معنی گوشۂ چشم سے دیکھنا یا سبک اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ اصطلاح کے طور پر تلمیح وہ صنعتِ معنوی ہے جس میں شاعر اپنے کلام میں کسی مسئلۂ مشہور یا قصہ یا قول یا مثل یا اصطلاحِ نجوم وموسیقی وغیرہ کی طرف لطیف اور اجمالی اشارہ کرے جس کے معلوم ہوئے بغیر کلام کا مطلب یا خوبی بہتر طور پر سمجھ میں نہ آسکے۔ قرآن کی آیات، احادیث کے اشارے، اور تاریخی واقعوں کے ذکر کو تلمیح سے خارج نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ تلمیح کے خاص اور ضروری اجزا ہیں۔ کلام میں مختصراً ایک دو الفاظ کسی خاص واقعہ یا قصہ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے رکھ دیے جاتے ہیں جن سے اس کلی یا جزوی واقعے کی طرف انسانی ذہن کی رسائی ہو جاتی ہے، اور تلمیح کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اوپر تلمیح کی جس تعریف کا تعین کیا گیا ہے بلاشبہہ وہ طوالت سے گراں بار ہے لیکن اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ تلمیح میں جملہ ضروری اجزا شامل کر لیے جائیں اور غیر ضروری اجزا اور بے جا قیود و بندش سے تلمیح کو علیحدہ رکھا جائے اس نظریے کی بنیاد پر تلمیح کی جو تعریف مرتب کی گئی ہے وہ ہر ممکن طریقے سے جامع اور مانع کہلائی جاسکتی ہے اور ساتھ ساتھ ہی تلمیح کا ایک واضح اور صحیح تصور پیش کرتی ہے۔

تلمیح کی اس تعریف کی بنیاد پر کچھ ایسے اشعار تلمیح کے دائرے سے باہر ہو جائیں گے جن میں کچھ لطیف اور دقیق اشارے موجود ہیں کیونکہ ظاہری طور پر ذہن انسانی کسی خاص واقعے یا اشارے کی جانب منعطف نہیں ہو پاتا۔ پھر ان اشعار میں نہ تو کوئی حوالہ موجود ہے اور نہ ہی کوئی لفظی اشارہ۔ اس اصول کی دلیل کے لیے صرف دو اشعار کافی

ہوں گے۔ میرؔ کا یہ مشہور شعر ہے:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا
(میرؔ)

اس شعر میں قرآن کی ایک آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، بلکہ آیت کے مفہوم کو ہی شعر کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ قرآن کی آیت ہے "انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان، انه کان ظلوماً جھولاً. (سورۂ احزاب: 72)

کیا قرآن کی آیت کا مفہوم اور کیا میرؔ کے شعر کا بنیادی خیال؛ دونوں کس درجہ ہم آہنگ ہیں لیکن اس شعر کو تلمیح میں شامل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ شعر میں قرآن کی آیت کی طرف کوئی معمولی سا اشارہ بھی موجود نہیں ہے اور یہی ہلکا اور سبک اشارہ تلمیح کا ایک جزو خاص ہے۔ صفیؔ لکھنوی کا شعر ہے:

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے
(صفیؔ)

شعر کا مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے لیکن جس تاریخی واقعے کی جانب اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے یا جو تاریخی واقعہ اس شعر کی بنیاد بنایا گیا ہے وہ واقعۂ کربلا ہے۔ میدانِ کربلا میں ظالم یزیدیوں نے حضرت امام حسینؓ اور ان کے تمام رفقا اور رشتہ داروں کو شہید کر دیا تھا، صرف عورتیں اور بیمار زین العابدین بچے ہیں، وہ بھی بھوک اور پیاس کی شدت سے بے حال ہیں۔ دشمن کے فوجیوں نے حسینی خیموں کو نذرِ آتش کر دیا، حرم بے پردہ ہو گئیں، اور یہ تمام واقعہ زین العابدین کی آنکھوں کے سامنے ہوا وہ بستر علالت پر لیٹے دیکھ رہے ہیں اور مجبور ہیں۔ ممتاز حسین جون پوری لکھتے ہیں:

"اگر خود مولانا صفی مدظلہ جو بفضلہٖ بقید حیات ہیں، یہ تصدیق نہ فرماتے

> کہ اس واقعۂ مذکور سے انھوں نے یہ تخیل لی ہے تو اس کا کوئی ثبوت ممکن نہ تھا اور کہا جا سکتا تھا کہ کسی اور واقعہ سے مطلق اس کو تعلق نہیں، بلکہ یوں ہی آزاد اور بلا تعلق کسی واقعہ کے، یہ خیال نظم کیا گیا۔''(30)

صفی لکھنوی کے اس شعر سے بھی تلمیح کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ شعر میں کم از کم ایک دو اشارے ایسے ضرور موجود ہونے چاہئیں جو ذہن انسانی کو اس مخصوص واقعے کی طرف متوجہ کر سکیں۔ اگر صفی لکھنوی خود اس بات کا اعتراف نہ کرتے تو شاید کسی قاری کا ذہن واقعۂ کربلا کی طرف بالکل نہ جاتا۔

تلمیح کی جامع و مانع تعریف کی تعیین کے بعد ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں اور ایسا ہونا کچھ غیر فطری نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً تلمیح اور تاریخ کا رشتہ کیا ہے؟ تاریخ اور تلمیح کن معنوں میں متفق الخیال ہیں اور کہاں کہاں وہ ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو جاتی ہیں؛ اسی طرح کہاوت اور ضرب الامثال سے تلمیح کن معنوں میں مختلف ہے؟ کیا ضرب الامثال میں تلمیحی پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں؟ یا تلمیح سے ملتا جلتا ایک لفظ اصطلاح کا رائج ہے۔ اصطلاح اور تلمیح میں کیا کیا مناسبتیں اور مخالفتیں ہیں؟ کیا اصطلاح کو تلمیح کا ہی ایک حصہ مانا جائے یا وہ خود اپنا الگ وجود رکھتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام سوالوں کے جوابات مختصر طور سے فراہم کر دیے جائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تلمیح کی تعریف میں مزید وسعت پیدا ہو جائے گی، وہ مزید واضح ہو جائے گی اور اس کا دائرۂ اختیار وسیع تر ہو جائے گا۔

تلمیح اور تاریخ:

تلمیح اور تاریخ کے درمیان پہلا فرق تو یہ ہے کہ تلمیح، تاریخ سے زیادہ قدیمی وجود رکھتی ہے۔ جب مورخوں نے ابھی تدوینِ تاریخ کا آغاز بھی نہیں کیا تھا، تلمیح ارتقا کے کئی منازل طے کر چکی تھی اور اس کے دامن میں تلمیحات کے بھرپور خزانے موجود تھے۔

اساطیری داستانوں اور واقعات سے تاریخ کا دامن خالی ہے لیکن تلمیحات کے خزانے میں اساطیری داستانوں اور ان سے متعلقات کے بارے میں تفصیلی وضاحتیں درج ہیں اور وہ تلمیح کے انمول سرمایے ہیں۔

دوسری طرف تاریخ میں واقعات کا سرسری طور پر بیان ہوتا ہے اور ان سے خاص قسم کے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں جب کہ تلمیح کی جڑیں ہمارے آبا و اجداد اور اسلاف کی زندگی میں پیوست نظر آتی ہیں۔ ان کے رسم و رواج، اوہام و عقائد، مذہبی اور سماجی ترجیحات اور اخلاقی اقدار؛ ان تمام چیزوں کا بیان تلمیح میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس کی بہت واضح مثال مہابھارت کی جنگ ہے۔ مورخین اس بات کا اعتراف تو کرتے ہیں کہ مہابھارت کی لڑائی یقینی طور پر لڑی گئی تھی مگر اس جنگ کا تعلق تاریخ کے کس عہد سے ہے یا اس جنگ کی دیگر تفصیلات کیا ہیں؟ اس کے بیان سے تاریخ عاجز ہے، جب کہ تلمیح میں ایک ایک واقعے کا ذکر پوری تفصیل اور وضاحت سے کیا گیا ہے۔ تاریخ جہاں ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، تلمیح خضرِ راہ بن کر ہمارا دامن تھام لیتی ہے اور اقوامِ گذشتہ کے نامعلوم نہاں خانوں کی سیر کراتی ہے۔

باوجود ان جزئی اختلافات کے، تاریخ اور تلمیح کے درمیان ایک خوش گوار رشتہ موجود ہے۔ بہت ساری تلمیحات، تاریخ کے واقعات سے مستعار ہیں اور ان کی بنیادیں تاریخ کے واقعات پر استوار کی گئی ہیں۔ تلمیح کی تعریف میں بھی تاریخ کے لفظ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس طرح سے تاریخ اور تلمیح کے مابین مضبوط رشتے کی ڈور ہے لیکن دونوں اپنا الگ الگ وجود رکھتی ہیں۔ ہاں جب کوئی تاریخی واقعہ، اشاروں اشاروں میں شعر کے قالب میں ڈھل جاتا ہے تو تلمیح بن جاتا ہے، دوسری جانب تلمیحات میں بھی تاریخ کے بے شمار خزانے مدفون ہیں۔

تلمیح اور ضرب الامثال:

عربی زبان میں کہاوت کے لیے ضرب المثل کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو زبان کی قدیم ترین لغتِ امثال موسوم بہ خزینۃ الامثال میں مثل کی تعریف بیان کی گئی ہے اس میں تلمیح کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ مولف خزینۃ الامثال تحریر کرتے ہیں:

> ''مثل وہ ہے کہ جس سے احوالِ گذشتہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کہاوت کو کسی نے، وقت ظاہر ہونے کے کسی حادثے کے، یا واسطے مثال دینے ایک حال کے ساتھ دوسرے کے، ایک لطف و غرابت کے ساتھ وضع کیا ہو تو جس وقت ویسا ہی سانحہ ظاہر ہو اس مثل کو کہیں، تا سننے والوں کو شے متخیل، محقق ہو جاوے۔''(31)

اس اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کہاوت یا ضرب المثل کا تاریخی واقعات کے ذکر سے گہرا رشتہ ہے۔ اس طرح سے کہاوت، تلمیح سے بہت قریب آ جاتی ہے۔ تلمیح اور کہاوت کے تعلق کو چولی دامن کا ساتھ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اکثر کہاوتوں کے پس پردہ کوئی نہ کوئی کہانی کارفرما ہوتی ہے۔ یونس اگاسکر بیان کرتے ہیں کہ:

> '' کہاوتوں کے ذخیرے پر نظر ڈالی جائے تو اس میں بڑی تعداد ایسی کہاوتوں کی نکلے گی جس کے پس منظر میں کوئی واقعہ، کوئی حکایت، کوئی کہانی، کوئی تاریخی، مذہبی، تہذیبی یا ادبی سانحہ یا محض فرضی اور من گھڑت قصہ ضرور ہوگا۔ اگر واقعہ یا کہانی نہیں تو کوئی عقیدہ یا عام انسانی تجربہ کہاوت کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے۔ ان سب کو تلمیح کے دائرے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے بیشتر کہاوتوں کو احوالِ گذشتہ کے مختصر حوالے کہا جا سکتا ہے۔''(32)

بہت ساری کہاوتیں اور ضرب الامثال، تلمیحات کے درجے میں داخل ہیں۔ ان

کہاوتوں کی پشت پر دلچسپ کہانیاں اور حکایتیں موجود ہیں۔ لیکن ضرب الامثال اور کہاوتیں، تلمیح سے اس معنی میں ممتاز اور مختلف ہوتی ہیں کہ تلمیح کی بنیاد کسی مشہور، معین اور خاص واقعے پر رکھی جاتی ہے جب کہ ضرب المثل اس خصوصیت سے عاری ہوتی ہے، حالانکہ اس کی بنا بھی واقعات پر ہی استوار ہوتی ہے لیکن ضرب المثل میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے وہ عمومی واقعات ہوتے ہیں۔ انھیں قیاساً جانا جاتا ہے، ان کی کوئی تخصیص اور شہرت نہیں ہوتی۔ گویا تلمیح اور ضرب الامثال ہر دو میں واقعات کا ذکر تو کیا جاتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ضرب الامثال میں عمومی واقعے ذکر کیے جاتے ہیں اور تلمیحات میں خصوصی واقعات کا بیان ہوتا ہے کہ قاری کا ذہن فوراً ہی اس طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

تلمیح اور اصطلاح:

تاریخ اور ضرب المثل کی طرح ایک اور لفظ بھی تلمیح سے گہرا اور قریبی رشتہ رکھتا ہے، یہ اصطلاح ہے۔ اصطلاح کا لفظ بھی شعر و ادب کی کتابوں میں کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اصطلاح کا لفظ اور اس کا معنی و مفہوم، تلمیح کے ساتھ خلط ملط ہو جاتا ہے۔ تلمیح اور اصطلاح کے فرق کو واضح کرتے ہوئے وحید الدین سلیم رقم طراز ہیں:

> ''زبان کے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لیے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا، لمبے لمبے قصوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص لفظوں کے ذریعے اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے، فوراً وہ قصے یا واقعے آنکھوں کے سامنے آ گئے جن کی طرف وہ اشارہ کرتے تھے، ایسا ہر اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔ پھر علمی مسئلوں یا اصولوں کے بتانے کے لیے خاص خاص الفاظ معین کیے گئے، ان میں سے ہر لفظ اصطلاح کہلاتا ہے۔''(33)

اس اقتباس سے اصطلاح کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ وہ الفاظ جو بعض علمی مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا بعض تصورات کے مجموعوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اصطلاح کہلاتے ہیں۔ تلمیح اور اصطلاح کے مابین خطِ امتیاز یہ ہے کہ تلمیح کے پس منظر میں کوئی قصہ یا واقعہ موجود ہوتا ہے اور اصطلاح کی پشت پر بعض علمی اصول اور نظریات ہوتے ہیں۔ قصوں اور واقعات سے آگاہی حاصل کیے بغیر تلمیح سمجھ میں نہیں آسکتی، اسی طرح علمی تصورات اور نظریات سے عدم واقفیت کی صورت میں اصطلاح ناقابلِ فہم رہے گی۔ کشاف کے مرتب کا خیال ہے کہ:

> ''اصولاً یہ تلمیح کے دائرے میں شامل نہیں کی جاسکتیں۔ لیکن علم بدیع میں صنعت تلمیح کے دائرے میں تلمیحات کے علاوہ اصطلاحات بھی شامل سمجھی جاتی ہیں چنانچہ صنعتِ تلمیح کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ کلام میں کسی فرضی یا تاریخی واقعے، کسی آیت قرآنی، یا کسی مشہور شعر کی طرف اشارہ کرنا یا نجوم، موسیقی، ریاضی وغیرہ علوم کی اصطلاحات استعمال کرنا صنعتِ تلمیح کہلاتا ہے۔'' (34)

اس سلسلے میں ہماری رائے یہ ہے کہ تلمیح کے دائرے سے اصطلاح کو خارج نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ علم بدیع میں کسی ایسی صنعت کا ذکر نہیں ملتا جو اصطلاح کے مفہوم کا احاطہ کرتی ہو۔ صنعت تلمیح ہی ایک ایسی صنعت ہے جو اپنی ہمہ گیری اور وسعتِ خیالی کی بنا پر اصطلاح کے معانی و مفاہیم کا احاطہ کرسکتی ہے اور ان کو اپنے دامن میں سمیٹ سکتی ہے۔ گویا تلمیح ایک ایسی صنعت کے روپ میں سامنے آتی ہے جس میں تاریخ کی جلوہ سامانیاں ہوں، ضرب الامثال اور کہاوتیں بھی اس کے دامنِ عاطفت میں پناہ لیں اور اصطلاحات بھی تلمیحی پیرایے میں بیان ہوں۔ ساتھ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ تلمیحی پیرایۂ بیان بظاہر جس قدر آسان اور سادہ معلوم ہوتا ہے اس قدر آسان اور سادہ ہوتا نہیں ہے۔ تلمیح کو نظم میں ادا کرنا، اس میں ندرت پیدا کرنا، شعر کے حسن ظاہری و معنوی میں اضافہ کرنا اور فنی محاسن کا پورا پورا لحاظ رکھنا، یہ کوئی آسان کام نہیں۔ جملہ محاسن کو برتنے

کے لیے خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہ ریاض اور مشق کا مطالبہ کرتا ہے کیوں کہ تلمیح کے انداز جدا ہوتے ہیں۔ اس کا محل استعمال مختلف ہوتا ہے۔ تلمیح کے الگ الگ انداز اور الگ زاویے، شعر کے حسن اور اثر میں چار چاند لگاتے ہیں۔ کم سواد شاعر کے ہاتھوں میں تلمیح معمولی اور رکیک بن سکتی ہے۔ فنی مہارت اور شعری محاسن کے ساتھ شعر میں تلمیح کی خوبیاں پیدا کردینا ماہر اور مشاق شاعر کا کام ہے۔

مختلف زبانوں کی ادبیات کے مطالعے سے یہ بات صاف ہوتی ہے کہ تلمیح کا رواج کسی نہ کسی انداز میں دنیا کی بیشتر زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ لاطینی، مصری، یونانی، انگریزی، عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ، ان سبھی زبانوں میں تلمیحات کے خزانے موجود ہیں۔ ان تلمیحات کے مطالعے سے بعض اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ ان مختلف زبانوں میں بعض بعض تلمیحات کس قدر مشترک ہیں۔ اشعار کی شکل، ان کے ڈھانچے، تلمیح کے انداز اور ان کے معنی و مطلب میں بہت ساری قدریں مشترک نظر آتی ہیں۔ بظاہر ان متفق الخیال اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ سرقاتِ شعریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نتیجہ نکالنا کچھ غیر فطری بھی نہیں معلوم ہوتا کہ دنیا کی بیشتر زبانوں اور تہذیب وتمدن میں بعض اقدار اور تصورِ حیات مشترک ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں میں خوشی اور برکت کا تہوار عید کے نام سے موسوم ہوا، ایرانیوں کے ہاں یہی نوروز بن گیا، عیسائیوں کے یہاں کرسمس ڈے اور نیوایر (نئے سال) کے نام سے منایا جانے لگا، ہندوستان میں دیوالی اسی جذبے، جوش وخروش اور یگانگت کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرز پر دنیا کی بیشتر قوموں اور ملکوں میں ایسے رسم و رواج اور عقائد، تہذیب وتمدن کا اہم حصہ ہیں جو کم وبیش سبھی قوموں اور ملکوں میں یکساں طور پر مروج ہیں۔ یہ انسانی تہذیب وارتقا کی اہم کڑیاں ہیں۔ ان خصوصیات کے مدنظر انسانی ترقی میں تلمیح کا کردار بہت اہم ہوجاتا ہے کیونکہ یہ تلمیحات ہمارے بزرگوں کا ترکہ ہیں، ان کی امانتیں ہیں اور انھیں کے کندھوں پر ارتقا کی بنیادیں

استوار ہوئی ہیں۔ یہ اس زمانے کے رسم ورواج، عقائد، توہمات اور خیالات کی نشان دہی کرتی ہیں؛ اور ساتھ ساتھ ہی اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ وہ اپنی نوعیت میں بین الزماں اور بین الاقوام کی اہم کڑیاں ہیں۔

اردو ایک مشترک زبان ہے۔ عربی، فارسی اور ترکی کے علاوہ ہندوستان میں بولی جانے والی مختلف زبانوں سے اس نے کسبِ فیض کیا ہے اور اپنے لفظیات و تلمیحات کے خزانے میں اضافہ کیا ہے۔ اس زبان میں عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ کے قصے، واقعے اور تاریخیں یکساں طور پر محفوظ ہیں۔ تلمیحات کا یہ خزانہ ہمیں اس نتیجے تک لے جاتا ہے کہ کسی زمانے میں ان مختلف قوموں یا ملکوں کا اس زبان و ادب سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ اور ان تلمیحات کی مدد سے ہم ان قوموں یا دور افتادہ ملکوں کے رہن سہن اور رسم ورواج کے بارے میں واقفیت حاصل کر پاتے ہیں۔ تاریخ کی ان منتشر کڑیوں کو تنظیم و ترتیب کی لڑی میں پرو دیا جائے تو اس امتزاج سے ایک بین الاقوامی تاریخِ ادب و معاشرت مرتب ہو جائے گی جو نہ صرف گوناگوں واقعات اور عقائد سے مملو ہوگی بلکہ دل آویزی اور اثر آفرینی میں اپنی مثال آپ ہوگی۔

تلمیح آج جس ترقی یافتہ شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے یا ہماری تشنہ آرزوؤں کی آسودگی کا سامان بہم پہنچاتی ہے، اپنے ابتدائی دور میں اتنی نکھری ہوئی نہ تھی، یہ بات گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکی ہے کہ شاید تلمیح، صنعتوں میں قدیم ترین صنعت ہے، کیونکہ تلمیحی اشاروں کا وجود، حرفوں اور لفظوں کی ایجاد سے بہت پہلے کا ہے، یہیں سے تلمیح کا آغاز مانا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ علٰحدہ بات ہے کہ اشاروں کی اس صنعت کو تلمیح کا نام بہت بعد میں دیا گیا۔ ابتدا میں جب ذہنِ انسانی نے بہت ترقی نہیں کی تھی اور اس کا ذوق ادب ابھی بالیدہ نہیں ہوا تھا تو ادائے مطلب کے لیے یہی اشارات اس کی رہنمائی کرتے تھے۔ تصاویر اور نقوش کی مدد سے وہ اپنے مافی الضمیر کو گویائی عطا کرتے اور ذوقِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتے۔ اجنتا ایلورا کے غار اور اہرامِ مصر اسی ذوق جمال کی آسودگی کی چند

مثالیں ہیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''اول اول تو جس شے کا بیان مقصود ہوتا تھا، اس کی تصویر بنا دیتے تھے مثلاً گائے یا عورت کا بنانا مقصود ہے تو گائے یا عورت کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ دوسرے دور میں یہ اصلاح ہوئی کہ اس شے سے اس کا فعل ظاہر کرنے لگے مثلاً آنکھ سے نظر یا دو ٹانگوں سے مراد رفتار لینے لگے، تیسرے دور میں یہ ہوا کہ شے سے اس کے ممتاز خصائل یا ظاہری علامت سے اصل شے مراد لی جانے لگی مثلاً لومڑی کی شکل مکاری، اور تخت سے سلطنت مقصود ہوتی تھی۔ چوتھے دور میں ایک شے کے اظہار میں یہ کرنے لگے کہ اس شے کے بولنے سے جو آوازیں پیدا ہوتی تھیں ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ تصویریں بناتے تھے۔'' (35)

اجنتا کے غار آج بھی اسی ذوقِ جمال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ان غاروں میں منقش تصویریں نہ صرف مذہبی تشنگی کو آسودہ کرتی ہیں بلکہ ہمارے فنِ جمال اور ذوقِ حسن کی تسکین کا سامان بھی مہیا کرتی ہیں۔ انسانی دماغ، جن خیالات اور احساسات کو تخیل کے رنگ میں پیش نہ کر سکا، تصویروں اور نقش و نگار کی شکل میں انھیں گویائی بخشی، کہیں کہیں یہ تصاویر اور نقوش شعر و ادب سے بھی زیادہ موثر ہو گئی ہیں۔ مصر کے اہرام اور ان کی تصویریں بھی یہی کہانیاں کہتی ہیں۔ فن ادب میں یہی تصویر اور نقوش جب وسعت کے پیمانہ سے لبریز ہو گئے تو انھیں تلمیح کا نکھرا روپ کہہ دیا گیا۔

حروف کی کہانیاں بھی اپنے دامن میں تلمیحی اشارے سمیٹے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر مصر میں ثور بمعنی بیل کو بارہ بروج میں اولیت کا شرف حاصل تھا، جب آفتاب برج ثور میں داخل ہوتا تو سالِ نو کا آغاز ہوتا، اس رعایت سے حروفِ تہجی میں الف کو سب سے مقدم رکھا گیا۔ الف کے معنی بیل کے ہوتے ہیں اور اس کی قدیم صورت بیل کے سر سے مشابہ تھی جس میں سینگ اور کان ہی سب سے نمایاں تھے۔ فینیقی زبان میں بیل کو الاف

کہتے ہیں۔ یہیں سے عربی زبان میں یہ حرف داخل ہوا ہے۔ ب کی شکل پہلے مربع کی تھی، جو گھر کی چوحدی کو ظاہر کرتی تھی، مصری اس کو با کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایجاز واختصار نے یہاں بھی اپنا رنگ دکھلایا اور اس کے تین ضلعے غائب ہو گئے، صرف ایک ضلع باقی رہ گیا۔ فینیقی زبان میں گھر اور مکان کے لیے بیت کا لفظ ہے، عربی میں بیت کو گھر کہتے ہیں، اسی رشتے کی بنا پر اس حرف کا نام 'ب' پڑا۔ ب، بیت کا مخفف ہے۔ ابتدا میں انسانی دماغ کی مانند گھر بھی سیدھے سادے اور مختصر ہوا کرتے تھے۔ ب کو ذرا غور سے دیکھیے، ریگستان میں جنگل میں ایک دیوار کے دو کنارے مڑے ہوئے ہیں وہ گھر ہے، گھر والا دیوار کے آگے ایک نقطے کی مانند بیٹھا ہے۔ کیا ہی زبردست تلمیحی اشارہ ہے!

حرف 'ج' کے لیے اہل مصر اونٹ کا سر بناتے تھے جس کو وہ جیمل کہتے تھے، اب رفتہ رفتہ اس کا نام جیم ہو گیا اور آج بھی اسی انداز میں رائج ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تصویروں اور اشارات کے ذریعہ اظہارِ مطلب اور دل کی ترجمانی کا کام عہدِ قدیم میں رائج تھا۔ اظہارِ مطالب کے یہی مختصر اشارے اب تلمیح کے نام سے ایک صنعت کی شکل میں شعر وادب کا زیور ہیں۔

گویا اصلی اور سچی بات یہ ہے کہ یہ تصاویر یا عمارتیں نہیں تلمیحی سانچے ہیں۔ تحریر کے وجود میں آنے سے قبل یہی اشارات، ترسیل وابلاغ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان ترقی کی طرف پیش قدمی کرتا رہا اور اس نوع کے اشارات اور تصویروں کو حیاتِ نو ملتی رہی اور وہ شعر کے قالب میں ڈھلتی رہیں۔ بالآخر انھیں تلمیح کے طور پر شہرت حاصل ہوئی۔ اس طرح سے تلمیح کی افادیت اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کا رشتہ انسانی سماج سے ابتدائے آفرینش سے ہی مضبوط اور استوار رہا ہے۔ اور جیسے جیسے انسان ترقی یافتہ اور بالیدہ ہوتا گیا، تلمیحوں کا رنگ روپ بھی نکھرتا رہا اور اب یہ علمِ بدیع کی ایک اہم ترین صنعت ہے۔

تلمیح کی ایک خاص افادیت یہ ہے کہ دریا کو کوزے میں سمو دیتی ہے، طولانی

مطلب کوایک لفظ کی مدد سے ادا کرسکتی ہے۔ طویل قصوں کہانیوں اور علمی مسئلوں کے بار بار بیان کرنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے، اس سے محفوظ رکھتی ہے؛ اور بلاغت کے اس فطری تقاضے کو پورا کرتی ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مطالب لطیف پیرایے اور مختصر اندازِ بیان میں ادا کیے جائیں۔ تلمیح کے دامن میں ایجاز و اختصار کے موتی بھرے ہوئے ہیں۔ ایجاز و اختصار کے پردے میں طول طویل معانی و مطالب کو نہایت دل کش اور دلچسپ پیرایے میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ تلمیح اس بات کا بھی فائدہ دیتی ہے کہ اس کے استعمال سے جزئیات پر غور کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ تلمیح، اصل واقعے کے ساتھ اپنی جزئیات کی طرف فوراً توجہ مبذول کرالیتی ہے اور ذہن رفتہ رفتہ جزئیات اور تفصیل کو جاننے کا عادی ہو جاتا ہے جس کی بدولت قاری یا سامع بے جا طوالت اور تضیع اوقات سے محفوظ رہتے ہیں اور شعر سے بآسانی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اس طرح تلمیح بیک وقت دو خوبیوں کی حامل ہوتی ہے، ایک طرف ایجاز و اختصار اس کی خوبیوں میں شمار کیا جاتا ہے تو دوسری طرف ایک ہی واقعے کی مختلف جزئیات پر غور کرنے کا عادی بھی تلمیح ہی بناتی ہے۔ ایجاز و اختصار اور جزئیات نگاری کی یہ مشترکہ خوبی ایک مثال سے واضح ہو سکے گی۔ اردو شعر و ادب میں 'مجنوں' کا لفظ کسی تعارف کا محتاج نہیں، اس کا ذکر بکثرت ہوتا آیا ہے۔ کوئی شاعر ایسا نہ ہوگا جس نے اس لفظ کے استعمال سے اپنے سرمایۂ شعر و سخن میں اضافہ نہ کیا ہو۔ غالبؔ، جدت طراز شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ان کا ایک مشہور شعر ہے:

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(غالبؔ)

صرف لفظ 'مجنوں' اور 'سنگ' کے ذکر سے شاعر نے جو سحر طرازی کی ہے اور جو لطف و اثر پیدا کر دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ مجنوں، عرب

کے قبیلہ بنی عامر کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا نام قیس تھا اور وہ اپنے قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا۔ ایامِ طفلی میں ہی اس کو اپنی ہم قبیلہ اور ہم مکتب لڑکی لیلیٰ سے عشق ہو گیا۔ لیلیٰ کی محبت اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ بدنامی کے خوف سے لیلیٰ کے باپ نے لیلیٰ پر پابندی لگا دی، مجنوں اس کے غم میں دیوانہ ہو گیا اور تنگ آ کر جنگل کی راہ لی۔ قبیلے کے بچے اسے تنگ کرتے، پتھر مارتے مگر عشقِ لیلیٰ کی شوریدہ سری ختم نہ ہوئی، لیلیٰ بھی اس کے عشق میں دیوانی تھی۔ آخر کار دونوں جدائی کے عالم میں بے نیلِ مرام اس دنیا سے چل بسے۔ اس پورے واقعے کی تفصیل اور جزئیات کو غالبؔ نے صرف دو لفظوں کی مدد سے بیان کر دیا ہے، یہی تلمیح کا اعجاز ہے۔

اختصار اور جامعیت، شعر کو نہ صرف موثر اور دل پذیر بناتے ہیں بلکہ اس میں گہرائی اور گیرائی بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ نثر میں ادیب کو یہ آزادی حاصل رہتی ہے کہ وہ اپنے خیالات اور تصورات کو تفصیل اور وضاحت سے بیان کرے مگر شاعری کے لیے آزادی اور رعایتوں کی جولان گاہ اتنی وسیع نہیں ہوتی۔ اسی لیے شاعر سے اس امر کا تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ وضاحت و صراحت کی بجائے اختصار سے کام لے اور رموز و علائم کے ساز و سامان کے ساتھ وادیِ شعر کا سفر طے کرے۔ اس اعتبار سے تلمیح ایک اہم صنعت ہے کہ اس کی مدد سے شاعر بڑی سے بڑی بات اور طویل واقعات کو بآسانی چند لفظوں کے ذریعہ ادا کر سکتا ہے۔ ذیل میں صرف دو ایسی مثالوں سے اکتفا کیا جائے گا جو ایجاز و اختصار اور طویل مطالب کی ترجمانی کی ذمہ داریاں بیک وقت پوری کر رہی ہوں۔

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

(اقبالؔ)

نوح کا جودی پہ اور یونس کا بطنِ حوت میں
چاہ میں یوسف کا یارب پاسباں تو ہی تو تھا

ذرا غور کیجیے کہ ان دونوں اشعار کی تفہیم کے لیے کتنی تفصیل اوروضاحت کی ضرورت ہے ۔ اقبالؔ کے شعر کی تفہیم کے لیے خضر اور موسیٰ کے واقعے کی ایک ایک جزئیات سے آگاہی ضروری ہے کہ مسکین کی کشتی، جان پاک اور یتیم کی دیوار کا راز کیا تھا، موسیٰ جسے سمجھ نہ سکے تھے اور جس کے سامنے علم موسیٰ بھی حیرت فروش ہو گیا تھا۔اس شعر سے اس وقت تک لطف اندوز نہیں ہوا جاسکتا تاوقتیکہ ماضی کے اس واقعے کی پوری تفصیلات قاری کے ذہن میں محفوظ نہ ہوں۔ شاعر نے مخصوص الفاظ اورعلامتوں کے ذریعہ ایک طویل واقعے کو ایک شعر میں کس خوبی سے سمو دیا ہے۔

موخر الذکر شعر میں بھی یہی ایجاز واختصار کارفرما ہے۔طوفان نوح کی طغیانی جب ختم ہوتی ہے تو کشتی نوح کوہِ جودی پر آ کر ٹھہر جاتی ہے اور حضرت نوح اور کشتی کے جملہ سوار کشتی سے باہر روے زمین پر اترتے ہیں اور زمین پر دوبارہ زندگی آگے بڑھتی ہے۔ طوفانِ نوح میں صرف کشتی کے سوار ہی صحیح سلامت تھے باقی روے زمین پر زندگی، موت کی آغوش میں جاسوئی تھی۔ یونس کا مچھلی کے شکم تک پہنچنا اور بخیر وعافیت باہر آنا؛ اور یوسف کا کنویں میں جانا، قافلے والوں کے ہاتھوں کنویں سے باہر نکلنا، مصر پہنچ کر عزیز مصر تک رسائی اور پھر بعد میں خود عزیز مصر کے عہدے تک پہنچنا، ایسی تفصیلات ہیں کہ ان میں سے ہر واقعہ کئی کئی صفحات کو محیط ہے لیکن شاعر کا کمال کہ اس نے ایجاز کے سہارے ان تینوں واقعات کو ایک شعر میں سمو دیا ہے، تلمیح اسی جامعیت اور گہرائی کی غماز اور ترجمان ہے۔

تلمیح سے ایک اور فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کی مدد سے قاری اور سامع بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں میں زندہ رہتا ہے اور ماضی کے واقعات سے بھی اسی طرح لطف اندوز ہوتا ہے جیسے حال کے واقعات وحادثات سے نبرد آزما رہتا ہے اور بالکل اسی طرح مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کو بھی ذہن کے پردے پر صاف صاف دیکھتا اور محسوس کرتا ہے گویا وہ اس کے اپنے عہد کے فسانے ہوں۔ یہیں آ کر انسان

زمان ومکان کی قید وبند سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تلمیح، ماضی کے عکس کی غماز ہوتی ہے، انسانی ذہن پر چشم زدن میں برسوں کی زندگی کے واقعات وحادثات محض ایک لفظ کی تلمیح سے آنکھوں کے سامنے یوں پھرنے لگتے ہیں جیسے وہ واقعات ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہوں۔ بعض اوقات یہ واقعات ہماری روزمرہ کی زندگی سے اس قدر مربوط نظر آتے ہیں اور ان کی جڑیں ہماری موجودہ زندگی میں اس درجہ پیوست ہوتی ہیں کہ وہ واقعے یا قصے تاریخ یا ماضی کے نہ ہو کر ہماری زندگی کے ترجمان اور استعارے بن جاتے ہیں۔ اس کی نمایاں ترین مثال مخدوم محی الدین اور فیض احمد فیضؔ کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے کہ کس طرح ان خلاق شاعروں نے ماضی کے واقعات کو ہماری زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ عصرِ حاضر کے مسائل، پیچیدگیوں، محرومیوں اور کش مکش کو شاعروں نے تلمیح کی آڑ میں موضوعِ سخن بنایا ہے اور موجودہ نظام حیات سے اپنی بے اطمینانی اور نا آسودگی کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے لیے صرف ایک ایک شعر ذکر کیے جاتے ہیں۔ مخدوم کا شعر ہے:

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو، کوہ کن کی جیت ہو
(مخدومؔ)

فیضؔ کہتے ہیں:

یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
(فیضؔ)

تلمیح کی اہمیت اور افادیت کے بیان کے بعد اب یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ تلمیح بطور ایک ادبی ضرورت کے، ادب کے مطالبات اور تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتی ہے۔ بنیادی طور پر تلمیح علمِ بدیع کی ایک صنعت ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ تلمیح ایک صنعت کی حیثیت سے علمِ بیان اور علمِ بدیع کی مختلف

صنعتوں اور پیرایۂ بیان میں کس طرح اپنا کردار ادا کرتی ہے اور کس طرح اپنے وجود کی اہمیت کو ثابت کرتی ہے۔ یہاں پہلے علمِ بیان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

> ”علمِ بیان ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کسی بات کو کس طرح مختلف طریقوں سے بیان کیا جائے کہ ایک معنی دوسرے سے زیادہ واضح اور دلکش ہوں...... علمِ بیان اظہار کے ان طریقوں کا مطالعہ کرتا ہے جن کے ذریعہ کسی واقعہ، خیال یا کیفیت کی صحیح تصویر کھنچ جائے...... جس سے اس کی ترسیل کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور اس میں لطف و تاثیر کے علاوہ جدت اور ایجاز بھی پیدا ہو۔“(36)

علمِ بیان میں تشبیہ، استعارہ، مجازِ مرسل اور کنایہ کے عنوانات کے تحت ادائے معنی کے مختلف پیرایہ ہائے بیان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کسی خوبی یا برائی کے اشتراک کی وجہ سے جب ایک چیز کو دوسری چیز کے مشابہ قرار دیتے ہیں تو یہ تشبیہ کہلاتی ہے۔ تشبیہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو بات متکلم کہنا چاہتا ہے وہی سامع کے دل میں پوری وضاحت، صفائی اور قوت کے ساتھ اتر جائے۔ ساتھ ساتھ ہی تشبیہ سے کلام میں وسعت اور زور پیدا ہوتا ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب تشبیہ، تلمیح کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے تو اور بھی حسین اور موثر ہو جاتی ہے، اس کا زورِ بیان بڑھ جاتا ہے اور معنی و مطالب میں وسعت اور آفاقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص بہادر ہے، طاقت میں لاثانی ہے تو اس کی تعریف اگر یوں کی جائے کہ فلاں شخص انتہائی طاقتور اور بہادر ہے، طاقت میں کوئی دوسرا شخص اس کا ہم پلہ نہیں تو اس بات سے وہ اثر قطعی طور پر قائم نہیں ہو پاتا جو صرف اتنا کہہ دینے سے حاصل ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص رستمِ زماں ہے۔ صرف ایک لفظ رستم کے ذکر سے اس جملے کا معنی و مفہوم کہاں سے کہاں جا پہنچا! رستم کے بارے میں ہر خاص و عام جانتا ہے کہ ایران کا نامی پہلوان تھا۔ اپنی ہمت اور جواں مردی کے بوتے اس نے ہفت خوان طے کیا، راستے کی تمام مشکلات سے نبرد آزما ہوا، بڑی بڑی مہمات سر کیں، دیووں سے مقابلہ کیا اور انھیں زیر کیا وغیرہ وغیرہ۔ اس مختصر سے لفظ میں معانی کے کتنے پہلو پوشیدہ ہیں، اندازہ لگانا کچھ

دشوار نہیں۔ یہی حقیقتیں اور تعبیریں جب شعر کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہیں تو شعر کے درد و اثر کے ساتھ ساتھ تلمیح کے پردے میں تشبیہ کا حسن؛ شعر کے معنی و مطلب میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور شعر معنی کی نئی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔

مانگ ہے یا کوئی سیدھی راہ ہے ظلمات میں
یا عیاں ہے کہکشاں کا خط اندھیری رات میں
(ظفؔر)

شعر مذکور میں شاعر اپنے محبوب کی مانگ کی تعریف کر رہا ہے۔ اس کے لیے اس نے تشبیہ کا سہارا لیا۔ اس کی مانگ کو دو چیزوں سے تشبیہ دی، ایک ظلمات کی سیدھی راہ سے، اور دوسری اندھیری رات میں کہکشاں کے خط سے۔ پہلی تشبیہ میں ظلمات کی تلمیح موجود ہے۔ ظلمات، اس انتہائی تاریکی کو کہتے ہیں جہاں آبِ حیات کا چشمہ موجود ہے۔ ظلمات تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خضر کی رہنمائی میں سکندر وہاں تک پہنچا تھا لیکن آبِ حیات پینے سے محروم رہا۔

ظلمات کی تفصیل جان لینے کے بعد شعر کا حسن یوں ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب کی مانگ سیدھی اور دراز ہے جیسے ظلمات کی راہ، جو انتہائی تاریک ہے۔ تاریکی کی رعایت زلف سے ظاہر ہے۔ محبوب کی کالی زلفوں میں مانگ اس راستے سے تعبیر کی گئی ہے جس پر چل کر خضر و سکندر چشمے تک پہنچے تھے۔ مانگ کی سیدھی سادی تعریف میں ایک تلمیح نے کتنی گہرائی اور تفصیل پیدا کر دی ہے، یہ اس شعر کی تشبیہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار بطور نمونہ درج کیے جا رہے ہیں جن میں تشبیہ کے ساتھ ساتھ تلمیح کا پہلو بھی موجود ہے۔

روزِ نوروز جبیں ہے، شبِ معراج ہے زلف
ذوالفقار ابروے محبوب، ہے قرآں عارض
(ناسخؔ)

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے
(آتش)

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال
حوضِ کوثر پہ جوں کھڑا ہے بلال
(ولی)

صندل اس مانگ میں کیا خوب
راہِ ظلمات میں یہ دلدل ہے

ان مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ تلمیحات، تشبیہ کی جان ہیں۔ تشبیہ اگر حسنِ کلام میں اضافہ کرنے اور تفننِ طبع کے کام آنے کے علاوہ شعر کے مضمون کو بلند و بالا کردے، اس کے اثر میں اضافہ کردے اور اختصار و ایجاز کی خوبیاں بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائے تو یہ تشبیہ اعلیٰ درجے کی ہوگی۔

تشبیہ کے بمقابل استعارے میں زیادہ نفاست، حسن، دلکشی اور ایمائیت پوشیدہ رہتی ہے۔ ایمائیت ہی شعر کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ علمائے معانی نے استعارے کی تعریف میں لکھا ہے کہ جب لفظ اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل نہ ہوکر مجازی معنوں میں استعمال ہو اور اس کے دونوں (حقیقی و مجازی) معنوں میں تشبیہی علاقہ ہو تو یہ استعارہ بن جاتا ہے لیکن اگر تشبیہی تعلق کے علاوہ کوئی اور تعلق یا رشتہ ان دونوں معنوں میں موجود ہو تو یہ مجازِ مرسل ہوگا۔ گویا استعارہ اور مجازِ مرسل میں فرق صرف تشبیہی تعلق کے ہونے یا نہ ہونے کا ہے۔

استعارہ بذاتِ خود شعر کے حسن اور دلکشی کی ضمانت ہوتا ہے لیکن اگر وہ تلمیح کے اوصاف سے بھی متصف ہوجائے تو اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور معنی کی گہرائی دوچند ہوجاتی ہے، مثال کے طور پر میر انیس کا یہ شعر، جو انھوں نے حضرت عباس علم دار کی

شان میں کہے ہیں۔ اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ استعارے، ادائے مطلب کے کتنے بہترین وسیلے ہیں۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
(انیسؔ)

ایک اور مثال سے استعارے اور تلمیح کے مشترکہ حسن کو سمجھا جاسکتا ہے۔

خرامِ ناز سے او بت نہ آنا میرے مرقد پر
تری ٹھوکر میں ہے اندازِ اعجازِ مسیحائی
(مذاقؔ)

مذکورہ شعر میں سنگ دل معشوق کو بت کہا۔ بت جس کی پوجا کی جاتی ہے وہ اکثر پتھر کا ہوتا ہے۔ شاعر نے اسی تشبیہی مناسبت کی وجہ سے معشوق کے لیے بت کا لفظ استعمال کیا۔ شعر میں سنگ دل محبوب کے خرامِ ناز کا تعلق اندازِ اعجازِ مسیحائی کی تلمیح سے کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ یہ نکتہ لائقِ توجہ ہے۔ استعارے اور تلمیح کی خوبی اور باریکی کے لیے کچھ اور اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا
یہ راعی نے للکار کر جب پکارا
(حالیؔ)

غولوں نے بزور پھول اڑایا
اس خضر کو راستہ بتایا
(نسیمؔ)

وہ جو کچھ کہ ہیں کہہ سکے کون ان کو
بنایا بلندیوں نے فرعون ان کو
(حالیؔ)

حق تو یہ ہے یہ انانیت عجب غماز ہے
قصہ پہنچایا زبانِ دار تک منصور کا

مجازِ مرسل کے ضمن میں یہ بات خاطر نشان رکھنے کی ہے کہ مجازِ مرسل میں لفظ مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور لغوی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہوتا ہے۔ علمائے معانی نے چوبیں ایسے اسباب بیان کیے ہیں جن کی رعایت سے مجازِ مرسل کا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کبھی جزو کہہ کر کل مراد لے کر اور کبھی اس کے برعکس، کبھی سبب کے بیان سے مسبب مراد لے کر اور کبھی برعکس، کبھی ظرف کے ذکر سے مظروف مراد لے کر اور کبھی برعکس، کبھی باعتبارِ زمانۂ سابق اطلاق کر اور کبھی باعتبارِ زمانۂ مستقبل؛ اور کبھی مضاف الیہ حذف کر کے مضاف کی رعایت سے مجازِ مرسل کا مفہوم پیدا کر لیا جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں مجازِ مرسل کے ساتھ ساتھ تلمیح کا انداز ملاحظہ فرمایئے۔

اطاعت اور خداوندی کی جب نسبت بہم ٹھہری
تو اس ناچیز مشتِ خاک کا پھر امتحاں کیوں ہو

اس شعر میں تلمیح ہے آدم کی تخلیق سے۔ انسان کو مشتِ خاک سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ عالمِ وجود میں آنے سے قبل انسان کی حیثیت مشتِ خاک کی تھی، اس شعر میں انسان کے وجود کا اطلاق باعتبارِ زمانۂ سابق کیا گیا ہے اور ساتھ میں تلمیح کا فائدہ بھی حاصل کیا گیا ہے۔

سگِ اصحاب ہوا صحبتِ انساں سے بشر
آدمی ہو کے بھی انسان تو انساں نہ ہوا

(برقؔ)

سگِ اصحاب مجازاً ذکر کیا ہے۔ اس میں اصحابِ کہف اور ان کے کتے قطمیر کی جانب تلمیحی اشارہ موجود ہے۔ اس شعر میں مضاف الیہ حذف کر کے صرف مضاف کے ذکر

سے مجازِ مرسل کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔

اسی طرح بات کو پوشیدہ اور چھپے ہوئے انداز میں کہنے کو کنایہ کہا جاتا ہے اور اصطلاحی طور پر جب لفظ اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہ ہوا ہو بلکہ مجازی معنی میں استعمال ہو، لیکن اگر اس سے حقیقی معنی بھی مراد لیے جائیں تو کوئی قباحت محسوس نہ ہو تو اسے کنایہ کہتے ہیں۔ یہی کنایہ جب تلمیح کی خوبی کے ساتھ شعر میں استعمال ہوتا ہے تو تلمیح بصورت کنایہ کی شکل بن جاتی ہے۔ میر انیسؔ کا شعر ہے:

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور

(انیسؔ)

'ارنی گوے اوجِ طور' کا کنایہ حضرت موسیٰ سے کیا گیا ہے۔ اس شعر میں حضرت موسیٰ کے کوہِ طور پر جانے اور خدا سے اس کے دیدار کا مطالبہ کرنے والے واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وادیِ ایمن، ارنی و لن ترانی اسی واقعے کی مختلف تلمیحات ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر میں بھی تلمیح بالکنایہ کی خوبی موجود ہے۔

افسانۂ یوسف کی تصویر کے دو رخ ہیں
اک دست بدامن ہے اک سر بگریباں ہے

''اس میں زلیخا کے اظہار تمنا کا واقعہ دست بدامن کے ٹکڑے سے اور گناہ سے بچنے کے لیے حضرت یوسف کا دامن چھڑا کر بھاگنا اور حجاب و عصمت کو سر بگریباں کے لطیف کنایہ سے جس طرح ظاہر کیا ہے یہ تلمیح بالکنایہ ہے۔''(37)

علمِ بیان کے برخلاف علمِ بدیع میں اس بات کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ معنی کی وہ کون سی خوبیاں ہیں جو بیان کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں۔ معنی کی ان خوبیوں کو صنائع معنوی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علمِ بدیع کا دوسرا پہلو کلام کی ان خوبیوں کا مطالعہ کرتا ہے جو کلام میں

بہت زیادہ معنوی اضافہ تو نہیں کر پاتیں لیکن ان کے استعمال سے الفاظ یا تراکیب میں جدت، تازگی اور بانکپن پیدا ہو جاتا ہے۔ ان لفظی خوبیوں کو صنائع لفظی کہتے ہیں اور علم بدیع کے ذیل میں بیان کیے جانے والے ان خواص کو صنائع بدائع کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

صنعت تلمیح، صنائع معنوی کے ضمن میں آتی ہے۔ کوئی شعر تلمیحی خوبیوں سے متصف ہے تو یہ شعر کی خوبی ہے لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ شعر میں تلمیح کے علاوہ اور بھی بہت ساری معنوی خوبیاں در آتی ہیں، یہ شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں، اسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں صنعت در صنعت کی خوبی موجود ہے۔ یہاں اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ کچھ مخصوص صنائع بدائع کو یہاں بطور مثال ذکر کیا جائے اور اس میں اس بات کی نشان دہی بھی کی جائے کہ کس طرح ایک شعر کے اندر مختلف صنائع لفظی و معنوی کے ساتھ تلمیح نے اپنا رشتہ استوار کر رکھا ہے اور کس طرح تلمیح مختلف صنائع بدائع سے ہم آہنگ ہوتی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حسنِ تعلیل:

حسنِ تعلیل ایک لطیف صنعت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ شاعر ایک ایسی چیز کو کسی چیز کی علت فرض کرتا ہے جو در حقیقت اس کی علت نہ ہو لیکن اس کی وجہ سے شعر میں جدت اور ندرت پیدا ہو جائے:

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

(انیس)

اس شعر میں فرات کی موجوں کو ساحل سے ٹکرانے کی علت، شاعر نے یہ بیان کی ہے کہ لشکرِ حسینی تین دنوں سے پیاسا تھا، جب کہ علت حقیقی یہ نہیں کچھ اور تھی۔ اس کی اصلی

وجہ یہ تھی کہ موجوں کا ساحلِ سمندر سے ٹکرانا ایک قدرتی امر ہے۔

عاشق کو رنج ہو تو معشوق کو بھی رنج
یوسف گرا کنویں میں زلیخا کی چاہ سے

حضرت یوسف کے کنویں میں گرنے کی علت حقیقی ان کے بھائیوں کا رشک و حسد ہے لیکن شاعرانہ علت یہ ہے کہ زلیخا کے عشق کی وجہ سے وہ کنویں میں گرے تھے، یہ بات حقیقتِ واقعہ کے خلاف تو ہے لیکن حسنِ تعلیل کی اچھی مثال ہے۔ کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب
اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب
(انیسؔ)

اس پردۂ محمل میں لیلائے دوعالم ہے
بے وجہ نہیں بیدمؔ کعبہ کی سیہ پوشی
(بیدمؔ)

حسن تعلیل بذاتِ خود شعر کی جان ہوتی ہے لیکن حسن تعلیل جب تلمیحی پیرایے میں نظم کی جاتی ہے تو اس کے محاسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

مراعات النظیر :

اس کو تناسب بھی کہتے ہیں یعنی ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ سوائے نسبتِ تضاد کے کچھ مناسبت رکھتے ہوں۔ درج ذیل شعر تلمیح اور مراعات النظیر کی مثال ہے۔

اہل دنیا تو نہیں دیتے ہیں محزوںؔ غم کی یاد
کوہ کن کو خوابِ شیریں سے جگاؤں تو سہی
(محزوںؔ)

اس شعر میں شیریں سے جو معنی مقصود ہیں اس معنی کو کوہکن کے معنی سے کچھ مناسبت نہیں، لیکن شیریں مشہور معشوقہ ہے فرہاد کی، اور یہاں اس کو فرہاد کے ساتھ مناسبت ہے۔

ایہام:

ایہام کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ کلام میں ایسا لفظ لایا جائے جس کے دو معنی ہوں۔ ایک معنی قریب اور دوسرا معنی بعید۔ سامع یا قاری کا ذہن فوراً معنی قریب کی طرف جائے لیکن شاعر کی مراد معنی بعید سے ہو۔ ایہام خود شعر کا حسن اور صنعت ہے لیکن تلمیح کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔

ہجر میں گھل گھل کے آدھا ہو گیا
اے مسیح اب میں موسا ہو گیا

لفظ موسا سے حضرت موسیٰ کی طرف ذہن مبذول ہونے کے امکانات ہیں لیکن یہاں موسا سے مراد نبی نہیں بلکہ 'مو' بمعنی 'بال' اور 'سا' حرف تشبیہ ہے۔ مسیحا کا لفظ بھی موسیٰ کی جانب ذہن مبذول کرنے میں معاونت کرتا ہے۔

ایہام میں لفظ دو معنوں کا حامل ہوتا ہے اور قاری ایک دلچسپ شک یا وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ آیا شاعر کی مراد اس موقع پر اس معنی سے تھی یا اس معنی سے۔ اور یہ تشکیک ہی شعر کی تفہیم میں لطف پیدا کرتی ہے۔ غالبؔ کا یہ شعر ایہام اور تلمیح دونوں کا لطف رکھتا ہے۔

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

(غالبؔ)

ایک مفہوم: فتنۂ قیامت تیرے سروِ قامت سے بہت کم ہے۔

دوسرا مفہوم: تیرا قد اسی فتنۂ قیامت سے بنایا گیا ہے لٰہذا وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔

تفریق:

کلام میں مذکور ایک ہی نوع کی دو چیزوں میں فرق بیان کرنے کو تفریق کہتے ہیں۔تفریق کے ساتھ تلمیح کا رشتہ دیکھیے۔

سرِ عشاق یہاں بکتے ہیں معشوق وہاں
کوے قاتل ہے جدا، مصر کا بازار جدا
(ناسخ)

آئینہ کہ رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی
صنعت یہ سکندر کی وہ صنعت ہے خدا کی

کوے قاتل اور مصر کے بازار میں بکنا مشترک ہے۔فرق یہ بیان کیا گیا ہے کہ کوے قاتل میں سر عشاق بکتے ہیں اور بازار مصر میں معشوق۔بازار مصر اور معشوق میں فروختگی تلمیحی اشارے ہیں۔

ترصیع:

جب ایک شعر کے دونوں مصرعوں کے الفاظ علی الترتیب باہم ہم وزن ہوں تو یہ ترصیع کہلاتی ہے۔ترصیع اور تلمیح کا سنگم اس شعر میں دیکھیے۔

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل
(غالب)

دونوں مصرعوں کے سبھی الفاظ بالترتیب آپس میں ہم وزن ہیں۔ تیرا - تیری، انداز- رفتار، سخن- قلم، شانہ- جنبش، زلف-بال اورالہام-جبریل سبھی الفاظ باہم ہم وزن ہیں۔

تجنیسِ خطی:

ایسے دو لفظ جو صورت یا تلفظ کے اعتبار سے مشابہ ہوں مگر ان کے معنی مختلف ہوں، تجنیس کہلاتے ہیں اور جب تجنیس کے دونوں لفظوں کی ظاہری شکل ایک سی ہو مگر نقطوں، حرکات، سکنات اور انواع کے لحاظ سے لفظ بدل جائے تو یہ تجنیسِ خطی کہلائے گی۔ درج ذیل شعر تجنیس خطی اور تلمیح کی مشترک مثال ہے:

چاہتا ہوں خامہ انگشت ید بیضا کروں
طور کے شعلے کا کاجل لاؤں طور ایسا کروں

اس شعر میں طور اور طور لفظوں میں تجنیس خطی موجود ہے اور طور ایک تلمیح اشارہ بھی ہے۔

تلمیع:

جب کلام میں مختلف زبانیں جمع ہوتی ہیں تو یہ تلمیع کہلاتی ہے۔

پوچھا اعجاز سے تیرے جو مسیحا نے سخن
قال احییت عظاماً هی قد كان رميم

(حسرتؔ)

اس شعر میں ایک مصرع اردو کا ہے اور دوسرا عربی کا، جس کا ترجمہ ہے کہ میں ایسی ہڈیوں کو زندہ کرتا ہوں جو گل جاتی ہیں۔ تلمیع کے ساتھ ساتھ اس شعر میں اعجازِ مسیحا کی تلمیح سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

سوال وجواب:

جب کلام میں سوال وجواب کے ذریعہ مکالمہ کی صورت پیدا کی جائے تو یہ سوال و

جواب یا مراجعہ کی صنعت کہلاتی ہے۔ درج ذیل شعر میں سوال و جواب کی صنعت بھی ہے اور تلمیح کی صنعت بھی۔

تم کون ہو؟ جبریل ہوں، کیوں آئے ہو؟
سرکارِ فلک کے نام کوئی پیغام
(جوشؔ)

لف ونشر:

لف کے معنی لپیٹنے اور نشر کے معنی پھیلانے کے ہوتے ہیں۔ لف ونشر سے مراد یہ ہوتا ہے کہ شعر میں پہلے چند چیزوں کا ذکر کیا جائے اور پھر دوسرے مصرعے میں ان کے مناسبات کا ذکر کیا جائے۔ یہ شعر کی ایک صنعت ہے۔ تلمیح کہیں کہیں لف ونشر کی صورت میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔

عیاں ہے مہر و مہ کا فرق تجھ میں اور یوسف میں
بھلا سونے کے آگے خاک ہو توقیر چاندی کی

اس شعر میں مہر و مہ کا ذکر کیا، پھر مہر کی مناسبت سے معشوق اور مہ کی مناسبت سے یوسف کا ذکر کیا۔ پھر مہر اور معشوق کی رعایت سے سونے کا اور ماہ و یوسف کی رعایت سے چاندی کا بیان کیا۔ لف ونشر کے ساتھ ساتھ تلمیح کا ذائقہ بھی۔

مبالغہ:

شعر یا کلام میں کسی چیز کی خوبی یا برائی اس حد تک بیان کر دینا کہ ویسا ہونا عادتاً اور عقلاً محال ہو، مبالغہ کہلاتا ہے۔ زیرِ نظر شعر مبالغے کی مثال ہے لیکن تلمیح کی خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔

سمجھ کر مو قلم کو تازیانہ صاف اڑ جائے
مرقع میں اگر کھینچے اسے بہزاد یا مانی

(قدرؔ)

اتنی ساری مثالوں سے ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ تلمیح کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور تلمیح کن کن صورتوں میں جلوہ نمائی کرتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے سے لے کر صنائع لفظی اور معنوی کی بیشتر صنعتوں میں یہ موجود رہتی ہے اور دہری صنعتوں سے اشعار کو مزین کرتی ہے اور ان کے معنی و مطلب اور مفاہیم میں وسعت، گہرائی اور ندرت پیدا کرتی رہتی ہے۔ تلمیح کا یہ دہرا کردار صرف علم بیان اور علم بدیع کی مختلف شاخوں اور صورتوں تک محدود نہیں ہے۔ یہ اتنی ہمہ گیر صنعت ہے کہ محاوروں اور ضرب الامثال میں بھی اپنی جگہ محفوظ رکھتی ہے۔

اصطلاح میں محاورہ خاص اہل زبان کے روزمرہ یا اسلوبِ بیان کا نام ہے، محاورہ کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی نہیں بلکہ مجازی معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں۔ ہم یہاں صرف دو مثالوں سے یہ واضح کریں گے کہ کس طرح تلمیح، محاوروں کے ساتھ ساتھ چل کر محاوروں کو شعر بنا دیتی ہے اور اس کا رشتہ دامنِ تاریخ سے استوار کر دیتی ہے۔ پہلی مثال یہ ہے کہ بہت شدت کی بھوک لگنے کو آنتوں کے قل ہو اللہ پڑھنے کے محاورے سے تعبیر کرتے ہیں۔ قاعدہ اور دستور ہے کہ قرآن شریف کی سورت قل ھو اللہ احد کی تلاوت، روزی میں کشادگی اور رزق میں فراوانی کی غرض سے کی جاتی ہے لیکن جب شدتِ بھوک اپنی انتہا کو جا پہنچتی ہے تو غذا طلبی کے خیال کو ظاہر کرنے کے لیے انتڑیوں کے قل ھو اللہ احد پڑھنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قل ہو اللہ لگیں پڑھنے ہماری آنتیں
فاقہ جس روز ہوا یادِ خدا بھی آئی

ایک اور محاورہ ہے چھٹی کا دودھ یاد آنا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ماں کا دودھ اسے فوراً نہیں دیا جاتا۔ کچھ دوائیاں اور گھٹی دی جاتی ہے۔ ان ایام میں ماں کی چھاتی سخت ہوتی ہے اور بچہ اس سے دودھ کشید کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اس کو کافی جدوجہد اور محنت کرنی پڑتی ہے۔ البتہ چھٹی کے دن وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ کچھ کچھ ماں کا دودھ پی سکے۔ اس تکلیف اور محنت کے بعد جو آرام بچے کو میسر ہوتا ہے اسے وہی جان سکتا ہے۔ اسی جدوجہد اور سخت محنت کی بنا پر یہ محاورہ پیدا ہوا۔ تلمیح اور محاورے دونوں کو ایک ہی شعر کے پیکر میں ذوقؔ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

مزا چکھایا ہے کوہکن کو جو عشق آیا ہے امتحاں پر
کہ لایا جوئے شیر لیکن چھٹی کا دودھ آ گیا زباں پر
(ذوقؔ)

یہی حال ضرب الامثال میں بھی ہے۔ ضرب الامثال استعمال کرتے وقت شاید ہی ہمارا ذہن کبھی یہ سوچتا ہو کہ اس مخصوص ضرب المثل میں کوئی قصہ یا واقعہ پوشیدہ ہے۔ بہت ساری تلمیحات ایسی ہیں جن میں ضرب الامثال اس طرح سما گئی ہیں کہ سرسری طور پر غور کرنے سے ذہن ان کی طرف مائل ہی نہیں ہو پاتا۔ ہمارے شاعروں نے ان ضرب الامثال کو نہایت حسن وخوبی سے شعر کی صورت میں لافانی بنا دیا ہے اور تلمیح کے زیور سے آراستہ کر دیا ہے۔ تلمیح اور ضرب المثل کے مابین فرق کو گذشتہ صفحات میں ہم نے بیان کر دیا ہے۔ یہاں ایک دو مثالوں سے یہ ثابت کریں گے کہ تلمیح اور ضرب الامثال بعض اوقات اس طرح شیر وشکر ہو جاتی ہیں کہ ان کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

'ابھی دلی دور ہے' یہ مثل ایسے موقعوں پر بولی جاتی ہے جب حصولِ مقصد میں ابھی کچھ تاخیر ہو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ غیاث الدین تغلق جب بنگال کی مہم سے دہلی واپس آ رہا تھا، تو اس نے حضرت نظام الدین اولیا سے دہلی خالی کر دینے کے لیے کہا۔ بادشاہ کے قاصد سے محبوبِ الٰہی نے صرف اتنا کہا ''بابا ہنوز دلی دور است'' اہلِ تاریخ جانتے ہیں

کہ غیاث الدین سے دہلی ہمیشہ کے لیے دور ہوگئی۔ وہ افغان پور میں ہی جاں بحق ہوا۔ اس کہاوت کی تلمیحی مثال کے لیے یہ شعر پیش کیا جاتا ہے۔

دیتا ہے روزِ حشر کی رندوں کو دھمکیاں
واعظ زبان روک ابھی دلی دور ہے

(قدرؔ)

ضرب المثل اور تلمیح کی ایک اور مشترکہ مثال ذیل کا شعر ہے۔

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے گا تو آن کے پاس
بدگماں! وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

لقمان، ایک دانا اور عقل مند آدمی کے ساتھ ساتھ طبیب کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں جن کے پاس دنیا کے جملہ امراض کا علاج تھا لیکن وہم کا علاج ان سے بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہم ایک ایسی علت ہے جس کا علاج ممکن نہیں۔ شاعر نے تلمیح اور ضرب المثل کو ایک ہی شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے، اور صنعت کے اندر ایک اور صنعت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

تلمیح کی ادبی قدر و قیمت متعین ہو جانے کے بعد فطری طور پر یہ سوال ذہن میں ابھر سکتا ہے کہ آخر تلمیح، جس کی کارگزاریاں اس قدر وسعت اور ہمہ گیری سے مالا مال ہیں اور جو ادب کے بیشتر تقاضوں اور مطالبات کو پورا کرتی ہے، کہاں کہاں سے ہمارے ادب میں جلوہ گر ہوئی ہیں اور ان کے ماخذ کیا ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تلمیحات جن کی جڑیں ہماری زندگی میں اس قدر پیوست ہیں وہ مختلف اطراف سے آئی ہیں اور ان کے مراجع و ماخذ بھی مختلف الجہات ہیں۔ اگر ان مختلف تلمیحی ماخذات کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا جائے تو مندرجہ ذیل شکل سامنے آئے گی۔

(1) دیو مالائیں:

اس کو انگریزی میں Mythology کہتے ہیں، یعنی دیوی دیوتاؤں کے قصے کہانیاں اوران کی زندگی اور معجزات کے حالات۔ اس ضمن میں قبل تاریخ کے وہ کردار بھی شامل کیے جاسکتے ہیں جن کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں ہے۔ قدیم ایران کے تاریخی کردار مثلاً جمشید، ضحاک اور فریدوں وغیرہ اور قدیم ہندوستان کے کردار کرشن جی، رام چندر جی، لکشمن اور سیتا، راون اور مہا بھارت کے مختلف کردار اسی ذیل میں آئیں گے۔

(2) مذہبی قصے اور واقعات:

اردو زبان میں زیادہ تر تلمیحات کا مرجع و ماخذ مذہبی تصورات پر مبنی ہے۔ عیسائیوں کی مقدس کتاب انجیل، یہودیوں کی تورات اور مسلمانوں کا مذہبی صحیفہ قرآن کریم؛ ان تلمیحات کے ماخذ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ بے شمار تلمیحات ایسی ہیں جنھوں نے اپنا سنگ و خشت اور خام مواد انھی آسمانی صحیفوں سے فراہم کیا ہے۔ تخلیقِ آدم سے لے کر آخری پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ تک انبیاے کرام کا سلسلہ جاری رہا اور ان نبیوں اور رسولوں کی حیاتِ مبارکہ کے بیشتر واقعات تلمیحات کا ماخذ ہے۔ تخلیقِ آدم، گناہِ آدم، ابلیس و آدم، طوفانِ نوح، عمرِ نوح، ناقۂ صالح، صبر ایوب، آرۂ زکریا، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ڈھیر ساری تلمیحات، حضرت یوسف اور یعقوب کی زندگی کے حالات سے مستعار تلمیحات، فرعون و موسیٰ، خضر و موسیٰ؛ مہر نبوت، شبِ معراج اور شقِ قمر وغیرہ تلمیحات کی اساس انھیں آسمانی صحیفوں پر قائم ہے۔

(3) تاریخی واقعات:

تلمیحات کا ایک اور ماخذ تاریخی واقعات ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی

ہے کہ تلمیحات کا ذکر ہو یا ان کے مرجع وماخذ کا بیان ہو، ان کی تقسیم ریاضی کے منطقی اصولوں کی بنیاد پر کرنا دائرۂ امکان سے باہر ہے۔ تلمیحات بلاشبہ ادب اور بلاغت کا ایک جزو ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ ادب میں دو اور دو چار کی منطق نہیں لگائی جاسکتی، تلمیحات بھی اسی کلیے کے ضمن میں آتی ہیں۔ اسی لیے بعض ایسے واقعات بھی نظر آئیں گے جن کی مذہبی اہمیت بھی ہے اور وہ تاریخ کے صفحات میں بھی رقم ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کی زندگی کے حالات ومعجزات کو اسی ذیل میں شمار کرنا چاہیے۔ سکندر کی زندگی کے بھی کچھ واقعات تاریخی شہادت لیے ہوئے ہیں اور کچھ واقعات پر داستانی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ بہرحال جن تاریخی واقعات سے تلمیحات اخذ کی گئی ہیں، ان میں سکندر ودارا، محمود وایاز، منصور اور دار، عدلِ نوشیرواں اور سخاے حاتم کی تلمیحات خاص درجہ رکھتی ہیں۔

(4) مذہبی عقائد:

بعض تلمیحات مذہبی عقائد سے بھی اخذ کی گئی ہیں۔ اس ذیل میں وہ تمام عقیدے شامل کیے جاسکتے ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے مذہب سے جڑے ہوں۔ فرشتوں کی تمام تر کائنات عقیدوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ صورِ اسرافیل، مرغِ سدرہ، کراماً کاتبین اور نکیرین؛ مذہبی عقیدے کے طور پر تسلیم شدہ ہیں۔ فرشتوں کے ساتھ ساتھ قیامت کا قیام، باغِ رضواں، میزانِ عدل، چشمۂ کوثر وتسنیم اور احادیث کے اشارات اس ذیل میں آئیں گے۔

(5) فرضی قصے:

فرضی قصے بھی تلمیح کا ماخذ ہیں۔ کچھ قصے اور واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہر کس وناکس جانتا ہے کہ وہ فرضی ہیں لیکن اس کے باوجود نثر ونظم میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کی مدد سے اپنے مافی الضمیر کو بیان کیا جاتا ہے۔ ہما اور سیمرغ کا سارا قصہ فرضی ہے لیکن ہما کے مبارک سایے اور سیمرغ کے وجود کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

سیمرغ کو عنقا بھی کہا گیا ہے۔ اسی طرح غالبؔ کے اس شعر کی ساری تلمیحی اساس ہی ایک فرضی قصے پر قائم ہے۔

درِ معنی سے مرا صفحہ: لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ: عمرو کی زنبیل

(غالبؔ)

زمانہ جانتا ہے کہ لقا کی داڑھی اور عمرو کی زنبیل سرتاسر فرضی قصے ہیں جو اردو میں داستانوں کی زینت بڑھاتے ہیں لیکن ان سے بھی تلمیحی مطلب ادا کیا گیا ہے اور تلمیح کا فائدہ حاصل کیا گیا ہے۔

(6) رسوم ورواج:

بعض رسمیں بھی تلمیح کے خزانے میں اضافے کا باعث بنی ہیں اور تلمیح کا ماخذ ہیں۔ سوئمبر کی رسم، اور آرسی مصحف کی تلمیح اسی ذیل میں آتی ہے۔ ہولی، عید اور شب برات بھی رسمیں ہیں۔ اشعار میں ہولی اور عید کا ذکر ہوتا ہے اور ان سے ایک تفصیلی مطلب نکال لیا جاتا ہے۔ گویا رسموں سے بھی تلمیح نے اپنے دامن میں گل بوٹے کھلائے ہیں۔

(7) ضرب الامثال:

ضرب الامثال نے بھی تلمیح کے دامن کو وسیع تر کیا ہے۔ ضرب الامثال اور تلمیح کا ذکر کئی جگہوں پر کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ بہت سی تلمیحات ایسی ہیں جن کی اساس ضرب الامثال اور ان سے متعلق عمومی قصوں پر قائم ہے۔ ذیل کے دو اشعار سے یہ اندازہ لگایا جا سکے گا کہ تلمیح نے کس طرح سے ضرب الامثال کی مدد سے اپنے خزانے کو وسعت دی ہے۔

دیتا ہے روزِ حشر کی رندوں کو دھمکیاں
واعظ زبان روک، ابھی دلی دور ہے
(قدرؔ)

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے گا تو آن کے پاس
بدگماں! وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

(8) اصطلاحات:

کچھ تلمیحات ایسی ہیں جن کا تعلق مختلف علوم وفنون کی اصطلاحوں سے ہے، یہ اصطلاحی تلمیحات کہلاتی ہیں۔ بعض تلمیحات کا ماخذ علمی اصطلاحات بھی ہیں مثلاً نجوم کی اصطلاح اس شعر میں استعمال کی گئی ہے اور اس میں تلمیح کا پہلو بھی شامل کیا گیا ہے۔

جنم پترا شاہ کا دیکھ کر
تلا اور برچھک پہ کر کر نظر
(میر حسنؔ)

اس کے علاوہ ذوقؔ کے قصیدے کے یہ دو اشعار بھی علمی اور اصطلاحی تلمیح بیان کرتے ہیں۔

ہوا ہے مدرسہ بھی درس گاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدرِ منیر
اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر
(ذوقؔ)

ان اشعار میں علم فلسفہ کی چند اصطلاحوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ 'شمسِ بازغہ' فلسفہ کی ایک کتاب ہے جو اپنے مضمون کے اعتبار سے خشک، پیچیدہ اور غیر دلچسپ ہے، اس کے برخلاف بدرِ منیر ایک عشقیہ اور دلچسپ مثنوی ہے، مضمون کے اعتبار سے بھی آسان اور دلکش ہے۔ اسی طرح صغریٰ اور کبریٰ بھی منطق کی اصطلاحات ہیں اور ان دونوں

اصطلاحوں سے شاعر نے شعر کے لطف میں اضافہ کر دیا ہے۔ قفل ابجد کی تلمیح بھی علمی اور اصطلاحی تلمیح کے ضمن میں شمار کی جائے گی۔

قفل ابجد کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ابجد کیا چیز ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ فینیقی زبان میں بائیس حروف تہجی تھے، ان میں چھ حروف کا اضافہ عربوں نے کیا اور اس طرح ان کی تعداد اٹھائیس ہوگئی ہے اور ان سبھی حروف کو آٹھ کلموں میں ترتیب دے کر ان کا نام ابجد رکھ دیا گیا۔ قفل ابجد سے مراد اب ایسے قفل سے ہوتا ہے جس کے کھلنے اور بند ہونے کا انحصار چند حروف اور ہندسوں پر ہوتا ہے۔ اس کے پرزوں کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ جب تک وہی مخصوص نمبر یا ہندسے اس پر بنے نشان کے سامنے نہیں آئیں گے، قفل نہیں کھل سکتا۔ جدید زمانے میں ڈیجیٹل لاک، قفل ابجد کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے۔

> ''کلماتِ ابجد کے بارے میں مختلف قسم کی روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ قدیم قبائلِ عرب کے نام ہیں جو فن کتابت کے موجد و ماہر تھے۔ دوسری روایت عوام میں یہ پھیلی ہے کہ یہ کلمات شیاطین کے نام ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ اصحابِ کہف کے نام ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ شاپور شاہِ ایران کے بیٹوں کے نام ہیں مگر یہ سب افسانے زمانۂ جاہلیت کی پیداوار ہیں۔ ابجد کے ہندسوں کی تاریخ کا صحیح پتہ نہیں ہے۔ البتہ غالب گمان یہ ہے کہ 832ء میں مامون رشید بادشاہ کے عہد میں ان کی ایجاد ہوئی، انھیں اعداد کو جوڑنے سے کسی واقعہ یا عمارت کی تعمیر تاریخ وغیرہ معلوم ہونے کا طریقہ ایجاد ہوا اور اس کو تاریخی مادے کے نام سے یاد کیا گیا اور اب طریقۂ ابجد ایک خاص اصطلاح بن گئی۔''(38)

تلمیحات خواہ تاریخی ہوں، مذہبی ہوں، سماجی ہوں، اصطلاحی ہوں یا کسی اور قسم سے تعلق رکھتی ہوں۔ عام طور سے ان کے ماخذات کے ذرائع دو ہیں۔ اردو میں جو

تلمیحات مروج ہیں وہ دو مختلف راستوں سے آئی ہیں، عربی یا ایرانی۔ عربی تلمیحات بھی بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ ایک عربی کی وہ تلمیحات ہیں جن کا تعلق قبل اسلام کے عہد سے ہے اور ان پر اسلامی رنگ کی چھاپ نہیں ہے۔ حاتم طائی، ابرہہ، عوج بن عنق، اصحابِ فیل، لقمان، زرقا، اصحابِ کہف اور باغ ارم وغیرہ تلمیحات دورِ جاہلیت کی پیداوار ہیں۔ جب کہ اس کے علاوہ باقی تلمیحات کو عہد اسلامی کے ذیل میں شمار کرنا چاہیے۔ قرآن میں جن پیغمبروں کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں اور ان کے جن جن کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب کی سب اسلامی تلمیحات کے ضمن میں آئیں گی، حالانکہ انبیاے کرام کے واقعات میں اسرائیلی روایات کا ایک معتد بہ حصہ شامل ہوگیا ہے لیکن تقسیم کے اعتبار سے ان کو اسلامیات میں ہی شمار کرنا بہتر ہوگا۔ نبیوں کے واقعات کے علاوہ برگزیدہ اسلامی شخصیات نبی کریم ﷺ، مہر نبوت، شق قمر، حضرت علی، امام حسینؓ اور میدانِ کربلا وغیرہ تلمیحات کا تعلق عربی اسلامی تلمیحات سے مانا جائے گا۔ بعض تلمیحات ایسی ہیں جو عربی زبان وادب میں ذکر تو ہوئی ہیں مگر انھیں اسلامی کہنا مناسب نہ ہوگا، حالانکہ یہ اسلامی عہد کے دوران وجود پذیر ہوئی ہیں مثلاً لیلیٰ مجنوں اور وامق وعذرا وغیرہ۔ یہ عربی تلمیحات کے ذیل میں ذکر کی جائیں گی۔

عربی زبان کی طرح فارسی اور ایرانی تلمیحات سے بھی اردو نے خوب خوب تلمیحات مستعار لی ہیں۔ ایرانی تلمیحات کو بھی دو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک دور قبل اسلام کے ایران کا اور دوسرا بعد اسلام کا ایران۔ قبل اسلام کے ایران کی بیشتر تلمیحات اردو میں استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ جمشید، ضحاک، فریدوں، کیخسرو، رستم، کیکاؤس اور نوشیرواں وغیرہ کا تعلق ایران کی قدیم تاریخ سے ہے اور ان کی تلمیحات کا بیان قبل اسلام کے ایران کے تحت کیا جائے گا، جب کہ فرہاد، شیریں، خسرو، مانی و بہزاد کا ذکر اسلام کے بعد کے ایران کے ذیل میں ہوگا۔

کچھ تلمیحات ایسی ہیں جن میں عربی و ایرانی رنگ خلط ملط ہوگیا ہے۔ عربی

تلمیحات جب ایران پہنچیں تو ان میں ایرانی وقائع نگاروں اور قلم کاروں نے ایرانی رنگ داخل کردیا اور بعض ایسی تلمیحات ایجاد کیں جو عربی زبان کی تلمیحات کے متوازی اور مدمقابل بن گئیں۔ یا تو یہ محض اتفاق ہے یا قدیم داستان سراؤں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے ایسا دیدہ ودانستہ کیا ہے اور ایسا کرنے کی پشت پر قومیت کا جذبہ کارفرما رہا ہو۔ قومیت اور وطن پرستی کے جذبے سے مغلوب ہو کر عربی ادب کے مختلف کرداروں کو ایرانی تہذیب وتمدن کی خصوصیات سے آراستہ کردیا ہے اور عربی کرداروں کے متبادل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور پیغمبر حضرت سلیمانؑ کے حالاتِ زندگی اور قدیم ایران کے بادشاہ جمشید کے احوال وکوائف میں بہت زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ حضرت سلیمان کے پاس انگوٹھی تھی، اس کو نگینِ سلیمانی کہتے ہیں، جمشید کی انگوٹھی خاتمِ جمشید کے نام سے شہرت رکھتی ہے۔ سلیمانؑ کے پاس شاندار تخت تھا اور عجائبات عالم میں شمار ہوتا تھا۔ تختِ جمشید کی خصوصیات اور شان وشوکت بھی تختِ سلیمان سے کسی معنی میں کمتر نہیں تھی۔ اسی طرح نمرود اور کاؤس کی زندگی کی کئی کڑیاں مشترک نظر آتی ہیں۔ نمرود نے ابراہیم کے خدا سے جنگ آزمائی کا ارادہ کیا تھا اور آسمان کی جانب تیر اندازی کی تھی۔ خدا نے اس تیر کو خون آلودہ لوٹا دیا تھا، نمرود نے سمجھا کہ اس نے ابراہیم کے خدا کو زخمی کردیا ہے۔ اسی طرح کاؤس بھی تندخو اور بدطینت بادشاہ تھا۔ ابلیس کے فریب میں آکر اس نے بھی آسمان کی طرف پرواز کی تھی۔ حضرت یحییٰ کی شہادت کا واقعہ اور ایرانی بادشاہ سیاؤش کی موت کا واقعہ دونوں کس قدر مربوط ہیں! حضرت یوسف کو بھائیوں نے اندھے کنویں میں ڈال دیا تھا، رستم کے بھانجے بیژن کو بھی افراسیاب شاہِ توران نے اسی طرح کے تنگ وتاریک کنویں میں قید کردیا تھا۔ حضرت موسیٰ کو حفاظت کی غرض سے دریا کے حوالے کردیا گیا تھا، وہ صحیح سلامت رہے، قصرِ فرعون میں ان کی پرورش وپرداخت ہوئی، وہیں وہ پلے بڑھے اور جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا بالآخر فرعون کی ہلاکت کا سبب بنے۔ موسیٰ کا نام بھی ان کی زندگی کے واقعے کا استعارہ ہے۔ موسیٰ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی

گئی ہے کہ موسیٰ کے معنی پانی سے نکالا ہوا، جب ان کا صندوق پانی سے نکالا گیا، تب یہ نام رکھا گیا۔ اسی طرح ایران کا بادشاہ داراب بھی دریا برد کر دیا گیا تھا اور پھر وہ دریا سے صحیح سلامت ایک خاتون کے گھر پہنچا، خاتون نے اس کی پرورش و پرداخت کی اور بعد ایک مدت کے وہ اپنی ماں کے پاس واپس آیا۔ داراب کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ چونکہ وہ پانی میں پایا گیا تھا، اس لیے اس کا نام داراب رکھا گیا۔ ایران کا مشہور بادشاہ دارا، جس کا مقابلہ سکندر اعظم سے ہوا تھا، اسی داراب کا بیٹا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بتاتا ہے کہ نمرود شاہِ عراق نے ابراہیمؑ کو آگ کے شعلوں کی نذر کر دیا تھا، خدا کے حکم سے وہ آگ گلِ گلزار بن گئی اور حضرت ابراہیمؑ کا بال بیکا نہ کر سکی۔ ایرانی تاریخ میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تھا، سیاوَش، کیکاوُس کا بیٹا تھا، بے حد سجیلا اور خوبصورت جوان، اس کی سوتیلی ماں اس پر عاشق تھی۔ سیاوَش جب اپنی سوتیلی ماں کے دامِ فریب میں نہ آسکا تو ماں نے کیکاوُس سے چغلی کھائی کہ اس کا بیٹا اس پر نظرِ بد رکھتا ہے۔ کیکاوُس، سیاوَش کی طرف سے بدگمان ہو گیا، سیاوَش اپنی معصومیت اور بے گناہی ثابت کرنے کے لیے آگ سے ہو کر گزر جاتا ہے اور صحیح سلامت واپس آتا ہے۔ آگ سیاوَش کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکی۔

عربی اور ایرانی تلمیحات کے ماسوا کچھ تلمیحات ایسی ہیں جو ان دونوں ممالک کے علاوہ کسی اور مقام سے تعلق رکھتی ہیں۔ حالانکہ ان کی تعداد بے حد کم ہے پھر بھی اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کچھ تلمیحات یونان سے آئی ہیں۔ یونان کسی زمانے میں عقل و دانش اور علم کا مرکز تھا، عقلِ یونان کی شہرت چار دانگ عالم میں بلاوجہ نہیں تھی۔ یونان سے جو تلمیحات ہمارے ادب کی زینت بنی ہیں، ان میں وہی تلمیحات زیادہ رواج پا سکیں جو عقلِ یونانی کی نمائندگی کرتی تھیں مثلاً افلاطون، ارسطو وغیرہ۔ سکندر کی تلمیح بھی ایک یونانی تلمیح کہی جائے گی۔ اسی طرح بعض تلمیحات کا تعلق ہندوستانی ادب اور ہندو دیومالاؤں سے ہے مثلاً راون، رام، سیتا، رامائن اور مہابھارت وغیرہ۔ غرضیکہ اردو کا

دامن مختلف زبانوں، ملکوں اور ادبیات کی تلمیحات سے مالا مال ہے۔ کیا عربی، فارسی، یونانی اور ہندی! کسی زبان کے علمی اور ادبی طور پر مالا مال ہونے کا یہ ایک بڑا ثبوت ہے کہ اس کے خزانے میں کتنی اور کس کس زبانوں کی تلمیحات موجود ہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ تلمیح مختلف صنعتوں کے درمیان ایک ایسی صنعت کے طور پر سامنے آتی ہے جو علیٰحدہ طور پر بھی اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے اور دوسری صنعتوں کے ساتھ مل کر بھی ان کے معانی و مفہوم کو سرفرازی اور بلندی عطا کرتی ہے۔ بنیادی طور سے اس کا رشتہ ماضی کے نہاں خانوں سے رہتا ہے لیکن مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کو بھی اس نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ گویا ماضی اور مستقبل کے واقعات اس کی زد میں رہتے ہیں، وہ ماضی کے واقعات سے کسبِ ضیا کرتی ہے اور مستقبل میں آنے والے واقعات کی جھلک دکھاتی ہے۔ وہ ہمارے بزرگوں کی میراث ہے۔ ان کی زندگی کا آئینہ ہے کہ اس آئینے میں ہم ان بزرگوں کی روحوں، عقائد، رسم ورواج، مذہبی ترجیحات، نقوشِ قدم اور گزرگاہوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ تلمیح، اظہار خیال کے نئے نئے سانچے فراہم کرتی ہے، ایک طرف ایجاز واختصار کی خوبیوں سے دامنِ ادب پر گل بوٹے اور نقش ونگار بناتی ہے تو دوسری طرف انسانی ذہن کو جزئیات پر غور وفکر کا عادی بناتی ہے اور معمولی معمولی تفصیلات کو بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ جہاں آپ کی نظروں نے ان تفصیلات سے تساہلی اور غفلت برتی، شعر کا حسن اور اس کا مفہوم آپ کی گرفت سے دور ہوا۔ تلمیح، تاریخ کو ساتھ ساتھ بھی لے کر چلتی ہے اور جہاں تاریخ ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے وہ ہماری رہ نمائی بھی کرتی ہے۔ وہ تاریخ بھی ہے اور تاریخ کی رہرو بھی۔ تلمیح کا شمار تو صنائع معنوی کے ذیل میں کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک ایسی صنعت ہے جو علم بیان اور علم بدیع کی مختلف صنعتوں میں موجود رہتی ہے، کوئی صنعت کتنی ہمہ گیر ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب تلمیحات کے تفصیلی جائزے کے بعد ہی مل پائے گا۔

● ● ●

حوالہ جات

(مقدمہ)

(1) افادات سلیم، وحید الدین سلیم، ص:95

(2) مرأۃ الشعر، عبدالرحمٰن، ص:24

(3) جواہر الحروف، لالہ ٹیک چند بہار، ص:39

(4) معیار البلاغت، دیبی پرشاد سحر، ص:11

(5) غیاث اللغات، خلیفہ غیاث الدین عزت رام پوری، ص:90

(6) المعجم، شمس قیس رازی، ص:144

(7) معیار اللغات، دیبی پرشاد سحر، ص:35

(8) لغاتِ فیروزی (عربی)، محمد فیروز الدین، ص:80

(9) جامع اللغات، مفتی غلام سرور، ص:382

(10) لغاتِ کشوری، سید تصدق حسین، ص:110

(11) فرہنگِ آصفیہ، سید احمد دہلوی، ص:172

(12) المنجد، معلوف الیسوع، ص:783

(13) بحوالہ مختصر المطول، ص:102

(14) شعر العجم جلد پنجم، شبلی نعمانی، ص:90

(15) بحر الفصاحت، حکیم محمد نجم الغنی، ص:113

(16) ترجمہ حدائق البلاغت، امام بخش صہبائی، ص:122

(17) ذخیرۂ ادب المعروف بہ ذخیرۂ ادبیات، منشی چندر لال کیرانوی، ص:344

(18) آصف اللغات، احمد عبدالعزیز نائطی، ص:497

(19) آئینۂ بلاغت، مرزا محمد عسکری، ص:11

(20) آئینۂ بلاغت، مرزا محمد عسکری، ص:12

(21) مہذب اللغات، سید مرزا مہذب لکھنوی، ص:296

(22) دروس البلاغہ، مرتبہ: حفنی ناصف، محمد دیاب وغیرہ، ص:136

(23) (ترجمہ) بار مانک ہندی کوش، رام چندر ورما، ص:146

(24) اردو ہندی ہندی کوش، رام چندر، ص:172

(25) The Practical Sanskrit-English Dictionary Part III, PK Gode, p 112

(26) Oxford Advanced Learner Dictionary, p 40

(27) Encyclopaedia, V T Grieg, p 99

(28) Conscell's New English Dictionary By Betler,p 108

(29) Standard English Urdu Dictionary, Abdul Haque, p.30

(30) تلمیحات، ممتاز حسین جونپوری، ص:38

(31) خزینۃ الامثال، سید حسین شاہ، ص:5

(32) اردو کہاوتیں اوران کے سماجی ولسانی پہلو، یونس اگاسکر، ص:48

(33) افادات سلیم، وحیدالدین سلیم، ص:92-91

(34) کشاف تنقیدی اصطلاحات، مرتبہ: حفیظ صدیقی، ص:48-

(35) رسالہ ہندوستانی، جولائی 1931ء، مولوی عبدالحق

(36) درس بلاغت، مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی، ص:18

(37) تلمیحات، ممتاز حسین جونپوری، ص:52

(38) حالی بحیثیت شاعر، شجاعت علی سندیلوی، ص:34

فرہنگِ تلمیحات

● آبِ بقا، آبِ حیات، آبِ حیواں، آبِ خضر، آبِ زندگانی:

سکندر، خضر اور آبِ حیات ایک دل چسپ تلمیحی مثلث ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سکندر ایک مرتبہ حضرت خضر کی ہمراہی میں آبِ حیات تلاش کرتے ہوئے ظلمات تک گیا تھا۔ وہ چشمے تک پہنچا بھی مگر جب اس نے پانی پینے کا ارادہ کیا تو چشمہ اچانک اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور سکندر اسے پینے سے محروم رہا۔

ایک اور روایت یہ بھی مشہور ہے کہ جب سکندر، خضر کی معیت میں چشمے تک پہنچ گیا اور اس نے پانی پینے کا ارادہ کیا تو اچانک اس کی نگاہ ان جانوروں اور پرندوں پر پڑی جو برسہا برس سے اس چشمے کے کنارے زمین پر پڑے سسک رہے تھے۔ آبِ حیات پی لینے کی وجہ سے ان کے جسموں میں روح تو باقی تھی مگر توانائی اور طاقت سے یکسر محروم۔ سکندر نے جب ان کا یہ انجام دیکھا، آبِ حیات پینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سکندر نے بے بسی کی زندگی پر موت کو ترجیح دی۔

آبِ حیات وہی نہ جس پر خضر و سکندر مرتے تھے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت تھی
(میرؔ)

آبِ حیات متعدد ناموں سے استعمال میں لیا جاتا رہا ہے کہیں آبِ بقا، آبِ حیواں، آبِ زندگانی اور کہیں آبِ خضر، چشمۂ زندگی، چشمۂ حیواں، چشمۂ ظلمات اور کہیں زلالِ بقا، زلالِ خضر، زلالِ زندگانی اور سرچشمۂ حیواں، اور ان سب سے مراد پانی کا وہ فرضی اور اساطیری چشمہ ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس کو پینے والا حیاتِ دائمی حاصل کر لیتا ہے اور اسے کبھی موت نہیں آتی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چشمہ انتہائی تاریکی میں واقع ہے اور اس تک پہنچنا عام انسانوں کی بساط سے باہر ہے۔ ہندی زبان و ادب میں آبِ حیات

کے مترادف کے طور پر امرت کا لفظ استعمال میں ہے۔

کہانیاں ہیں حکایات خضر و آب بقا
بقا کا ذکر ہی کیا اس جہانِ فانی میں
(ذوقؔ)

اساطیر میں حضرت خضر کی حیاتِ جاودانی کا راز یہی ہے کہ انھوں نے آبِ حیات پی کر دائمی زندگی حاصل کرلی ہے، موت کو انھوں نے شکست دے دی ہے اور قیامت تک عام انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ رہیں گے اور گم کردۂ راہ مخلوق کی رہبری کا کام کرتے رہیں گے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے حیاتِ خضر کی جاودانی محلِ نظر ہے۔

ہزار آب حیات چھڑکیں مسیح اور خضر مل کے لیکن
اٹھے نہ محشر تلک بھی پیارے شہید تیرے لب و دہاں کا
(سوداؔ)

عشق میں خون جگر کھانے کی گر لذت نہ تھی
خضر نے، حیراں ہوں، آبِ زندگانی کیوں پیا
(سوداؔ)

حسن کے خضر نے کیا لبریز
آب حیواں سے جام تجھ لب کا
(ولی)

چشمۂ آبِ بقا جگ میں کیا ہے حاصل
یوسفِ حسن ترے چاہِ زنخدان میں آ
(ولیؔ)

- آتشِ ایمن، آتشِ سینا، آتشِ موسیٰ: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔
- آتشِ نمرود: تفصیل 'شعلۂ نمرود' کے تحت دیکھیں۔
- آدابِ فرزندی:

حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو وادیِ غیر ذی زرع میں چھوڑ کر ابراہیمؑ کنعان

میں جا بسے تھے۔البتہ جب جب حکم الٰہی ہوتا وہ بال بچوں کی خیریت لینے مکہ چلے آتے۔ ایک بار اسی غرض سے ابراہیمؑ کا آنا ہوا تو مسلسل تین راتوں تک یہ خواب دیکھتے رہے کہ خدائے تعالیٰ اپنی راہ میں ان سے اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگ رہا ہے۔انبیا کے خواب سچے ہوتے ہیں چنانچہ ابراہیمؑ خدا کے حکم کی تعمیل میں برضا و رغبت تیار ہو گئے۔ چونکہ یہ معاملہ تنہا ان کی ذات سے وابستہ نہ تھا۔انھوں نے اسماعیل کو اپنے پاس بلایا اور خواب کی پوری تفصیل بیان کرنے کے بعد راہِ خدا کے سلسلے میں ان کی مرضی اور رائے جاننی چاہی۔ بیٹا اگرچہ باپ کے دامنِ تربیت سے محروم رہا تھا لیکن آدابِ فرزندی سے پوری طرح واقف تھا۔سر تسلیم و رضا خم کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔'آپ کو جو حکم ہوا ہے کر گزریے، انشاء اللہ آپ مجھے صابروں میں پائیں گے'۔اس گفتگو کے بعد باپ بیٹے دونوں جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ شیطانِ لعین نے اس موقعے پر حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو بار بار بہکانا اور گمراہ کرنا چاہا مگر اسے اس ارادے میں کامیابی نہ مل سکی اور وہ خائب و خاسر واپس ہو گیا۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی
(اقبالؔ)

بیٹے کی مرضی سے باپ نے اپنی آنکھوں پر پٹی اور بیٹے کے ہاتھوں اور پیروں میں رسی باندھ دی تھی کہ شفقتِ پدری کہیں جوش میں نہ آ جائے اور فریضۂ خدا کی ادائیگی میں سدّ راہ نہ بن جائے۔

کھول دے آنکھیں دمِ ذبح نہ دیکھوں گا تجھے
پر چھری اپنی تو گردن پہ میں چلتی دیکھوں
(ذوقؔ)

باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور قریب تھا کہ گردن پر چھری پھیر دیتے کہ ندائے غیبی آئی ''اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم اسی طرح نیک کاروں کو بدلہ

دیتے ہیں''۔ جب ابراہیمؑ نے آنکھوں سے پٹیاں سرکائیں تو دیکھا کہ پاس ہی ایک مینڈھا کھڑا ہے۔ اللہ کے حکم سے ابراہیمؑ نے مینڈھے کو ذبح کر دیا اور خدا کے دربار میں باپ اور بیٹے دونوں سرخ رو گئے۔ حضرت اسماعیل کو ذبیح اللہ کا لقب دیا گیا۔

مرتبہ خلت پناہی کا وہ پاوے گا جو کئی
مثلِ اسماعیل اول جی کوں قربانی کرے
(ولی)

● آدمؑ:

حضرت آدمؑ پہلے انسان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس روے زمین پر اپنی خلافت کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اس زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے جدامجد ہیں، ابوالآبا، ابوالبشر اور بابا آدم کے القاب اس کے گواہ ہیں۔ حضرت آدم کو ایسی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا گیا تھا جو نت نئی تبدیلیاں قبول کرنے والی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس جسدِ خاکی میں روح پھونکی تو یکا یک وہ گوشت پوست، ہڈی اور پٹھے کا زندہ انسان بن گیا۔ اللہ نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے سربسجود ہو جاؤ۔ فرشتوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ مگر ابلیس، جو اپنے علم و عبادت کی بنیاد پر تمام فرشتوں کے مقابل امتیازی مرتبہ رکھتا تھا، سجدہ سے باز رہا اور انکار کر بیٹھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے راندۂ درگاہ کر دیا اور جنت سے نکل جانے کا حکم دیا۔

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
(ذوق)

حضرت آدم ایک عرصہ تک تنہا زندگی بسر کرتے رہے ان کی تنہائی ایک مونس و ہمراز کی جویا رہتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی تسلی اور اطمینان کے لیے حوا کو پیدا کیا۔ حوا کو پا کر آدم انتہائی مسرور اور شادماں ہوئے۔ آدم و حوا کو جنت میں رہنے اور اس

کی ہر چیز سے فائدہ اٹھانے کی پوری آزادی تھی، صرف ایک درخت ایسا تھا جس کی جانب نشان دہی کر کے یہ بتلا دیا گیا تھا کہ اس درخت کے قریب نہ جائیں اور اس کا پھل نہ کھائیں۔قرآن نے اس درخت کا نام نہیں بتایا ہے مگر بعض مفسرین نے اسے 'گیہوں کا درخت' بتایا ہے۔

ابلیس کو موقع ہاتھ لگا، اس نے آدم وحوا کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ جنت کا درخت ہے اس کا پھل کھا لینے کے بعد جنت کا دائمی آرام وسکون میسر ہو جائے گا۔ بار بار بہکانے اور باور کرانے پر آدم وحوا کا دل بھی بہک گیا؛ وہ خدا کی حکم عدولی کر بیٹھے اور اس شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔پھل کا کھانا تھا کہ ان کے بشری لوازم ظاہر ہونے لگے انھیں اپنے ننگے پن کا احساس ہوا اور وہ اسے چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔اور درخت کے پتوں کو جوڑ جوڑ کر اپنی ستر پوشی کرنے لگے۔گویا انسانی تمدن کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔انسان نے اپنی تن پوشی کے لیے پہلے پہل پتوں کا استعمال کیا۔

حضرتِ آدم خدا کی حکم عدولی کر چکے تھے چنانچہ ان سے باز پرس ہوئی۔آدم نے فوراً ہی اعترافِ گناہ کر لیا اور معافی کے خواستگار ہوئے۔خدا نے ان کے عذر کو قبول تو فرما لیا مگر مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔آدم کو جنت سے نکل جانے اور دنیا میں ایک معین مدت تک قیام کرنے کا حکم صادر ہوا۔چنانچہ آدم وحوا کو اس روئے زمین پر بھیج دیا گیا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
(غالبؔ)

آدم وحوا اس زمین کے کس حصے پر بھیجے گئے تھے؟ بعض ضعیف روایتوں میں ہے کہ حضرت آدم ہندوستان کی سرزمین پر اور حضرت حوا جدہ کی سرزمین پر اتارے گئے اور دونوں عرفات کے مقام پر ایک دوسرے سے ملے''سری لنکا میں ایک پہاڑ ہے جس کو کوہِ آدم کہا جاتا ہے۔عقیدہ ہے کہ آدم اسی پہاڑ پر اتارے گئے تھے پہاڑ کی ایک

چوٹی پر آدم کے قدموں کے نشانات بھی بتائے جاتے ہیں''۔ چونکہ سری لنکا بہت پہلے ہندوستان کا ہی حصہ ہوا کرتا تھا اس لیے مفسرین نے آدم کا نزول ہندوستان میں قرار دیا ہے۔

ثابت رہ آپ کام میں دنیا کوں نہیں وفا
آدم کیا ہے کوہِ سراندیپ پر مقام
(قلی)

● آرۂ زکریا:

حضرت زکریا، انبیاے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ یہ مشہور پیغمبر، حضرت یحییٰ کے والداور حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم کے خالواور کفیل تھے۔ یہ کاہن کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ عہدہ بنی اسرائیل میں بڑا معززاور موقر عہدہ تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے بڑھئی تھے اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی مگر خدائے تعالیٰ نے بڑھاپے میں اپنے فضل وکرم سے نوازااور حضرت یحییٰ کی ولادت ہوئی۔ تلمیح کے نقطۂ نظر سے ان کی شہادت کاواقعہ قابلِ ذکر ہے۔ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ حضرت زکریا سر سے پاؤں تک آرے سے چیرے گئے تھے اور یہی ان کی موت کا سبب تھا۔ غالباً یہ روایت اسرائیلیات سے علماے سیر وتاریخ نے مستعار لی ہے، کیونکہ قرآن میں ان کی موت کا سبب بیان نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا کو یہودیوں نے شہید کر دیا تھا۔

علماے سیر اور مورخین کے درمیان حضرت زکریا کی شہادت کا مسئلہ نزاعی رہا ہے۔ وہب بن منبہ (یہ وہی راوی ہیں جن کے توسط سے بے شمار اسرائیلی روایات، اسلامی روایات کے ساتھ خلط ملط ہوگئی ہیں) کی ایک روایت ہے کہ یہودیوں نے جب حضرت یحییٰ کو شہید کر دیا تو پھر زکریا کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے قتل کے درپے ہوگئے۔ زکریا ان کے چنگل سے بچ نکلنے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے، بھاگتے بھاگتے راستے میں

ایک درخت آ گیا اور وہ اس کے شگاف میں گھس گئے۔ یہودی ان کے تعاقب میں تھے۔ انھوں نے حضرت زکریا کو شگاف میں دیکھ لیا اور ان کو نکلنے پر مجبور کرنے کے بجائے درخت کو آرے سے چیر ڈالا۔ جب آرہ حضرت زکریا کے سر پر پہنچا تو آپ نے بے تابانہ آہ بھرنی چاہی تو خدا کی وحی آئی کہ زکریا! اگر تم نے کچھ بھی آہ وزاری کی تو ہم اس زمین کو تہ و بالا کر دیں گے اور اگر تم نے صبر سے کام لیا تو ہم یہود پر اپنا غضب نازل نہیں کریں گے۔ چنانچہ زکریا نے صبر کرنا بہتر سمجھا اور اف تک نہ کی اور یہودیوں نے درخت کے ساتھ ساتھ ان کے بھی دو ٹکڑے کر ڈالے۔ اس طرح حضرت زکریا آرے سے شہید کر دیے گئے۔

دلِ نخل میں قد کے جوں زکریا چھپ کر چشم کافر سے
اب جنبش تیغ ابرو سے کیوں کر نہ بزیر کشاکش ہو
(ذوقؔ)

زکریا سے نہیں آپ کو گنتا کچھ کم
ذکرِ آرہ جیسے آتا ہے فقیروں کے بیچ
(تاباںؔ)

ارّہ غم گر چلے سر پر مثالِ زکریا
یار کے جور و جفا پر صبر جوں ایوب خوب
(سراجؔ)

● آزر:

حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کے والد کا نام تھا۔ ابراہیم ایک جلیل القدر اور برگزیدہ پیغمبر تھے۔ وہ عراق کے ایک قصبہ اُر کے باشندے تھے۔ ان کی قوم بت پرست تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو مختلف مرحلوں پر مختلف طریقوں سے آزمائشوں میں مبتلا کیا مگر ابتلا سے اور آزمائش سے ہر میدان میں وہ کامیاب و کامران رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انعام کے طور پر انھیں خلیل اللہ کا لقب عطا کیا۔ واتخذ اللہ ابراہیمؑ خلیلاً (اور اللہ نے ابراہیمؑ کو

اپنا دوست بنالیا)۔

تاریخ اور توراۃ کی تصریحات کے مطابق ابراہیمؑ کے والد کا نام تارخ تھا مگر قرآن شریف میں ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر بتلایا گیا ہے۔اس کی وجہ تطبیق صاحب قصص القرآن بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصل بات یہ ہے کہ کالدی زبان میں 'آدار' بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عربی میں یہی 'آزر' کہلایا۔تارخ، چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا اس لیے 'آزر' ہی کے نام سے مشہور ہوگیا۔حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا اور جب لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآن عزیز نے بھی اسی نام سے پکارا۔''(1)

لفظ آزر کے املا کے سلسلے میں عام طور پر ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے بعض لوگ ابراہیمؑ کے باپ کا نام 'آذر' لکھتے ہیں جو قطعاً غلط ہے اور نصِ قرآنی کے خلاف ہے۔آذر کے لغوی معنی آگ کے ہیں 'املا نامہ' میں ہے کہ:

''آزر: حضرت ابراہیمؑ کے والد یا چچا کا نام ز سے ہے جیسے آزر بت تراش اور آگ کے معنی میں یہ الفاظ ذال سے ہے، جیسے آذر کدہ، بہ معنی آتش کدہ اور آذر فشاں بہ معنی آتش فشاں۔نیز ذال ہی سے ایک رومی مہینے کا نام بھی ہے۔''(2)

ابراہیمؑ کی قوم ایک بت پرست قوم تھی۔انجیل برنابا میں ہے کہ خود ان کے والد نجاری کا پیشہ کرتے اور اپنی قوم کے مختلف قبائل کے لیے لکڑی کے بت بناتے اور فروخت کیا کرتے تھے۔

خدا ساز تھا آزرِ بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

(میرؔ)

بہر حال آزر ایک ماہر بت تراش تھا۔ جہاں اس کی ذات بت تراشی اور فنکاری کی وجہ سے عام لوگوں کا مرجع و محور تھی وہیں اس کا بت خانہ بھی بہت مشہور تھا۔ جس میں بیک وقت پتھر اور لکڑی کے ہزاروں بت رکھے رہتے تھے اور جن کی شکل و شباہت، رنگ و روپ اور حیثیتیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

نقشِ پا کی صورتیں وہ دل فریب
تو کہے بت خانۂ آزر کھلا
(مومنؔ)

● آفتابِ حشر: تفصیل 'روزِ قیامت' کے تحت دیکھیں۔

● آئینۂ سکندری:

سکندر نے ایران کے بادشاہ دارا سے جنگ آزمائی کی تھی اور ایران پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ سکندر نے دریائے روم کے ساحل پر ایک شہر کی بنا ڈالی تھی، اس شہر کا نام اسکندریہ تھا۔ اسکندریہ میں سکندر نے ایک اونچے مینار پر ایک آئینہ نصب کرا دیا تھا۔ اس آئینے کی مدد سے ممالکِ فرنگ کی کشتیوں اور جہازوں کی نقل و حرکت کا اندازہ سو میل کی مسافت سے ہی ہو جاتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ پہرے داروں کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر فرنگیوں نے وہ آئینہ پانی میں ڈبو دیا اور شہر کو نذرِ آتش کر دیا۔

سکند کیوں نہ جاوے بحرِ حیرت میں کہ مشتاقاں
تمھارے مکھ اگے درپن کوں کر نہیں گنتے
(ولیؔ)

شاہنامہ کو اگر بنیاد مانا جائے تو سکندر شاہِ ایران دارا کا بھائی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دارا کے باپ داراب نے قیصرِ روم کی بیٹی سے شادی کی تھی اور کسی بات پر ناراض ہو کر اسے اس کے باپ کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس وقت داراب کی بیوی حمل سے تھی، قیصرِ روم کے ہاں اس نے ایک بچے کو جنم دیا، اس کا نام سکندر رکھا گیا۔

''سکندر اور دارا کے درمیان نزاع کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سکندر خود کو ایران کی سلطنت میں نصف کا حصے دار سمجھتا تھا۔ سکندر اور دارا کے درمیان متعدد جنگیں ہوئیں۔ سکندر جب بھی دارا سے لڑائی کا قصد کرتا، جامِ جہاں نما کی مدد سے دارا، سکندر کی تمام نقل و حرکت اور تیاریوں سے آگاہ ہوجاتا اور سکندر کی تمام تیاریاں دھری کی دھری رہ جاتیں۔ ادھر سکندر کے پاس اس طرح کا ایسا کوئی کرشمائی آلہ نہیں تھا جس سے وہ دارا کی فوجوں، ان کی نقل و حرکت اور تیاریوں کا اندازہ لگا سکتا۔ وہ ہمیشہ دارا کی تیاریوں، تدبیروں اور احوال و کوائف سے بے خبر رہا۔ آخر کار حکومت کے مدبروں اور سائنس دانوں کی مدد سے شہر اسکندریہ کے ساحل پر اس نے ایک آئینہ بنانے میں کامیابی حاصل کرلی جس سے وہ دشمن کی نقل و حرکت اور سربستہ رازوں سے آگاہی حاصل کرسکے۔''(3)

مکھ ترا آئینۂ سکندر ہے
ہر دو عالم منیں عدم دستا
(ولی)

خاک آئینہ سے ہے نامِ سکندر روشن
روشنی دیکھتا گر دل کی صفائی کرتا
(ذوق)

● ابرہہ: تفصیل 'اصحابِ فیل' کے تحت دیکھیں۔

● ابلیس:

قرآن نے بصراحت اس کے نام کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بعض لوگ اس کا نام عزازیل بتاتے ہیں۔ یہ جنات کی نسل سے تھا اور اپنی عبادت و ریاضت کے طفیل فرشتوں کے حلقے میں شامل ہوگیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ معلم الملکوت (فرشتوں کا استاد) کے لقب

سے ملقب کیا گیا تھا، فرشتوں کی تعلیم اس کے سپرد تھی۔ آدم کی تخلیق کے بعد جب خدائے تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو آدم کا سجدہ کرنے کا حکم دیا تو بلاعذر تمام فرشتے سربسجود ہو گئے مگر ابلیس غرور و تمکنت کا شکار ہو گیا اور سجدہ کرنے سے انکار کر بیٹھا۔

جن نے سجدہ نہ کیا آدم کو
شیخ کا پوجتا ہے بابا یاں پانوؑ
(سوداؔ)

دشمنی اس آدمِ خاکی سے عین کفر ہے
کی جو سجدہ سے ابا ابلیس مرتد ہو گیا
(اسیرؔ)

خدا نے جب اس سے سجدہ نہ کرنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کبر و نخوت کے انداز میں جواب دیا کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور آدم مٹی سے اس لیے میں آدم سے افضل ہوں۔

نشۂ پندار سے ابلیس رہ گم کردہ تھا
ورنہ آدم میں دھرا کیا تھا وہی در پردہ تھا
(ذوقؔ)

سجدہ سے نافرمانی کی بنا پر ابلیس کو جنت نکالا ملا۔ حکم کی خلاف ورزی، تکبر اور نخوت کی پاداش میں اسے جنت سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ ابلیس نے دیکھا کہ اب تو میں راندۂ درگاہِ الٰہی ہو ہی چکا ہوں، انتقام اور حسد کی آگ میں جلتے ابلیس نے قیامت تک کے لیے خدائے تعالیٰ سے مہلت طلب کر لی اور اولادِ آدم کو ہر چہار جانب سے گمراہی اور ذلت کے غاروں میں ڈھکیلنے کا تہیہ کر جنت سے روانہ ہوا۔

پہلے پہل ابلیس نے آدم وحوا کو فرمانِ الٰہی کے برخلاف جنت میں شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کی ترغیب دی اور اس ارادے میں کامیاب بھی رہا۔ نتیجتاً آدم وحوا بھی جنت سے نکالے گئے۔ اب آدم وحوا کی نسلیں اور شیطانِ نابکار کا لشکر باہم دگر قیامت تک اس

روے زمین پر برسرِ پیکار رہیں گے۔

● ابنِ مریم:

ابن مریم، بنو اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ کی کنیت ہے۔ حضرت عیسیٰ، بنو اسرائیل کی ایک پاک باز، باعصمت، عابدہ اور زاہدہ خاتون حضرت مریم کے بیٹے تھے۔ حضرت عیسیٰ کو خدائے تعالیٰ نے عام انسانی اصولوں کے برعکس، محض اپنی قدرت کاملہ کے اظہار اور شانِ اعجازی کے مظہر کے طور پر بن باپ کے تخلیق بخشی تھی۔ جبرئیل امین نے حضرت مریم کے گریبان میں پھونک ماری اور بحکم اللہ وہ حاملہ ہو گئیں اور مدتِ حمل گزرنے کے بعد حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی۔ اسی لیے حضرت عیسیٰ کو ان کی والدہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ قرآن میں بھی عیسیٰ ابن مریم کے لفظ سے انھیں کئی مقامات پر مخاطب کیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ کا ذکر مختلف ناموں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کہیں ان کے اصلی نام عیسیٰ کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے تو کہیں ان کی کنیت ابن مریم کے ساتھ، یا پھر ان کے لقب مسیح اور مسیحا کے ساتھ۔ مگر ان تمام ناموں میں حضرت عیسیٰ کی شخصیت اور بنیادی اوصاف کی جھلکیاں صاف طور سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ لفظ 'عیسیٰ' کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ عربی لفظ، 'عاس یعوس' سے مشتق ہے، جس کے معنی 'سیادت اور قیادت' کے ہیں اور یہ خوبی حضرت عیسیٰ کی بنیادی خوبی تھی کہ وہ دنیا کی سیادت و قیادت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ لفظ مسیح کے معنی ہیں 'کثرت سے زمین کی سیاحت کرنے والا' یا 'ہاتھ پھیرنے والا' اور یہ دونوں اوصاف حضرت عیسیٰ کے نمایاں اوصاف تھے۔ حضرت عیسیٰ انبیا کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے تمام عمر شادی نہیں کی اور بود و ماند کے لیے کوئی مستقل گھر نہیں بنایا۔ وہ شہروں شہروں اور گاؤں گاؤں گھوم گھوم کر تبلیغ و اشاعت دین کا فریضہ انجام دیتے اور جہاں کہیں بھی رات ہو جاتی، بے سروسامانی کی حالت میں شب گزاری کر لیتے۔ ان کا گزر، جس جانب سے بھی ہوتا مخلوقِ خدا ان کے گرد جمع ہو جاتی اور روحانی و جسمانی شفا اور تسکین حاصل کرتی۔ ان کی ایک اور خصوصیت، بطور معجزہ یہ تھی کہ وہ مریضوں پر ہاتھ

پھیر کر خدا کے حکم سے انھیں شفایاب کر دیتے تھے۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی
(غالبؔ)

جو طبیب اپنا تھا دل اس کا کسی پر زار ہے
مژدہ باد اے مرگ، عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے
(سوداؔ)

دیکھ کر مجھ کو مسیحا نے کہا اے ظالم!
یہ تو ہے عشق کا بیمار، خدا خیر کرے
(سوداؔ)

زندہ کرنا استخواں کو، گرچہ تھا کارِ مسیح
زندہ کرنا شوق کو، تجھ ناز کا اعجاز ہے
(ولیؔ)

جدھر جاتے ہو ہر گھر میں سے یہ آواز آتی ہے
مسیحا ہو جو بیماروں کو دم بھر دیکھتے جاؤ
(آتشؔ)

● احیاے موتی: تفصیل 'اعجازِ مسیحا' کے تحت دیکھیں۔

● ارجن کا بان:

یہ تلمیح مشہور سنسکرت رزمیہ 'مہابھارت' سے لی گئی ہے۔ مہابھارت، مشہور رشی ویدویاس کی تخلیق ہے۔ مہابھارت کی لڑائی قدیم ہندوستان کے چندربنسی راجا کے دو لڑکوں دھرت راشٹر اور پانڈو کے لڑکوں کے درمیان لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں ہندوستان کے تقریباً سبھی راجے مہاراجے شامل تھے۔ ایک طرف پانڈو تھے۔ پانڈو پانچ بھائی تھے، ارجن اپنے بھائیوں میں سب سے بہادر، جنگ جو اور جاں باز تھا۔ پانڈو کے

ہمراہ سری کرشن بھی تھے اور ارجن کی رتھ بانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

مہابھارت کی یہ جنگ کروکشیتر کے میدان میں، جو دہلی کے شمال میں واقع ہے، لڑی گئی تھی۔ اٹھارہ دنوں تک گھمسان کی جنگ ہوئی اور دونوں طرف سے لاکھوں فوجی تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ آخر کار کوروؤں کو منہ کی کھانی پڑی اور میدان پانڈوؤں کے ہاتھ رہا۔

جس طرح ارجن کی جاں بازی اور بہادری ضرب المثل ہے۔ اس کا نشانہ بھی بے داغ تھا۔ ارجن تیر اندازی میں کمال رکھتا تھا۔ اسی کمال کی بدولت ارجن نے سوئمبر میں دروپدی کو جیتا تھا۔

> "دروپدی، پنچال دیس کے راجا دروپد کی بیٹی تھی۔ اس راجا نے ایک بھاری کمان بنوائی تھی اور بلندی پر ایک نشانہ لٹکایا تھا، جس کے نیچے ایک تھالی تھی۔ یہ تھالی جس کے درمیان میں ایک سوراخ تھا، مسلسل ہلتی رہتی تھی۔ راجا نے یہ شرط رکھی تھی کہ جو شخص بھی اس کمان کو اٹھائے گا اور اس پر تانت چڑھا کر پانچ تیر اس طرح مارے گا کہ وہ اس تھالی کے سوراخ میں سے گزرتے ہوئے نشانے پر جالگیں اور اس کو گرادیں، اسی شخص سے وہ اپنی بیٹی کی شادی کرے گا۔ ارجن نے یہ ساری شرطیں پوری کیں اور نشانہ لگا کر دروپدی کو جیت لیا۔"(4)

ارجن کے بان کی مزید تفصیل یہ ہے کہ "وہ اپنے تیروں سے بارش اور ہوا کو روک دیتا تھا اور اگر چاہتا تو ان سے آگ اور پانی برساتا تھا...... اگنی دیوتا نے اس کو اپنی کمان عطا کی تھی۔"(5)

بہادری میں یکتا، تیر اندازی اور کماں داری میں بے مثال شخص کے لیے ارجن کے بان کی تلمیح استعمال کی جاتی ہے۔

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

(ولی)

● ارژنگ مانی:

مشہور مصور اور نقاش مانی کے بنائے ہوئے نگار خانہ یا تصویر خانہ کو کہتے ہیں۔ مانی، ایران کا ایک مشہور نقاش تھا جس نے عہدِ ساسانی 245ھ میں پیغمبری اور نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور سادہ لوح عوام کی اچھی خاصی تعداد اس کی پیروکار اور مرید بن گئی تھی۔ مانی نے اپنی تصویروں اور نقاشی کے اعلیٰ ترین نمونوں کو اپنی پیغمبری اور رسالت کے معجزے کے طور پر پیش کیا تھا۔ انھیں تصویروں کی وجہ سے مانی کا نام ادب اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب ارژنگ، ارتنگ، انگلیون اور شاپورگان کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ایک محقق نے لکھا ہے کہ ''اگرچہ مانی کی جانب کئی کتابوں کا انتساب کیا گیا ہے مگر حقیقتاً وہ ایک ہی کتاب کے مختلف نام اور تلفظ ہیں اور یہ کتاب مانی کی شاہکار تصاویر کا مجموعہ ارژنگ ہے۔

کلک نقاشِ قدرت سے گلستان میں آج
تحفۂ لالہ و گل، صفحۂ نقش ارژنگ
(ذوقؔ)

مانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے شاپور اول کے عہد میں اپنی رسالت کا دعویٰ کیا تھا۔ بادشاہِ وقت اس کی اس حرکت سے بے حد ناراض ہوا اور اسے ملک بدر کر دیا۔ مانی بھاگ کر چین چلا گیا اور وہیں اس نے مصوری اور نقاشی میں کمال بہم پہنچایا اور اپنا مایۂ ناز نگار خانہ تیار کیا۔ شروع کے دنوں میں مانی اور شاپور اول کے رشتے خوش گوار تھے لیکن بعد میں یہ رشتے باقی نہ رہ سکے اور مانی، شاپور اول کے بیٹے بہرام اول کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

مانی نہ بندھے گا کبھو نقش اس کی کمر کا
فرسودہ نہ کر خامۂ مو، فائدہ کیا ہیچ
(سوداؔ)

چلا ہے کھینچنے تصویر میرے بت کی آج
خدا کے واسطے صورت تو دیکھو مانی کی
(میرؔ)

مانی کے ساتھ ساتھ بہزاد کی تلمیح بھی عام ہے۔ بہزاد، ایران کے مشہور ترین مصوروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ مختصر تصاویر بنانے میں کمال رکھتا تھا۔

کہاں ہے تاب مانی کو کہاں بہزاد کو طاقت
کہ تیری ناز کی تصویر تجھ کوں لکھ کے دکھلاوے
(ولیؔ)

تو سن پہ تجھے دیکھ کر کہیں مانی و بہزاد
اللہ نے کھینچی ہے یہ تصویر ہوا پر
(سوداؔ)

● ارسطو:

یونان کا عظیم فلسفی، سکندر اعظم کا معلم، اتالیق اور افلاطون کا شاگرد رشید تھا۔ 384 قبل مسیح میں یونان کی ایک نوآبادی میں پیدا ہوا تھا۔ ''عنفوانِ شباب میں یہ نہایت ہی اوباش اور بدچلن تھا لیکن افلاطون کی تعلیم نے اس پر بے حد اثر کیا اور اس نے حد درجہ جاں فشانی اور محنت سے علوم حاصل کیے۔''(6)

ارسطو، افلاطون کی قائم کردہ اکیڈمی کا طالب علم تھا۔ ارسطو فلسفی بھی تھا اور سائنس داں بھی، اس نے کئی موضوعات پر لکھا ہے۔ ارسطو نے ہر اس علم کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا جو اس وقت دنیا میں رائج تھے؛ علم ادویات، علم حیاتیات اور علم فلکیات میں اہم اضافے کیے۔ ارسطو، اخلاق کے سنہری اصول میں یقین رکھتا تھا یعنی نہ تو انتہائی عیش پسندی اور نہ اپنے آپ کو نعمتوں سے بے بہرہ رکھنا۔ اس کے نزدیک اخلاق کا معیار افراط وتفریط کے درمیان نقطۂ اعتدال ہے۔

خود ارسطو نے بھی ایتھنز میں فلسفے کے ایک اسکول کی بنیاد ڈالی تھی۔ ارسطو،

مشائیت کا بانی ہے۔ مشائیت کی اصطلاح ارسطو کے طریقۂ تدریس سے مستعار ہے، وہ درس دیتا جاتا تھا اور ٹہلتا جاتا تھا لیکن مشائیت کا فلسفیانہ پہلو یہ ہے کہ اس میں محسوس کی حقیقت سمجھنے اور کائنات کے اسی پہلو کو موضوعِ فکر بنانے کی سعی ہے۔

شاہِ مقدونیہ نے سکندر کی تربیت کے لیے ارسطو کو اپنے ہاں بلا لیا اور ارسطو، سکندرِ اعظم کا معلم اور مربی بن گیا۔ کچھ لوگوں نے ارسطو کو سکندر کا وزیر بھی لکھا ہے لیکن تاریخی حقائق اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ مورخوں کی نظر میں وہ صرف سکندر کا استاد اور مربی تھا۔ ارسطو کی تصانیف Poetics (بوطیقا) اور The Ethics اس کے لافانی شاہکار ہیں۔ اس کا انتقال 322 قبل مسیح میں ہوا۔ شاعری اور سائنس کے بیشتر مباحث ارسطو کے مرہونِ منت ہیں۔

ادب آموز ہو مانند ارسطاطالیس
تا جبلت پہ تری ہووے سکندر عاشق
(انشا)

● اژدرِ موسیٰ: تفصیل 'عصائے موسیٰ' کے تحت دیکھیں۔

● اصحابِ فیل:

ملکِ یمن، شاہِ حبش نجاشی کی قلمرو میں شامل تھا۔ نجاشی کی طرف سے یمن کا گورنر جنرل ارباط نامی ایک شخص تھا۔ ارباط کے خلاف ابرہہ نے بغاوت کر دی اور اس کو قتل کر کے بلا شرکتِ غیرے یمن کی حکومت پر قابض ہو گیا تھا اور اپنے حق میں شاہ نجاشی کو رضامند کر لیا تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ ابرہہ شاہی خاندان سے تھا اور چونکہ نکٹا تھا اس لیے اہلِ عرب اسے ابرہۃ الاشرم کے نام سے پکارتے تھے۔ عربی زبان میں نکٹے کو اشرم کہتے ہیں۔ ابرہہ درحقیقت لفظ ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے۔ یہ شخص عیسائیت کی تبلیغ میں تعصب کی حد تک پرجوش تھا۔ عیسائیت کی تبلیغ اور اشاعت کی غرض سے اس نے اپنی تمام قلمرو میں عیسائی مبلغین مقرر کر دیے تھے اور بڑے بڑے گرجا گھروں کی تعمیر کرائی تھی۔ اسی طرح کا ایک

عظیم الشان کلیسا یمن کے دارالحکومت صنعا میں بھی تعمیر کرایا تھا، اس تعمیر سے اس کی غرض یہ تھی کہ اہل عرب، کعبے کی بجائے اسی کلیسا میں آکر حج وغیرہ کے فرائض انجام دیا کریں گے۔ کلیسا کا نام 'القلیس' رکھا گیا تھا جو غالباً یونانی لفظ کلیسا کا معرب ہے۔

اہل عرب نے جب یہ سنا تو ان میں سخت برہمی پیدا ہوگئی۔ ایک حجازی کو اتنی غیرت آئی کہ اس نے موقع پا کر کلیسا کی دیواروں کو نجس کر دیا، ابرہہ کو پتہ چلا تو سخت غضب ناک ہوا اور قسم کھائی کہ جب تک کعبۂ ابراہیمی کو برباد نہ کرلوں گا، چین سے نہ بیٹھوں گا۔ چنانچہ ساٹھ ہزار کا ایک لشکر جرار لے کر کعبہ کو ڈھانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے لیے ایک زبردست ہاتھی بھی منتخب کیا۔ لشکر میں کل نو یا تیرہ ہاتھی تھے۔ ابرہہ یمن سے یلغار کرتا ہوا مُغمّس پہنچا اور وہاں اپنے لشکر کو ترتیب دے کر اور ہاتھیوں کو تیار کر کے مکے میں داخلے کے لیے چل پڑا۔ جب مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان وادیِ مُحسّر میں پہنچا تو ناگاہ ہاتھی بیٹھ گیا اور کعبے کی طرف بڑھنے کے لیے کسی طرح نہ اٹھا۔ اس کا رخ کعبے کے علاوہ کسی اور سمت کیا جاتا تو اٹھ کر دوڑنے لگتا لیکن کعبے کی طرف کیا جاتا تو وہیں بیٹھ جاتا۔ اسی دوران اللہ نے چڑیوں کا ایک جھنڈ بھیج دیا، جس نے لشکر پر ٹھیکری جیسے پتھر گرائے اور اللہ نے اسی سے انھیں کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دیا۔ یہ چڑیاں ابابیل اور قمری جیسی تھیں ہر چڑیا کے پاس تین کنکریاں تھیں ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں، یہ کنکریاں چنے جیسی تھیں مگر جس کو لگ جاتی تھیں اس کے اعضا کٹنا شروع ہو جاتے تھے اور وہ مر جاتا تھا۔ یہ کنکریاں ہر آدمی کو نہیں لگی تھیں لیکن لشکر میں ایسی بھگدڑ مچی کہ ہر شخص دوسرے کو روندتا کچلتا گرتا پڑتا بھاگ رہا تھا۔ پھر بھاگنے والے ہر راہ پر گر رہے تھے اور ہر چشمے پر مر رہے تھے۔ ادھر ابرہہ پر اللہ نے ایسی آفت بھیجی کہ اس کی انگلیوں کے پور جھڑ گئے اور صنعا پہنچتے پہنچتے چوزے جیسا ہو گیا، پھر اس کا سینہ پھٹ گیا، دل باہر نکل آیا اور وہ مر گیا۔

کعبہ تو بہ خدا ہی رکھے آج کہ جوشِ ابرہہ نہیں
ایک اصحاب الفیل کا سایہ دوشِ ہوا پر لشکر ہے
(ذوقؔ)

ابرہہ کے اس حملے کے وقت مکے کے باشندے اور سردارِ مکہ عبدالمطلب جان کے خوف سے گھاٹیوں میں بکھر گئے تھے اور پہاڑ کی چوٹیوں پر جا چھپے تھے۔ جب لشکر، عذابِ الٰہی سے زیروزبر ہو گیا تو اطمینان سے اپنے گھروں کو پلٹ آئے۔ یہ واقعہ نبی ﷺ کی پیدائش سے صرف پچاس پچپن دن قبل ہی پیش آیا تھا لہٰذا یہ 571ء کی فروری کے اواخر یا مارچ کے اوائل کا واقعہ ہے۔ اہل عرب میں یہ واقعہ اس درجہ اہمیت وشہرت کا حامل تھا کہ انھوں نے اس سال کا نام ہی عام الفیل (ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا؛ چونکہ ابرہہ کے لشکر میں ہاتھی بھی تھے اور مکے والے ہاتھیوں سے بہت زیادہ مانوس نہیں تھے، یہ منظر ان کے لیے تعجب اور حیرت بھرا تھا اس لیے اس لشکر کو اہل مکہ نے 'اصحاب الفیل' کے نام سے یاد کیا ہے۔

آتے نہیں نظر میں مری ہاتھی کے سوار
کانوں میں جو فسانۂ اصحابِ فیل ہے
(میرؔ)

وادیِ بطحا میں جیسے برسرِ اصحابِ فیل
معجزہ طیراً ابابیل آیا وقتِ انہزام
(ذوقؔ)

● اصحابِ کہف:

اصحاب کہف کے معنی ہیں 'غار والے'۔ یہ واقعہ حضرتِ عیسیٰ کی بعثت کے چند دنوں بعد ہی پیش آیا تھا اور یہ چند جانباز، جرأت پسند اور حق گو نوجوانوں کی داستانِ حیات کو پیش کرتا ہے جب انھوں نے بادشاہِ وقت کی قہرمانیوں کے باوجود دینِ مسیحی قبول کر لیا تھا اور ایک پہاڑ کی غار میں روپوش ہو گئے تھے۔

اصحاب کہف اور رقیم کا واقعہ درحقیقت ایک ہی ہے۔ قرآن نے بھی اس واقعے

کی تفصیلات بیان کرتے وقت 'اصحاب الکہف والرقیم' کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ رقیم کے معنی کے سلسلے میں مفسرین اور مورخین زبردست اختلاف کا شکار ہیں۔ کوئی اسے رَقم سے مشتق مانتا ہے اور رقیم بمعنی مکتوب (لکھا ہوا) مراد لیتا ہے۔ چونکہ بادشاہِ وقت نے ان کی تلاش کے بعد ان کے نام، پتھر کی ایک تختی پر کندہ کرادیے تھے، کچھ لوگ رقیم اس وادی کا نام بتلاتے ہیں جس کے دامن میں یہ غار واقع تھا۔ کچھ لوگ اس پہاڑ کا نام ہی رقیم بتلاتے ہیں جس کے غار میں اصحابِ کہف، بادشاہِ وقت سے بچ بچا کر روپوش ہوگئے تھے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ رقیم، عقبہ (ایلہ) کے قریب ایک شہر کا نام ہے اور یہ رومی سلطنت میں واقع ہے۔ یہ آخری قول ہی حقیقتِ حال سے زیادہ قریب ہے کیونکہ تاریخ اور آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہوگئی ہے کہ خلیجِ عقبہ سے شمال کی جانب ایک پہاڑ کی بلندی پر شہر رقیم آباد تھا اور اس پہاڑ میں ایسے عجیب وغریب غار موجود ہیں جہاں دن کی تپش اور دھوپ بآسانی نہیں پہنچ سکتی۔ ایک غار ایسا بھی دریافت ہوا ہے جس کے دہانہ پر قدیم عمارتوں کے نشانات موجود ہیں جو کسی ہیکل کے موجود ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔

شہر رقیم، بت پرستی اور اصنام پرستی کا مرکز تھا۔ بادشاہ سے لے عوام الناس تک شرک اور ضلالت و گمراہی کے اندھیروں میں غرق تھے۔ ان حالات میں عیسائیت سے متاثر ہو کر چند حوصلہ مند جوانوں نے دینِ مسیحی قبول کرلیا اور بت پرستی سے تائب ہوگئے۔ یہ لوگ موحد اور دینِ عیسوی کے پیروکار بن بیٹھے۔ شدہ شدہ یہ خبر بادشاہِ وقت کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے سرِ دربار ان تمام نوجوانوں کو بلا بھیجا۔ دربار میں بھی ان نوجوانوں نے حق کا برملا اظہار کیا، بادشاہ کو یہ بات پسند نہ آئی، پھر بھی اس نے معاملے پر ازسرِ نو غور کرنے کے لیے ان لوگوں کو چند دنوں کی مہلت دی، یہ لوگ دربار سے واپس ہوئے اور باہم صلاح ومشورہ کرکے خاموشی کے ساتھ پہاڑ کی وادی میں چلے گئے تاکہ بادشاہ اور اس کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہیں اور مشرکوں کے شر سے مامون ومحفوظ رہ کر یادِ

الٰہی میں زندگی کے بقیہ ایام گزار سکیں۔ غرضیکہ یہ لوگ پہاڑ کے ایک غار میں جا چھپے وہاں اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی اور ان کی حفاظت وصیانت کا مکمل انتظام بھی فرما دیا۔

جب یہ لوگ آبادی سے نکل کر ویرانے کی طرف جا رہے تھے، ان کا کتا بھی ان کے ہمراہ ہو لیا، غار کے اندر یہ نیک انسان محوِ خواب تھے اور ان کا رفیق کتا اپنے اگلے پاؤں پھیلائے غار کے دہانہ پر باہر کی جانب منہ کیے بیٹھا ہے۔ یہ منظر اس قدر بارعب اور ہیبت ناک تھا کہ عوام الناس ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔

بہر حال یہ خداترس نوجوان، محواستراحت رہے، یہاں تک کہ صدیاں بیت گئیں، ملک میں انقلابات آئے، بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا اور دینِ مسیحی کو فروغ حاصل ہوتا گیا۔ شہر رقیم میں بھی دینِ مسیحی کا دور دورہ ہو گیا۔ برسہا برس کے بعد یہ نوجوان نیند سے بیدار ہوئے۔ بیداری کے بعد یہ لوگ اندازہ نہ لگا سکے کہ ہم کتنی مدت سوتے رہے۔ آخر کار ان کا ایک ساتھی چند سکے لے کر بازار کی جانب چل پڑا تا کہ کھانے کا بندوبست کر سکے۔ چھپ چھپا کر جب یہ نوجوان بازار پہنچا اور ایک باورچی کی دوکان سے سامان لے کر قیمت ادا کرنے لگا تو ان کا یہ راز کھل گیا کیونکہ یہ سکہ قدیم زمانے کا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی اور جب اصل حقیقت معلوم ہوگئی کہ یہ نوجوان اور اس کے ساتھی مشرک بادشاہ کے خوف سے غار میں جا چھپے تھے تو لوگ بے حد مسرور ہوئے اور ان کی واپسی کے لیے اصرار کرنے لگے۔ ادھر نوجوان نے آکر اپنے تمام ساتھیوں سے صورتِ حال کی تفصیل بیان کی اور شہر والوں کی خواہش کا اظہار کیا مگر وہ لوگ واپسی کے لیے رضامند نہیں ہوئے اور زندگی کے بقیہ ایام اسی غار کے اندر گزار دیے۔ جب ان بندگانِ خدا کا انتقال ہو گیا تو اہلِ اقتدار نے ان کی یاد میں غار کے دہانہ پر ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کر دیا۔

قرآن میں اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں کوئی واضح شہادت نہیں دی گئی ہے البتہ عبداللہ ابن عباس کا قول ہے کہ ''وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا''۔ اسی طرح اصحاب کہف کے ناموں کے بارے میں بھی کوئی حتمی شہادت موجود نہیں ہے،

اسرائیلی روایتوں میں ان کے نام یہ بتلائے گئے ہیں۔ ''مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، کسطونس، ونیموس، نطونس، بیرونس'' اور ان کے کتے کا نام قطمیر یا حمران بتلایا گیا ہے۔

ترا تو سیہ بھی یوں ہی ہے داخل حسنات
کہ جیسے صحبتِ اصحابِ کہف میں قطمیر
(ذوقؔ)

اصحابِ کہف کی مدتِ خواب، عام طور پر تین سو سال یا تین سو نو سال بتلائی گئی ہے اور مشرک بادشاہ کا نام دقیانوس بتایا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں ہی اسرائیلی روایتوں میں مذکور ہیں، قرآن اور احادیث میں اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ اس پورے واقعے میں نوجوانوں کا لبرل رویہ، بادشاہِ وقت کے سامنے ان کے عزم و استقلال، خدا کی راہ میں ان کی سپردگی اور استقامت اور حبِ دنیا سے بے نیازی کو سامنے رکھ کر تلمیح کا استعمال کیا گیا ہے، کتے کی وفاداری اور جاں نثاری، نیک لوگوں کی رفاقت و صحبت اور اس کے اثرات کو بھی تلمیح کے طور پر برتا گیا ہے۔

سوتے میں دل پہ رنج قیامت کے سہہ گئے
اصحاب کہف کروٹیں لے لے کے رہ گئے
(مودبؔ)

● اعجاز داؤد، زرہِ داؤدی:

حضرت داؤد کو یہ معجزہ دیا گیا تھا کہ لوہا ان کے ہاتھ میں موم کی طرح نازک اور نرم ہو جاتا تھا۔ شاہی اور پیغمبری کے باوجود حضرت داؤد نے خدا کے دربار میں دعا مانگی تھی کہ خدایا! کوئی ایسی صورت پیدا کر دے کہ میں رزقِ حلال کما سکوں؛ میں اپنی کفالت کا بوجھ بیت المال پر نہیں ڈالنا چاہتا۔ چنانچہ داؤد کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے اس شکل میں شرف قبولیت بخشا کہ ان کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی مانند نرم اور نازک کر دیا۔ حضرت داؤد زرہ سازی کا کام کرتے تھے اس معجزے کے طفیل جب زرہیں بناتے تو سخت مشقت اور آلاتِ حدادی کے بغیر لوہے کو اپنی خواہش کے مطابق موڑ لیتے اور حسبِ منشا انھیں ڈھال لیتے تھے۔

تاریخی اعتبار سے حضرت داؤد کا زمانہ 'لوہے کے زمانے' سے متعلق ہے۔اس وقت لوہے کی صنعت نے اتنی ترقی تو کرلی تھی کہ فولاد کو پگھلا کر سپاٹ ٹکڑے بنا لیے جاتے اور پھر ان سے زرہ سازی کی جاتی؛ مگر یہ اتنی بھاری اور بوجھل ہوتی تھیں کہ قوی ہیکل انسانوں کے علاوہ عام فوجیوں کے لیے ان کا استعمال مشکل اور تکلیف دہ تھا۔داؤد نے ایسی زرہیں ایجاد کیں جو صنعت وکاریگری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی تھیں۔ان سے پہلے زرہیں، بغیر حلقوں اور کڑیوں کی بنائی جاتی تھیں حضرت داؤد نے کنڈوں اور حلقوں والی زرہیں بنائیں جو اتنی سبک اور ہلکی ہوتی تھیں کہ میدانِ جنگ میں سپاہی ان کو پہن کر سبک خرامی سے نقل وحرکت کر لیتے تھے۔اب زرہِ داؤدی ایسی زرہوں کو کہا جاتا ہے جو سبک اور ہلکی ہوں اور صنعت وکاریگری کے اعلیٰ معیاروں پر کھری اترتی ہوں۔

دلِ آہنیں جب ہوا موم اس کا
ہم الفت کو اعجازِ داؤد سمجھے
(ذوقؔ)

خضر اس کی سرکار کا آب دار
زرہ ساز داؤد سے دس ہزار
(میر حسنؔ)

داؤد کی زرہ شہِ والا کے بر میں تھی
اور ذوالفقار حیدر صفدر کمر میں تھی
(انیسؔ)

● اعجازِ مسیح، اعجازِ مسیحا، اعجاز مسیحائی:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر دور میں قوموں کی رشد وہدایت کے لیے انبیا ورسل بھیجے اور ان کی حقانیت وپیغمبرانہ شان کی صداقت اور بالاتری کے لیے انھیں معجزے بھی عطا کیے اور معجزے بھی ایسے جو اس زمانہ کی علمی ترقیات اور قومی وملکی خصوصیات کے حسب حال

تھے۔ ابراہیمؑ کی قوم سورج کو سب سے بڑا دیوتا مانتی تھی اور چونکہ سورج آگ اور حرارت دونوں کا حامل ہے، اس لیے قومِ ابراہیمی آگ کو سورج دیوتا کا مظہر جان کر اس کی پرستش کرتی تھی۔ مگر خدائے تعالیٰ نے جب حضرت ابرہیم کو آگ کے شعلوں سے حفاظت وسلامتی کے ساتھ باہر نکال دیا تو قوم درماندہ و عاجز رہ گئی۔ حضرتِ موسیٰ کے دور میں جادوگری اور سحر کا بڑا زور تھا انھیں ایسے ایسے معجزے عطا کیے گئے جس کے سامنے بڑے بڑے جادوگر اپنا کرتب دکھانے میں ناکام رہے اور موسیٰؑ کی حقانیت وصداقت کے قائل ہو گئے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں طب اور حکمت کا بہت چرچا تھا۔ چنانچہ ان کو جو معجزات عطا کیے گئے یعنی مردوں کو زندہ کرنے یا بیماروں کو شفا دینے اور پیدائشی نابینا کو بینا کردینے کا معجزہ، اس کے سامنے یونان کے اطبا اور حکما کی صلاحیتیں بھی پیش نہ پا سکیں۔

قرآن میں حضرت عیسیٰ کے جن معجزات کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ کسی مردے کے پاس جا کر قم باذن اللہ (کھڑا ہو اللہ کے حکم سے) کہتے تھے تو اس تنِ بے جان میں جان آجاتی تھی اور وہ مردہ شخص زندہ ہو جایا کرتا تھا۔ گویا حضرت عیسیٰ کو خدا کی طرف سے یہ معجزہ عطا کیا گیا تھا کہ وہ خدا کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ ایک اور معجزہ یہ دیا گیا تھا کہ وہ مادرزاد اندھوں کو بینائی عطا کرتے تھے، جذامیوں اور کوڑھیوں کے مرض پر دستِ شفا پھیر کر انھیں رو بہ صحت کر دیتے تھے۔ ان کی اس حکمت کے آگے بڑے بڑے طبیب بھی عاجز تھے۔ علاج معالجے اور ظاہری تدبیروں سے مایوس ہو کر مریض آپ کے پاس آتے اور ایک ذرا سی جنبشِ لب اور دستِ شفا کے لمس سے فیض یاب ہو کر شاداں وفرحاں، صحت مند اور شفایاب ہو کر لوٹتے تھے۔ غالباً اسی رعایت سے حضرت عیسیٰ کا لقب مسیح یا مسیحا بھی ہے۔ حضرت عیسیٰ مٹی کی شکل کا پرند بنا کر اس میں پھونک مارتے اور وہ زندہ اور جاندار ہو کر اڑنے لگتا تھا، خدا کے حکم سے مٹی کے اس پرند میں جان پڑ جاتی تھی۔ ان سب کے علاوہ ایک معجزہ یہ بھی دیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ یہ بتلا دیتے تھے کہ فلاں شخص نے کیا کھایا ہے اور کیا ذخیرہ رکھ چھوڑا ہے، مگر ان کا یہ

آخری معجزہ تلمیحات کے نقطۂ نظر سے کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتا۔

تلمیحات کے نقطۂ نظر سے حضرت عیسیٰ کے ان معجزات کے بارے میں چند تلمیحات سامنے آتی ہیں جن کو شعرا نے مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے پیش کیا ہے مثلاً مردوں کو زندہ کرنے کے لیے قم، قم باذن اللہ، قم عیسیٰ، اعجاز مسیح اور احیاے موتی جیسی تلمیحات استعمال کی گئی ہیں جن کا تعلق اسی خاص معجزے سے ہے۔ اسی طرح مریضوں کی شفایابی کے لیے بھی اعجاز مسیح، لب عیسیٰ، نسخۂ عیسیٰ، نفسِ عیسیٰ اور دمِ عیسیٰ کی تلمیح مستعمل ہے۔ دمِ عیسیٰ کی تلمیح، مٹی کے پرند کے لیے بھی استعمال میں لائی گئی ہے، چونکہ مٹی کے پرند بنا کر اس میں پھونک مارتے تھے تو اس میں جان پڑتی تھی اسی رعایت سے دمِ عیسیٰ کی ترکیب لائی گئی ہے۔ مٹی کے پرند کے لیے مرغِ عیسیٰ کی تلمیح مستعمل ہے۔

ہر درد کی دوا ہے جز دردِ دل کی تجھ پاس
تیرا مریض منکر، عیسیٰ کے ہے نفس کا
(سوداؔ)

نسخہ ترے مریض کا عیسیٰ کو جو دیا
دیکھ ان نے حرف کو رو رو کے دھو دیا
(سوداؔ)

اپنے چمن کو فائدہ کیا تجھ سے اے صبا
یہ جا وہ ہے کہ یاں دمِ عیسیٰ سموم ہو
(سوداؔ)

زندہ کرنا استخواں کو، گرچہ تھا کارِ مسیح
زندہ کرنا شوق کو، تجھ ناز کا اعجاز ہے
(ولیؔ)

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو، شفا کیوں نہیں دیتے
(فیضؔ)

ہلا تو بھی لب کو کہ عیسیٰ کے لب کی
چلی جائے ہے بات مدت سے اب تک
(میرؔ)

نہیں عیسیٰ تو، پر سخن سے ترے
تنِ بے جاں میں جان پڑتی ہے
(سوداؔ)

ہماری لاش پہ آوازِ قم باذن اللہ
تم آ کے حضرت عیسیٰ عبث سناتے ہو
(ذوقؔ)

احیا ہوئے موتی، تیری شیریں سخنی سے
سودا دمِ عیسیٰ ہے ترے نائے قلم میں
(سوداؔ)

● افلاطون:

یونان کا عظیم ترین فلسفی، سقراط کا ممتاز ترین شاگرد اور پیروکار تھا۔ سقراط، خود ایک بڑا فلسفی تھا۔ یونان کے فلاسفہ کے اسی سلسلۃ الذہب کی وجہ سے عقلِ یونانی کی شہرت ہوئی۔ افلاطون کا زمانہ 427 قبل مسیح سے شروع ہو کر 347 قبل مسیح پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

"بیس سال کے سن تک اس کو شاعری اور ڈرامہ نویسی سے شوق رہا۔ اس کے بعد جب سقراط سے ملاقات ہوئی تو اس نے اپنی تمام تصانیف جلا دیں، آٹھ سال تک سقراط کے ساتھ رہا۔ سقراط کے مرنے پر یونان و مصر میں گھومتا پھرا۔ اس کے بعد ساری زندگی تصنیف اور تعلیم میں بسر کر دی۔"(7)

افلاطون، مشہور عالم کتاب 'جمہوریہ' (The Republic) کا مصنف ہے۔ اس کتاب میں افلاطون نے ایسے سماج کے قیام کی تجویز پیش کی تھی جسے تین طبقات میں تقسیم

کیا جاسکتا تھا۔افلاطون کی موت کا واقعہ دل چسپ ہے۔صاحبِ غیاث اللغات نے لکھا ہے کہ "77 برس کی عمر میں افلاطون ایک بڑے خم (مٹکے) میں بیٹھ گیا تھا۔شاگردوں نے خم کا منہ بند کر کے اس کی وصیت کے مطابق ایک پہاڑی غار میں رکھ دیا، پھر نہیں معلوم کہ اس کا حشر کیا ہوا۔"(8)

فارسی ادب میں ایک اور فلسفی دیوجانس کی خم نشینی اور افلاطون کی خم نشینی کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔اردو میں خمِ افلاطون کی تلمیح مروج ہے۔

ہر مخبط بھی خیال اپنے ہی افلاطون ہے
عقل پر ہوگی اسے، وہ جو ترا مجنون ہے
(سوداؔ)

جنھیں ہے ہوش، بے ہوشی کے طالب ہیں اگر دیکھو
چھڑی ہے مے پرستی نام سے خم فلاطوں کے
(یقیںؔ)

چین کی جا نہیں دنیا میں کوئی جز خم کدہ
کیا ہی دانہ ہے کہ ساکن خم میں افلاطوں ہوا
(ناسخؔ)

- اورنگِ جم: تفصیل 'تختِ جمشید' کے تحت دیکھیں۔
- اورنگِ سلیماں: تفصیل 'تختِ سلیماں' کے تحت دیکھیں۔
- ایوانِ کسریٰ، ایوانِ مدائن: تفصیل 'قصرِ نوشیرواں' کے تحت دیکھیں۔
- بارگاہِ کسریٰ: تفصیل 'قصرِ نوشیرواں' کے تحت دیکھیں۔
- باغِ ارم: تفصیل 'شداد' کے تحت دیکھیں۔
- باغِ رضواں: تفصیل 'رضوان' کے تحت دیکھیں۔
- بت خانۂ بہزاد: تفصیل 'بہزاد' کے تحت دیکھیں۔

● بخت زلیخا:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عزیز مصر کے انتقال کے بعد زلیخا کا نکاح یوسف کے ساتھ ہو گیا اور دو بچے بھی ہوئے، ایک کا نام افرائیم اور دوسرے کا نام میشا تھا۔ افرائیم ہی یوشع بن نون اور حضرت ایوب کی بیوی رحمت کے والد تھے۔ لیکن یہ بات کسی مستند روایت سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے نکاح والی بات صحیح ثابت نہیں ہوتی ہے۔

امر واقعہ ہے کہ یوسف کے واقعہ میں داستانی عناصر کی بے شمار جھلکیاں موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ یوسف اور زلیخا پر بے شمار داستانیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ان داستانوں میں بہت ساری ایسی باتیں بھی شامل کر لی گئی ہیں قرآن وحدیث جن کی تصدیق نہیں کرتے۔ مثلاً یہ کہ زلیخا اخیر عمر میں جوان ہو گئی تھی اور اس کی شادی یوسف علیہ السلام سے ہو گئی تھی۔ اس طرح سے زلیخا دوبارہ جوان ہو گئی اور ذلت و رسوائی کے دور سے گزر کر کامیاب و کامران رہی۔ یہ سب بے سروپا اور مہمل باتیں ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ مگر شاعروں نے ان واقعات میں بھی اپنی طبیعت کی جولانیاں اور افتادِ فکر کے نمونے دکھائے ہیں اور تلمیح کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔

پیری میں وصلِ غیرتِ یوسف ہوا نصیب
بختِ وفا مثالِ زلیخا جواں ہے اب
(ذوقؔ)

پند گو حالِ زلیخا یاد کر کچھ خیر ہے
کامِ دل جس کو ملا یاں، بعدِ رسوائی ملا
(مومنؔ)

● برادرانِ یوسف:

حضرت یعقوبؑ اپنے تمام بیٹوں میں حضرت یوسف کو سب سے عزیز رکھتے تھے۔ بیٹے کے لیے باپ کا یہ لگاؤ اور عشق، باقی بھائیوں کے لیے ناقابل برداشت بن گیا

تھا۔ اب وہ اس کوشش میں لگے رہتے کہ کسی حیلے اور بہانے سے یعقوب کے دل سے یوسف کی محبت کو نکال دیں یا پھر یوسف کو راستے سے ہٹا دیں کہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔

یوسفؑ کے بھائیوں کے دل میں رشک و حسد اور رقابت کی آگ بھڑکتی رہی۔ بھائی یہ سوچتے تھے کہ ہم طاقت اور تعداد میں یوسفؑ اور اس کے بھائی کے مقابل بہت زیادہ ہیں اس لیے باپ کی محبت و شفقت کے حقدار ہمیں ہیں۔ وہ یعقوبؑ کے سامنے بھی بارہا اس کا اظہار کر چکے تھے۔ بھائیوں کے اس حاسدانہ تخیل پر یوسفؑ کے خواب نے تازیانے کا کام کیا۔ آخر کار انھیں بھائیوں نے یوسف کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔

قصہ نہیں سنا کیا یوسف ہی کا جو تو نے
اب بھائیوں سے چندے تو گرگ آشتی کر
(میرؔ)

جہاں میں قصۂ یوسف ہے آئینہ کہ پسر
پدر کا درد نہ مہرِ برادری جانے
(سوداؔ)

● براق:

یہ وہ جانور تھا جو شبِ معراج میں رسول اللہ کی سواری کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ جب جبرئیل نے آپ کو کعبے سے بیت المقدس لے جانا چاہا تو سواری کی غرض سے یہ جانور پیش کیا۔ براق نامی یہ جانور اپنی جسامت میں خچر سے کچھ چھوٹا اور گدھے سے کچھ بڑا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ حدِ نگاہ تک اس کا ایک ایک قدم پڑتا تھا یعنی جہاں تک نگاہ جاتی تھی، ایک جست میں براق وہاں تک پہنچ جاتا تھا۔ براق کی تیز رفتاری کا راز اس کے نام میں بھی پوشیدہ ہے۔ براق دراصل برق سے مشتق ہے جس کے معنی بجلی کے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس جانور کی رفتار بجلی کی طرح تیز تھی۔ اسی برق رفتار جانور پر بیٹھ کر آپ نے کعبے سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے آسمانوں

تک کا طویل ترین سفر رات کی چند ساعتوں میں مکمل کر لیا تھا۔

وصفِ براق و دلدل اب کہہ تو کروں میں کیا بیاں
شرق سے راہ تا بہ غرب جن کے تئیں ہیں گام دو
(سودا)

آمد و رفت میں تھا ہم قدمِ برق براق
مرغزار چمن عالمِ بالا بادل
(محسن)

- برقِ طور: تفصیل 'تجلیِ طور' کے تحت دیکھیں۔
- بلبلِ سدرہ: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔
- بلقیس و سلیماں:

ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان کے واقعے میں بھی تلمیحات کے بعض پہلو موجود ہیں۔ یہ واقعہ بلاغت و جامعیت کے ساتھ قرآن میں مذکور ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بار کا ذکر ہے کہ دربارِ سلیمانی، پوری شان وشوکت کے ساتھ آراستہ تھا۔ سبھی درباری اپنے اپنے مخصوص مقامات پر نظم وضبط کے ساتھ ایستادہ تھے۔ اچانک حضرت سلیمان نے پرندوں کی فوج کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ مشہور پرندہ اور قاصد ہدہد، اپنی جگہ سے غیر حاضر ہے۔ وہ اس کی غیر حاضری پر انتہائی ناراض ہوئے اور سزا کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ہدہد آن موجود ہوا۔ حضرت سلیمان نے اس سے غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تو وہ کہنے لگا کہ میں ایک ایسی اطلاع لایا ہوں جس کے بارے میں آپ ابھی تک انجان ہیں ۔سبا کے ملک میں ایک ملکہ رہتی ہے جو آفتاب کی پرستش کرتی ہے اور اس کا تخت بھی خاص خوبیوں کی وجہ سے بڑا عظیم الشان ہے۔ حضرت سلیمان نے ہدہد کی اس خبر کی صداقت جاننے کے لیے ملکۂ سبا کو ایک خط لکھا، وہ خط ہدہد ہی لے کر ملکہ کی خدمت میں پہنچا آیا۔ حضرت سلیمان نے اس خط میں ملکۂ سبا کو اسلام کی دعوت پیش کی تھی۔

خط جیسے ہی ملکہ کی خدمت میں پہنچا اس نے اپنے درباریوں اور ارکانِ دولت سے مشورہ کیا اور آخر کار اپنے چند قاصدوں کو نذر و نذرانے اور بیش قیمتی تحائف دے کر حضرت سلیمان کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب وہ قاصد حضرت سلیمان کے دربار میں پہنچے تو حضرت سلیمان نے تحائف لینے سے انکار کر دیا۔ وہ اہلِ سبا کے قبولِ اسلام سے کم کسی چیز پر آمادہ نہ ہوئے؛ چنانچہ قاصد بے نیل مرام واپس لوٹ گئے۔ آنے کے بعد ان لوگوں نے ملکہ سے شان و شوکت کی وہ ساری تفصیل سنائی جو دربارِ سلیمانی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے۔ اب ملکہ نے بنفسِ نفیس سلیمان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا اور دربارِ سلیمانی کے لیے روانہ ہوگئی۔ ادھر حضرت سلیمان کو خدائے تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ملکۂ سبا کی آمد کی خبر پہنچا دی تھی اور انھوں نے ملکہ کے پہنچنے سے قبل ہی اس کا تختِ شاہی منگوانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ انھوں نے یہ کام اپنے ایک مقرب کی مدد سے کیا تھا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان کا یہ مقرب ان کا وزیر تھا۔ اس کا نام آصف بن برخیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اسمِ اعظم کا علم بخشا تھا اور اسی علم کی بدولت چشم زدن میں اس نے ملکہ کا تخت دربارِ سلیمانی میں لا حاضر کیا تھا۔

تخت جب دربار میں پہنچ گیا تو حضرت سلیمان نے معجزانہ شان کے اظہار اور ملکہ کے امتحان کی خاطر اس میں معمولی رد و بدل بھی کرایا تھا اور جب ملکہ حضرت سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوئی تو وہی تخت دکھا کر اس سے اس کے تخت کے بارے میں سوال کیا گیا۔ ملکہ نے نہایت عاقلانہ انداز میں اس کا جواب دیا۔ پھر ملکہ کو حضرت سلیمان نے اپنے عالیشان محل میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا۔ یہ محل نہایت نفیس اور قیمتی آبگینوں اور شیشوں سے تیار کیا گیا تھا۔ پورا محل شیشے کا بنا ہوا تھا اور فنکاری، نقاشی اور صنعت کاری میں لاثانی تھا۔ محل کے راستے میں ایک حوض بھی بنایا گیا تھا، حوض میں پانی لبالب بھرا ہوا تھا مگر اس کے اوپر سے آبگینوں اور بلور کے ٹکڑوں کا ایسا فرش بچھایا گیا تھا کہ دیکھنے والے کی نگاہیں یہ یقین کر لیتی تھیں، گویا صحن میں صاف شفاف پانی بہ رہا ہے۔ ملکہ جب محل میں

داخل ہونے کے لیے آگے بڑھی تو اپنے کپڑوں کو پانی سے بچانے کے لیے اپنے پائچے چڑھا لیے۔ حضرت سلیمان نے کہا اس کی کوئی ضرورت نہیں، یہ پانی نہیں بلکہ سارا فرش آبگینوں اور بلور کے ٹکڑوں سے تیار کیا گیا ہے۔ اب ملکہ کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ حضرت سلیمان کی یہ شان و شوکت اور بے نظیر طاقت کسی ایسی ہستی کی عطا کردہ ہے جو شمس و قمر اور پورے نظامِ کائنات کا خالق و مالک ہے اور حضرت سلیمان اس کے فرستادہ اور پیغمبر ہیں۔ فوراً ہی اس نے آفتاب پرستی سے توبہ کر لی اور حضرت سلیمان کے ہاتھوں مشرف باسلام ہوگئی۔ تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت سلیمان نے ملکہ سبا سے نکاح کر لیا اور اس کو اپنے ملک میں جانے کی اجازت دی اور خود بھی گاہے گاہے اس سے ملاقات کرتے رہتے تھے لیکن قرآن شریف اور احادیثِ صحیحہ اس نکتے پر بالکل خاموش ہیں۔

اس پورے واقعے میں دو چار ایسے مقامات اور پہلو ہیں، تلمیح نگاروں نے جس کی مدد سے صنعتِ تلمیح کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ اس میں سب سے اہم ملکہ کا تخت ہے اور دوسرے خود ملکہ کی اپنی شخصیت، سلیمان کا دربار، وزیر آصف بن برخیا اور حضرت سلیمان کا شیش محل۔

ملکہ کے تخت کے بارے میں ''کہا جاتا ہے کہ اس کا طول 80 ہاتھ عرض 40 ہاتھ اور اونچائی 30 ہاتھ تھی اور اس میں موتی، سرخ یاقوت اور سبز زمرد جڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ یہ قول مبالغے سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔ سبا، یعنی ملکِ یمن میں ملکہ کا جو محل ٹوٹی پھوٹی شکل میں موجود ہے اس میں اتنے بڑے تخت کی گنجائش نہیں۔''(9)

لیکن پھر بھی ملکہ کا تخت شانداری اور خوبصورتی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا تھا۔ وہ بلاشبہ خوبصورتی اور کاریگری میں بے نظیر تھا ورنہ ہدہد تختِ ملکہ کی تعریف میں اتنا رطب السان نہ ہوتا۔

ملکہ سبا کے نام کے بارے میں قرآن نے تو اشارہ نہیں کیا ہے مگر عرب یہود کی اسرائیلی داستانوں میں اس کا نام بلقیس بتلایا گیا ہے۔ اب یہ نام اتنا مشہور و معروف ہو چکا

ہے کہ ملکۂ سبا کا ذکر آتے ہی لفظ بلقیس خود بخود ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔

اسے بلقیس گر بنایا تھا
میں بھی زبندہ تھا سلیماں فر
(مومنؔ)

سحر جو گھر میں بشکلِ آئینہ تھا میں بٹھا نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ حور طلعت بہ شکل بلقیس و ماہِ کنعاں
(ذوقؔ)

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت
(غالبؔ)

سنی جو ماجرا بلقیسِ دوراں
لگیا اس آئے تیوں پھر کر سلیماں
(ابنِ نشاطی)

● بوئے قمیص، بوئے یوسف:

قید خانے سے باعزت بری ہونے کے بعد جب یوسف عزیزِ مصر کے عہدے پر فائز ہو گئے تو فرعون کے خواب کی تعبیر رنگ لے آئی۔ مصر اور گرد و نواح کے علاقے میں اتنا زبردست قحط پڑا کہ الحفیظ والاماں۔ مگر یوسف نے اپنے علم و فراست اور حفظ ماتقدم کی بنیاد پر قحط سے لڑنے کی تیاری بھی کر لی تھی۔ قحط کے دنوں میں آس پاس کے لوگ غلہ لینے مصر آتے تھے۔ برادرانِ یوسف بھی غلہ لینے مصر پہنچے یوسف نے ان لوگوں کو فوراً پہچان لیا مگر بھائی انھیں نہ پہچان سکے۔ یوسف نے پیغمبرانہ شان کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی خوب خاطر تواضع کی اور نہ صرف بھرپور غلہ دیا بلکہ ان کی رقم بھی انھیں واپس کر دی۔ اور اگلی بار سب سے چھوٹے بھائی بنیامین کو لانے کی شرط پر غلہ دینے کی رضامندی ظاہر کی۔ بھائیوں نے عزیزِ مصر کا مطالبہ باپ کے سامنے رکھا۔ یعقوب نے بادلِ ناخواستہ بنیامین کو

ساتھ کر دیا کیوں کہ وہ یوسف کے سلسلے میں ایک بار دھوکا کھا چکے تھے۔ بہر حال برادرانِ یوسف جب دوبارہ مصر پہنچے تو یوسف نے در پردہ بنیامین کے کجاوے میں شاہی پیالہ رکھوا دیا کیونکہ مصرؔی قانون کے مطابق غیر مصری کو روک لینا سخت ممنوع تھا۔ غرض غلہ لے کر قافلہ ابھی کچھ دور ہی چلا تھا کہ ان کے بوروں کی تلاشی شروع ہوگئی بنیامین کے کجاوے سے شاہی پیالہ برآمد ہوا اور شریعتِ یعقوبی کی رو سے بنیامین کو یوسف کے پاس رک جانا پڑا۔ اس درمیان یوسف اور بنیامین ایک دوسرے کو پہچان چکے تھے۔ برادرانِ یوسف کنعان پہونچے اور جب یعقوبؑ کو واقعے کی خبر دی تو شدتِ رنج و غم اپنی انتہا کو پہونچ گیا مگر صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انھوں نے بھائیوں کو سہ بارہ مصر بھیجا کہ وہ یوسف اور بنیامین کو تلاش کریں۔ بھائی جب مصر پہونچے تو حضرتِ یوسف نے ان پر اپنی شخصیت کا راز کھولا، برادرانِ یوسف اپنے کیے پر نادم تھے وہ معافی کے خواستگار ہوئے، دربارِ یوسفی سے ان کو معافی دے دی گئی۔ اور یوسف نے ان سے کہا کہ اب تم کنعان جاؤ اور میرا یہ پیرہن لیتے جاؤ۔ یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا انشاء اللہ شمیمِ یوسف ان کی آنکھوں کو روشن کر دے گی اور تمام خاندان کو مصر لے آؤ۔

خبر لے پیرِ کنعاں کی کہ کچھ آج
نپٹ آوارہ بوے پیرہن ہے
(میرؔ)

ادھر قافلہ پیرہنِ یوسف لے کر مصر سے نکلا ادھر یعقوبؑ کو وحیِ الٰہی سے یوسف کی خوشبو آنے لگی، بوے یوسف سے ان کی مشامِ جاں معطر ہونے لگی۔ وہ قبیلے والوں سے کہنے لگے 'اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ کو یوسف کی مہک آرہی ہے' اہلِ خاندان کہنے لگے 'بخدا تم تو اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہو'۔

مگر تقدیرِ الٰہی کی کرشمہ سازی کا اظہار ہو کر رہا۔ قافلہ بخیریتِ تمام کنعان پہونچا

اور جیسے ہی پیرہنِ یوسف دیدۂ یعقوبؑ سے مس کیا گیا ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

قالبِ بے جاں میں جاگ اٹھا شرارِ زندگی
دیکھیے بوے قمیصِ ماہِ کنعاں دیکھیے
(اصغرؔ)

کچھ دن گزر جانے کے بعد یعقوبؑ اپنے خاندان سمیت مصر کو روانہ ہو گئے۔ وہاں شاہی خاندان کے شایانِ شان ان کا استقبال ہوا اور جب دربار منعقد کیا گیا تو مصری حکومت کے دستور کے مطابق یعقوبؑ، ان کی بیوی اور سبھی بھائی تعظیماً سجدے میں گر پڑے، اس طرح خوابِ یوسف کی تعبیر حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ فرعون نے مصر میں ہی یعقوبؑ کے خاندان کو بس جانے کی تمام سہولیات مہیا کرا دیں اور اس طرح بنی اسرائیل کنعان سے ترکِ وطن کر کے مصر میں آباد ہو گئے۔

فیضؔ نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوبؑ جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے
(فیضؔ)

● بہزاد:

ایران کا ایک مشہور مصور تھا اور عام طور پر مانی کا مدمقابل سمجھا جاتا ہے۔ ''کمال الدین بہزاد کو مختصر تصاویر بنانے میں بڑا کمال حاصل تھا۔ اس نے تیمور نامہ اور بوستانِ سعدی میں تصاویر بنائی تھیں۔ شاہِ ایران، اسماعیل صفوی اس کا قدردان تھا۔ بہزاد، 1524ء میں زندہ تھا۔ بہزاد کے شاگردوں میں شیخ زادہ خراسانی اور مظفر علی کو شہرت نصیب ہوئی۔''(10)

بہزاد کے تعلق سے بت خانۂ بہزاد کی تلمیح استعمال ہوتی ہے۔

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانۂ بہزاد
(اقبالؔ)

دم بہ دم رنگ ہے تغیر مرا، حیراں ہے
رنگ کیسا مری تصویر میں بہزاد بھرے
(ذوقؔ)

جس دم دوچار آکے ہوا وہ نظر فریب
لے کر قلم کو ہاتھ میں بہزاد رہ گیا
(قائمؔ)

● بہشتِ شداد: تفصیل 'شداد' کے تحت دیکھیں۔

● بیژن و منیژہ:

بیژن، قدیم ایران کا ایک مشہور اور بہادر پہلوان تھا۔ یہ گیو کا بیٹا اور رستم کا بھانجا تھا۔ قدیم زمانے میں ایران و توران کے بادشاہوں میں ہمیشہ جنگ آزمائی رہا کرتی تھی۔ افراسیاب، توران کا حکمران تھا اور اس کی بیٹی منیژہ پر ایرانی پہلوان بیژن عاشق ہو گیا۔ منیژہ کے دل میں بھی بیژن کے عشق کی شمع روشن تھی۔ جب افراسیاب کو یہ علم ہوا کہ اس کی بیٹی، دشمن ملک کے ایک پہلوان پر عاشق ہے اور اس سے راہ ورسم رکھتی ہے، اس نے بیژن کو گرفتار کر ایک تاریک اور اندھے کنویں میں قید کر دیا اور کنویں کے منہ پر ایک بھاری پتھر ڈلوا دیا۔ یہ وہی پتھر تھا، جو دیوا کوان نے رستم پر پھینکا تھا۔ بیژن اسی تنگ و تاریک کنویں میں زندگی کے دن گزارتا رہا۔

ادھر افراسیاب نے اپنی بیٹی منیژہ کو بھی گھر بدر کر دیا۔ وہ صبح سے شام بھیک مانگتی اور رات کو کنویں پر پہنچ کر بیژن کو روٹیاں کھلا آتی۔ عشق و وفاداری کی یہ انتہا تھی۔ جب یہ بات رستم کے کانوں تک پہنچی، اس نے بیژن کو آزاد کرانے کا بیڑا اٹھایا اور لاؤ لشکر سمیت توران پہنچ کر اسے افراسیاب کی قید سے رہائی دلائی۔ وہ بیژن و منیژہ کو اپنے ساتھ ایران لے آیا جہاں دونوں یک جان دو قالب بن کر زندگی گزارنے لگے۔

جس تاریک کنویں میں بیژن کو قید کیا گیا تھا۔ وہ چاہِ بیژن کی تلمیح کے طور

پر استعمال میں ہے اور بیژن و منیژہ کی تلمیح ایک جاں باز عاشق اور باوفا معشوق کی حیثیت سے مسلم ہے۔

آنکھ بھر دیکھے اسے گیو تو تیور جل جائیں
چاہ میں کانپ اٹھے اس کی چمک سے بیژن
(انشا)

● پرِ جبرئیل: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔

● پسرِ نوح:

حضرت نوحؑ کے چار بیٹے تھے۔ سام، حام، یافث، یام۔ پہلے تینوں بیٹے ایمان لانے والوں میں شامل تھے اور طوفان کی آمد کے وقت کشتی میں سوار تھے لیکن ان کا چوتھا بیٹا یام کافر اور سرکش تھا۔ یام کا لقب کنعان تھا۔ بار بار سمجھانے بجھانے پر بھی کنعان راہِ راست پر نہیں آیا۔ اس کا حشر بھی قومِ نوحؑ کے باقی افراد کی طرح ہوا۔ طوفان نے جب شدت اختیار کر لی اور کنعان اس کی زد میں آ گیا تو شفقتِ پدری کے جذبے سے مغلوب ہو کر حضرت نوحؑ نے کنعان کی نجات کے لیے دعا مانگی مگر خدائے تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ آئی حضرت نوحؑ نے بھی فوراً عذر خواہی کر لی اور پھر کنعان سے مخاطب ہوئے کہ مومن بن کر نجاتِ الٰہی سے بہرور ہو جاؤ مگر کنعان کا تمرد اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اس نے جواب دیا۔ ''میں عنقریب کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں وہ مجھے غرقابی سے بچا لے گا''۔ نوح نے کہا! آج اللہ کے امر سے بچانے والا کوئی نہیں صرف وہی بچیں گے جن پر اللہ کا رحم ہوگا۔ اسی وقت ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔ پیغمبر زادگی بھی کنعان کی حفاظت نہ کر سکی۔ اس کے تمرد، اس کی سرکشی اور اس کی گمرہی نے اسے بھی کافروں کے ساتھ طوفان کی نذر کر دیا۔

ہم وہ رند ہیں کہ رندی کا نہ لے نام امیرؔ
آ کے دو دن پسرِ نوحؑ اگر ہم میں رہے
(امیر مینائی)

● پشۂ نمرود: تفصیل ''نمرود' کے تحت دیکھیں۔

● پیرزن: تفصیل ''شیریں فرہاد' کے تحت دیکھیں۔

● پیرِ کنعاں: تفصیل '' چاہِ کنعاں' کے تحت دیکھیں۔

● پیرہنِ یوسف:

جب بھائیوں نے یوسف کو کنویں میں ڈال دیا تو ان کی قمیص ایک جانور کے خون سے آلودہ کرلی۔ خون آلودہ قمیص لے کر یعقوبؑ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر چہ ہم اپنی صداقت کا کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائیں مگر آپ کو یقین نہ آئے گا۔ ہم نے یوسف کو اپنے سامان کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑ دیا اور خود دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مشغول ہو گئے کہ اچانک بھیڑیا آ گیا اور اس نے یوسف کا کام تمام کر دیا۔

یعقوبؑ ،حقیقتِ حال کی تہ تک فوراً پہنچ گئے کیوں کہ پیرہنِ یوسف خون آلود تو تھا مگر تھا صحیح سلامت۔ کسی جگہ سے بھی پھٹا ہوا نہیں تھا۔ حضرت یعقوبؑ سمجھ گئے کہ ان لوگوں نے یوسف کے ساتھ مکر کیا ہے مگر انھیں جھڑکنے اور طعن و تشنیع کرنے کے بجائے صبر کرنا زیادہ مناسب خیال کیا۔

جہاں میں قصۂ یوسف ہے آئینہ کہ پسر
پدر کا درد نہ مہر برادری جانے
(سوداؔ)

قصۂ یوسف دکھو بے رحمی یاراں دکھو
پیرہن باس دکھو، دیدۂ یعقوب دکھو
(قلی)

پیرہن یوسف کا ذکر تین جگہوں پر کیا گیا ہے۔ ایک تو یہی جگہ جس کا ذکر اوپر ہوا جب بھائیوں نے یوسف کی خون آلودہ قمیص باپ کے سامنے پیش کیا اور یوسف کی ہلاکت کی خبر سنائی، جس کے غم میں یعقوبؑ کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔

کیا سوجھے اسے جس کے ہو یوسف ہی نظر میں
یعقوب بجا آنکھوں سے معذور ہوا ہے
(میر)

دوسرا موقع تب آیا تھا جب زلیخا کے دامِ فریب سے نکل بھاگنے کے لیے یوسف دروازے کی طرف دوڑے تھے اور زلیخا ان کے تعاقب میں دوڑی آ رہی تھی۔ اس چھین جھپٹ میں یوسف کا کرتا پیچھے سے پھٹ گیا تھا اور یہی کرتا بالآخر ان کی پاکیزگی اور عصمت کا گواہ بنا۔ تیسرا موقع وہ تھا جب برادران یوسف مصر سے ان کا کرتا لے کر چلے کہ یعقوبؑ کی آنکھوں پر پھیرنے سے ان کی بینائی واپس آ جائے گی۔ چنانچہ بھائیوں نے جیسے ہی کرتے کو ان کی آنکھوں سے مس کیا یعقوب کی آنکھیں دوبارہ روشن ہو گئیں۔ تقدیر اور حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ پہلی بار جب بھائیوں نے خون آلود پیرہن، یعقوب کو دیا تو باپ کی بینائی جاتی رہی اور دوبارہ جب انھیں بھائیوں نے یوسف کا پیرہن ان کی آنکھوں سے لگایا تو کھوئی ہوئی بینائی واپس آ گئی۔

قالبِ بے جاں میں جاگ اٹھا شرارِ زندگی
دیکھیے بوے قمیص ماہِ کنعاں دیکھیے
(اصغر)

ہر ایک مشام میں عالم ہے یوسفستاں کا
پرکھنے والے تو کچھ بوے پیرہن کے ملے
(فراق)

● تابوتِ سکینہ:

تابوتِ سکینہ کے معنی ہیں 'طمانیت اور سکون کا تابوت'۔ بنو اسرائیل کے پاس ایک تابوت تھا جس میں عصاے موسیٰ، ہارون کا پیرہن، منّ کا مرتبان، توراۃ کا اصل نسخہ اور دوسرے تبرکات محفوظ تھے۔ یہ تابوت ان لوگوں نے خدا کے حکم سے بنایا تھا۔ بنو اسرائیل جب بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے، وہ اس تابوت سے رجوع کرتے اور ان کے دلوں

میں اطمینان وسکون پیدا ہو جاتا۔ جب لڑائیوں میں شرکت کرتے تو اس تابوت کو لشکر کے آگے آگے رکھتے۔ خدا ان کے دلوں میں طمانیت پیدا کر دیتا اور یہ فتح وکامرانی سے دوچار ہوتے۔

توراۃ میں ہے کہ فلسطینیوں نے حملہ کر کے تابوتِ سکینہ چھین لیا تھا اور اسے فلسطین لے جا کر اپنے سب سے بڑے مندر بیتِ دجون میں رکھ دیا تھا۔ کچھ ایسا ہوا کہ ان کا بت روزانہ اوندھے منہ گرا رہتا اور شہر مختلف بیماریوں کا شکار ہو گیا۔ لاچار ہو کر ان لوگوں نے تابوتِ سکینہ کو منحوس سمجھ کر اپنے یہاں سے نکال دیا۔ یہ تابوت فرشتے اپنے کندھوں پر اٹھا لائے اور بنواسرائیل کے بادشاہ طالوت کے پاس پہنچا گئے۔ اس طرح بنواسرائیل کے درمیان تابوتِ سکینہ دوبارہ واپس آ گیا۔

جلا سکتے نہیں عیسیٰ بھی پیشِ مصحف اکبر
برنگِ مردہ تابوت سکینہ میں ہے عبرانی
(منیر)

● تجلیِ طور، صاعقۂ طور، برقِ طور:

کوہِ طور اور حضرت موسیٰ کے واقعات دو بار پیش آئے تھے۔ پہلی بار تو جب موسیٰ آگ کی تلاش میں وادیِ مقدس گئے تھے تو کوہ طور کی وادی میں شرفِ ہم کلامی سے سرفراز کیے گئے تھے اور نبوت سے نوازے گئے تھے۔ دوبارہ جب موسیٰ بنواسرائیل کو فرعون کی قہرمانی سے نجات دلا کر وادیِ سینا میں قیام پذیر تھے تو کوہِ طور پر شریعت لانے کے لیے گئے تھے، وہیں دیدار والا واقعہ پیش آیا۔

ان دونوں واقعات میں ذرا سا فرق ہے۔ پہلے والے واقعے میں وادیِ ایمن، شجرِ ایمن، آگ، وادیِ مقدس اور شعلۂ سینا وغیرہ تلمیحوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جب کہ دیدار والے واقعے میں برقِ طور، ارنی، لن ترانی، خر موسیٰ اور تجلیِ طور وغیرہ تلمیحات زیرِ بحث آتی ہیں۔

فرعون اور اس کے لشکر کی غرقابی کے بعد، بنواسرائیل کی ہدایت اور رہنمائی کے

لیے شریعت عطا کرنے کی غرض سے موسیٰ کو کوہِ طور پر بلایا گیا۔ ابتداً انھیں تیس راتوں کے لیے بلایا گیا تھا جس میں دس راتوں کا مزید اضافہ کر کے چالیس کر دیا گیا اور اس طرح جب چلہ پورا ہو گیا تو خدائے عز و جل نے ان سے براہِ راست باتیں کیں۔ حضرت موسیٰ کے دل میں اللہ کے دیدار کا بھی شوق پیدا ہوا اور انھوں نے اپنے اس شوق کا اظہار 'ربّ ارنی انظر الیک' (اے میرے پروردگار! اپنا دیدار مجھ کو کرا دیجیے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں) کہہ کر کیا۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے 'لن ترانی' (تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے) کہا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
(غالبؔ)

لیکن پھر مزید آگے فرمایا 'ہم اپنی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے'۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر اپنی تجلی کا ظہور کیا۔ وہ پہاڑ رب کی تجلی کو برداشت نہ کر سکا۔ تجلی نے اس کے پرخچے اڑا دیے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
(غالبؔ)

اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ موسیٰ جب دوبارہ ہوش میں آئے تو رب واحد کی عظمت و جلالت کا اعتراف کیا اور اپنی عاجزی و درماندگی کے قائل ہو گئے کہ میں دنیا میں تیرے دیدار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس مختصر سے واقعے میں بھی تلمیحات کے کئی زاویے اور پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر موسیٰ کے دل میں دیدارِ الٰہی کا شوق پیدا ہوا۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا
(سوداؔ)

انھوں نے 'ربّ ارنی' کہہ کر اظہار شوق کر دیا۔ وہ رب کے دیدار کے طالب ہوئے۔

یار کے دیدار کا طالب ہے موسیٰ ہر زماں
اے ولی! دربار اس کا اس کوں کوہ طور ہے
(ولیؔ)

طور تو ہے رب ارنی کہنے والا چاہیے
لن ترانی ہے مگر نا آشنائے گوش ہے
(فانیؔ)

آتش بلندول کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا
(میرؔ)

خدائے تعالیٰ نے 'لن ترانی' کہہ کر دیدار کے عدم امکانات کی بات کہی۔

دیکھ سکتا جو تجلی رخ جاناں کو
'لن ترانی کا سزا وار نہ موسیٰ ہوتا
(ذوقؔ)

پھر خدا نے کوہِ طور پر تجلی کا ظہور کیا۔

اب کے ادائے خاص سے کر امتحان دل
جو برق طور پر نہ گری ہو گرا کے دیکھ
(فانیؔ)

تجلی برداشت نہ کر پانے کی وجہ سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

کیا مزاج اس کے بتاؤں کہ عجب آتش ہے
شعلۂ طور بھی شاید کہ شرر اس کا ہے
(سوداؔ)

کیا کم تھا شعلہ شوق کا شعلے سے طور کے
پتھر بھی واں کے جل گئے جا کر جہاں گرا
(میرؔ)

طور پر لہرا کے جس نے پھونک ڈالا طور کو
اک شرارِ شوق بن کر میرے آب وگل میں ہے
(اصغر)

اور بالآخر موسیٰ بھی بے ہوش ہوکر گر پڑے۔

بس اک جھلک نظر آئی اڑے کلیم کے ہوش
بس اک نگاہ ہوتی خاک طورِ سینا تھا
(فراق)

وہی برقِ تجلی کارفرما اب بھی ہے لیکن
نگاہوں کو میسر ہی نہیں بے ہوش ہو جانا
(فانی)

دل ہی نگاہ ناز کا ایک اداشناس تھا
جلوۂ برقِ طور نے طور کو کیوں جلا دیا
(فانی)

● **تختِ بلقیس**: تفصیل 'بلقیس وسلیمان' کے تحت دیکھیں۔

● **تخت جم، تختِ جمشید**:

جمشید کے سر جہاں اور بہت سی چیزوں کی ایجاد کا سہرا باندھا جاتا ہے وہیں اس کا تخت بھی اپنی بے مثال کاری گری، صناعی اور اعلیٰ فن کاری کا نمونہ تھا۔ سب سے پہلے جمشید کے زمانے میں ہی موتیوں کی تلاش کی گئی تھی۔ اس تخت میں بیش قیمتی جواہرات اور موتیاں جڑے ہوئے تھے۔ تخت کی اور خوبیوں کے علاوہ اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ تختِ سلیمان کی طرح یہ بھی ہوا کے دوش پر سوار چلا جاتا تھا۔ شاہنامہ کہتا ہے کہ دیو اور جن اس تخت کو اپنے کاندھوں پر لیے چلتے تھے۔ چونکہ تختِ سلیمان اور تختِ جمشید میں ہوا کے دوش پر سوار چلے جانے کی خوبی مشترک تھی اسی لیے کہیں کہیں تختِ سلیمان اور تختِ جمشید کے معنی ومفہوم میں خلط واقع ہوگیا ہے۔ جمشید کے تخت کی تلمیح اورنگِ جم، تختِ جم، کرسیِ جم،

مرکبِ جم اور مسندِ جم کے ناموں کے ساتھ بھی استعمال کی جاتی رہی ہے۔ جمشید کا یہ تخت جاہ وجلال، شان وشوکت اور شاہانہ کروفر کا استعارہ ہے۔

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے
(اقبالؔ)

● تختِ سلیماں، اورنگِ سلیماں:

خدائے تعالیٰ نے حضرت سلیمان کے لیے ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا۔ ہوائیں ان کی جنبشِ لب کی منتظر اور تابعِ فرمان رہتیں۔ ان کی نرم روی اور سبک رفتاری کا یہ عالم تھا کہ تیز وتند ہونے کے باوجود بھی وہ سلیمان کے حق میں سلامتی اور راحت وآرام کا سبب بنتی تھیں۔ چنانچہ سلیمان جب چاہتے تو صبح کو ایک مہینے کی مسافت اور شام کو ایک مہینے کی مسافت طے کر لیتے تھے۔

حضرت سلیمان کو اللہ نے نبوت کے ساتھ ساتھ حکومت وسربراہی کی نعمت سے بھی سرفراز کیا تھا۔ حکومت وسلطنت اور تاج وتخت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حضرت سلیمان بھی تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوتے تھے ان کے اسی تخت میں خدا نے ایسی خصوصیات جمع کر دی تھیں کہ وہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ حضرت سلیمان اپنے مخصوص تخت پر سوار ہو کر ہوا کے دوش پر اڑے چلے جاتے تھے۔ بظاہر اس تخت کی پرواز کا کوئی سامان نہ تھا وہ محض حکمِ الٰہی کے تابع تھا اور خدائے تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں کا ایک ادنیٰ سا مظہر؛ کہ وہ اپنے اعیانِ سلطنت سمیت تخت پر بیٹھ جاتے تھے اور جہاں چاہتے مہینوں کی مسافت، لمحوں اور ساعتوں میں طے کرتے ہوئے وہاں پہنچ جاتے۔ ہوا، آپ کے تخت کو اڑا کر لے جاتی۔

قرآنی آیات کی روشنی میں تختِ سلیمان کی خصوصیات بس اتنی تھیں کہ وہ ہوا کے دوش پر سروسامانِ ظاہری سے بے نیاز اڑا چلا جاتا تھا مگر اسرائیلی روایتوں میں تختِ سلیمان

کے تعلق سے مزید کچھ خصائص مختص کیے گئے ہیں۔امام بیضاوی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ قومِ جن نے تختِ سلیمان کو اس کاریگری سے بنایا تھا کہ تخت کے نیچے دوز بردست اور خونخوار شیر کھڑے تھے اور دو گدھ معلق تھے اور جب حضرت سلیمان تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہونے کے لیے تخت کے قریب تشریف لے جاتے تو دونوں شیر بازو پھیلا کر بیٹھ جاتے اور تخت نیچا ہو جاتا،سلیمان جب تخت پر بیٹھ جاتے تو شیر واپس اپنی حالت میں کھڑے ہو جاتے اور ہیبت ناک گدھ فوراً اپنے پروں کو پھیلا کر سرِ مبارک پر سایہ فگن ہو جاتے تھے۔

کنج میں تجھ زلف کے جن نے کیا ہے مقام
اس کا ٹٹا بوریا تختِ سلیمان ہوا
(ولیؔ)

سجن تیری غلامی میں کیا ہوں سلطنت حاصل
مجھے تیری گلی کی خاک ہے تختِ سلیمانی
(ولیؔ)

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا میرے آگے
(غالبؔ)

● تعبیرِ یوسفی:

حضرت یوسف معصوم اور بے گناہ تھے وہ وقت اور حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہوگئے۔عزیز مصر کی مصلحت اندیشی نے یوسف کو پس دیوارِ زنداں بھیج دیا۔قید خانے میں بھی یوسف کی معصومیت،فطری شرافت اور اخلاقی پاکیزگی رنگ لے آئی،قیدی ان کی بے حد تعظیم وتکریم کرتے۔یوسف کی محبت اور ہمدردی کا نقش ان کے دلوں میں جاگزیں ہوگیا تھا۔

''تورات میں ہے کہ یوسف کے علمی و عملی جوہر قید خانہ میں بھی نہ چھپ سکے اور داروغہ زنداں ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا اور جیل کا تمام انتظام و انصرام ان کے سپرد کر دیا۔''(11)

جہاں اللہ تعالیٰ نے یوسف کو حسن کی دولت بے پایاں سے نوازا تھا وہیں خوابوں کی تعبیر بتلانے کا بھی خصوصی ملکہ عطا کیا تھا اور آخر کار ان کا یہی امتیازی وصف قید خانہ سے ان کی نجات کا سبب بنا۔

کچھ ایسا ہوا تھا کہ فرعون مصر کے دو قیدی بھی اسی قید خانہ میں قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں ایک دربار شاہی کی ساقی گری کرتا تھا اور دوسرا بادشاہ کا خصوصی باورچی تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ دونوں بادشاہ کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث تھے اور بادشاہ کے کھانے میں زہرِ قاتل ملا دیا تھا۔ اسی جرم کی پاداش میں انھیں نظر بند کیا گیا تھا۔ معاملہ ابھی زیرِ غور تھا۔ اسی دوران ایک دن دونوں حضرت یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اپنے خواب بیان کر کے ان کی تعبیر جاننی چاہی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں، دوسرے نے کہا اور میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے سر پر روٹیوں کا دسترخوان ہے اور پرند اسے کھا رہے ہیں۔

یوسف آخر نبی تھے۔ دعوت و تبلیغِ دینِ حق ہی ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ انھوں نے پہلے اہلِ قید خانہ کو دینِ حق کا راستہ دکھایا۔ اور پھر خواب کی تعبیر فرمائی کہ جس شخص نے خواب میں خود کو انگور نچوڑتے ہوئے دیکھا ہے وہ قید خانہ سے آزاد کر دیا جائے گا اور دوبارہ بادشاہ کی ساقی گری کی خدمت انجام دے گا اور جس کے سر پر سے پرند روٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اس کو سولی دے دی جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ساقی زہر خورانی کی تہمت سے بری ہو گیا اور باورچی پر جرم ثابت ہو گیا اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔

دیکھا میں تجھے خواب میں اے مایۂ خوبی
اس خواب کو جا یوسفِ کنعاں سوں کہوں گا

(ولی)

یوسف نے ساقی سے یہ کہا تھا کہ جب تم رہا ہو کر بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا ذکر کرنا۔ آزاد ہونے کے بعد ساقی کچھ ایسا مصروف ہوا کہ بادشاہ سے ذکر کرنے کا خیال جاتا رہا۔ اور یوسف نے قید خانے میں کئی برس گزار دیے۔

انھی دنوں میں بادشاہِ وقت نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی۔ دبلی گایوں نے موٹی کو نگل لیا اور سات سرسبز اور ہری بالیاں ہیں اور سات خشک بالیاں۔ خشک بالیوں نے ہری بالیوں سے چمٹ کر انھیں بھی خشک بنا دیا۔ بادشاہ جب صبح خواب سے بیدار ہوا تو پریشان خاطر تھا۔ فوراً دربار کے مشیروں سے خواب کی تعبیر جاننی چاہی مگر مشیر تعبیر بتلانے سے قاصر رہے اور یہ کہہ کر بادشاہ کو مطمئن کرنا چاہا کہ یہ خوابِ پریشاں سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ بادشاہ اس جواب سے کچھ مطمئن نہ ہوا۔ اسی درمیان ساقی کو حضرت یوسف کی یاد آ گئی۔ اس نے بادشاہ سے اجازت طلب کی اور قید خانے میں یوسف کے پاس جا پہنچا۔ یوسف نے خواب سن کر اس کی تعبیر یہ بتلائی کہ لگاتار سات برس تک ہریالی اور خوشحالی کا دور رہے گا، غلہ اتنا زیادہ پیدا ہوگا کہ کھلیان بھر جائیں گے، اور پھر اگلے سات برس تک خشک سالی کا دور دورہ رہے گا۔ زمین سوکھ جائے گی اور ملک میں اناج کی قلت ہو جائے گی۔ یوسف نے مزید کہا کہ اس سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ شروع کے سات سالوں کی پیداوار کو ضرورت کے مطابق ہی ان کی بالیوں سے الگ کیا جائے اور باقی کا ذخیرہ بالیوں سمیت کر لیا جائے تاکہ غلہ زیادہ دنوں تک محفوظ اور صحیح سالم رہ سکے۔

ساقی واپس بادشاہ کے پاس پہنچا اور خواب کی پوری تعبیر بتلائی۔ اس دلنشیں تعبیر سے بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس کی دور بین نگاہوں نے اندازہ لگا لیا کہ ایک عرصے سے حوالۂ زنداں کیا گیا یہ شخص غیر معمولی علم و فضل اور اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل ہے اس نے یوسف کو قید خانے سے بلا بھیجا تاکہ خاص خاص کاموں پر ان کی تقرری کر سکے مگر یوسف نے قید خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور شرط رکھی کہ پہلے ان عورتوں کے معاملے کی

تحقیقات کرلی جائے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔

غرض بادشاہ نے معاملے کی از سرِ نو جانچ کرائی۔ اس نے عورتوں کو بلوا بھیجا۔ تمام عورتوں نے ایک زبان ہوکر یوسف کی عصمت اور پاکدامنی کی گواہی دی۔ زلیخا بھی ان عورتوں میں شامل تھی اب وہ عشق ومحبت کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکی تھی اور ذلت و رسوائی کی سرحدوں سے آگے نکل چکی تھی۔ اس نے اپنی پیش دستی کا اعتراف، اہلِ دربار کے سامنے کیا اور اس طرح یوسف کی پاکبازی اور عفت کا نقش لوگوں کے دلوں پر ثبت ہوگیا۔

بادشاہ نے نہ صرف یوسف کو قید سے رہائی بخشی بلکہ انھیں عزیزِ مصر کے مرتبے پر بھی فائز کر دیا۔ اس نے یوسف کو اپنی سلطنت کا امین و کفیل بنا دیا اور شاہی خزانے کی کنجیاں ان کے حوالے کر دیں۔ اس طرح کنویں میں قید کیا گیا وہ بچہ ایک غلام کی حیثیت سے مصر میں داخل ہوا اور زندگی کی مختلف پر پیچ راہوں سے گزر کر عزیزِ مصر کے مرتبے تک جا پہنچا۔

کنعان سے جا کے مصر میں یوسف ہوا عزیز
عزت کسو کی ہوتی نہیں ہے وطن کے بیچ
(میر)

● تیشۂ فرہاد: تفصیل 'شیریں فرہاد' کے تحت دیکھیں۔

● تیغِ حیدری: تفصیل 'علی' کے تحت دیکھیں۔

● جامِ جمشید، جامِ جہاں بیں، جامِ جہاں نما، جامِ گیتی نما، جامِ جم، جامِ خسرو:

جمشید نے اپنے زمانے کے سائنس دانوں کی مدد سے ایک ایسا پیالا تیار کرایا تھا جس میں وہ دنیا کے مختلف حصوں کا مشاہدہ کرتا تھا۔ جام جمشید کے بارے میں ایک دلچسپ بات مشہور ہے کہ اس جام کے نصف حصے میں زمین کے اوپر کے حالات کا مشاہدہ کیا جاسکتا تھا اور نصفِ دوم سے زمین کے اندر مدفون خزانوں کا علم حاصل ہوتا تھا۔ جمشید

کی دولت وامارت اور عظمت وشوکت کے پیچھے اس جام کا بڑا دخل تھا۔ جمشید کے بعد یہ جام کیخسرو کے ہاتھوں ہوتا ہوا دارا کے دربار کی زینت بنا۔ اسی وجہ سے اس جام کی نسبت کبھی جمشید کی جانب کی جاتی ہے اور کبھی کیخسرو کی جانب۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ دونوں جام الگ الگ تھے۔ جمشید کے جام میں اس طرح کی کوئی خاصیت نہیں تھی جس سے دنیا کے حالات کی جانکاری ہو سکتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ چونکہ شراب اسی زمانے میں ایجاد ہوئی تھی، اس لیے اسے پینے کے لیے ایک پرتکلف جام بھی تیار کیا گیا تھا اور یہ طرح طرح کی کاری گری اور صنعتوں سے مزین تھا، جب کہ کیخسرو کے پیالے میں خطوط، دائرے اور ہندسے بنے ہوئے تھے۔ ان خطوط اور ہندسوں کی مدد سے ستاروں کی گردش، مستقبل کے حالات اور روئے زمین پر رونما ہونے والے واقعات کا علم حاصل کیا جا سکتا تھا۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
(غالبؔ)

جو کچھ دیکھا تو چاہے دیکھ لے دو قرطے پی کر
بسانِ جامِ جم احوال جزو وکل ہے شیشے میں
(سوداؔ)

جمشید کے اس جام کو جامِ جم، جامِ جہاں نما، جامِ جہاں بیں، جامِ گیتی نما، ساغرِ جم اور جامِ خسرو کے نام سے بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جامِ خسرو دراصل جامِ کیخسرو کی سہل ترین صورت ہے ورنہ خسرو پرویز کے پاس اس طرح کے کسی جام کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ممتاز حسین جون پوری نے لکھا ہے:

"اگر یہ نام انگوٹھی، اسپ تخت وباد، آصف، ماہی، طیور وغیرہ کے سلسلے میں ہے تو حضرت سلیمان مراد ہے۔ اگر آئینہ، آبِ حیواں وغیرہ کے سلسلے میں ہے تو سکندر مراد ہے اور اگر جام وشراب، بزم وجشنِ نوروز وغیرہ کے سلسلہ میں ہے تو ایران کا بادشاہ مراد ہے۔"(12)

جمشید جس نے وضع کیا جام، کیا ہوا
وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھروے ناؤ و نوش
(میرؔ)

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ جم، خاتمِ جمشید نہیں
(غالبؔ)

● جبرئیل:

عبرانی زبان میں جبرئیل کے معنی 'مردِ خدا' کے ہوتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں جبرئیل خدا کے چار مقرب فرشتوں میں سے ایک ہیں۔ پیغمبروں اور رسولوں تک پیغامِ خدا اور وحیِ الٰہی پہنچانے کا کام انھی کے سپرد تھا۔ یہ قوی اعضا کے مالک اور زور آور ہیں۔ حضرت جبرئیل کو متعدد ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ روح الامین اور روح القدس تو بہت مشہور نام ہیں، کہیں کہیں ہاتف اور سروش سے بھی حضرت جبرئیل ہی مراد ہیں۔

پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں
(غالبؔ)

یہ جبرئیل ہی تھے جو حضرتِ مریم کے پاس آئے تھے اور ان کے گریبان میں پھونک ماری تھی۔ یہ پھونک ہی حضرت عیسیٰ کی ولادت کا سبب بنی تھی کیونکہ مریم کنواری اور پاک دامن تھیں۔ دمِ جبرئیل کی تلمیح یہیں سے پیدا ہوئی ہے اور اس سے مراد حقیقتاً دمِ الٰہی ہے۔

معراج کی مقدس رات میں جبرئیل پیغمبرِ اسلام کے ساتھ ساتھ تھے۔ آخر دونوں ایک ایسے مقام پر پہنچے کہ اس کے آگے جبرئیل کے پر جلتے تھے۔ جبرئیل وہیں رک گئے اور باقی راستہ پیغمبرِ اسلام نے تنِ تنہا طے کیا۔ وہ آخری مقام جہاں جبرئیل ٹھہر گئے تھے، سدرۃ المنتہیٰ کہلاتا ہے۔ جبرئیل کا قیام اسی درخت پر ہوتا ہے۔ اسی قریبی تعلق کی وجہ سے ان کے لیے بلبلِ

سدرہ، طائرِ سدرہ، مرغِ عرشی اور طائرِ سدرہ نشین کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

کریں نہ کیوں کہ یہ ترکاں بلند پروازی
انھوں کا طائرِ سدرہ نشیں شکار ہوا
(میرؔ)

''سدرۃ المنتہیٰ ایک بیری کا درخت ہے جو چھٹے یا ساتویں آسمان پر ہے اور یہ آخری حد ہے۔ اس سے اوپر کوئی فرشتہ نہیں جا سکتا، فرشتے اللہ کے احکام بھی یہیں سے وصول کرتے ہیں۔''(13)

دوسرے اور فرشتوں کی طرح جبرئیل بھی پردار ہیں۔ قرآن کی تفسیر کے مطابق ''نبیؐ نے جبرئیل کو اصل شکل میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پر ہیں۔ ایک پر مشرق و مغرب کے درمیان فاصلے جتنا تھا۔''(14)

اس کی رعایت سے پرِ جبرئیل، شہپرِ جبرئیل اور شہپرِ روح القدس کی تلمیح وجود میں آئی ہے۔ جبرئیل ایک گھوڑے پر سواری بھی کرتے ہیں اس کا نام حیزوم ہے۔

● جشنِ نوروز، جشنِ جمشیدی:

نوروز کا تہوار ایران کا قومی اور موسمِ بہار کی آمد کا تہوار ہے۔ فارسی سال کے پہلے مہینے فروردین کی پہلی تاریخ کو یہ تہوار پورے ایران میں انتہائی جوش و خروش اور مسرت و انبساط کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اس دن آفتاب برج حمل کے نقطۂ اول پر آتا ہے۔ پہلے چھ دنوں تک اس کا اہتمام کیا جاتا تھا اب یہ تہوار تیرہ دنوں تک منایا جاتا ہے۔ بازار اور دوکانیں سجائی جاتی ہیں، چراغاں ہوتا ہے، رنگ و نور کی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں اور نشۂ رقص و سرود میں پورا ملک ڈوبا رہتا ہے۔ ''عیسوی کیلنڈر کے مطابق یہ تہوار 22/ مارچ کو منایا جاتا ہے۔''(15)

فکر میں ہجر کی وصل کا دن کھوتا ہے
یاں محرم ہی میں نوروز سدا ہوتا ہے
(سوداؔ)

اس تہوار کی ابتدا جمشید کے زمانے سے ہوئی ہے۔ جمشید اسی دن سریر آرائے سلطنت ہوا تھا۔ جب سے آج تک ہر سال ایران میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ جمشید کے بعد ایرانی بادشاہوں نے اس روایت کو زندہ رکھا۔ خاص طور سے ساسانی حکمران اس دن اپنا دربار منعقد کرتے تھے، امراو اراکینِ سلطنت بادشاہ کے حضور تحفے نذر کرتے اور بادشاہ انھیں انعام واکرام سے نوازتے تھے۔ صوبوں کے نئے گورنروں کا تقرر کیا جاتا، نئے نئے سکے ڈھالے جاتے اور آتش کدوں کی صفائی کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ جشن جمشیدی اسی نوروز کا دوسرا نام ہے۔

فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ جس کے روبرو
جشنِ جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا
(ذوق)

فردوسی اپنے شاہنامے میں لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ جمشید سیر وتفریح کی غرض سے نکلا تھا۔ وہ آذربائیجان کے گردونواح میں تھا کہ اسی دوران وہ دن بھی آگیا جو آفتاب کے برج حمل میں آنے کا دن تھا۔ جمشید نے اپنا تخت ایک اونچی جگہ پر ایستادہ کرادیا اور مشرق کی طرف منہ کرکے بیٹھ گیا۔ جب مشرق کے دریچے سے خورشید نے جھانکا تو اس کی پہلی شعاعیں تخت پر پڑیں، تاج وتخت میں جڑے ہوئے سارے ہیرے جواہرات یکا یک جگمگا اٹھے۔ یہ کیفیت دیکھ کر لوگ انتہائی مسرور اور شادماں ہوگئے اور اس دن کا نام نوروز رکھ لیا۔

جمشید کا نام بھی اس واقعے کی یاد دلاتا ہے۔ پہلوی زبان میں 'شید' کے معنی شعاع اور کرن کے ہیں۔ بادشاہ کا نام پہلے صرف جم تھا، اس میں شید کا اضافہ کرکے جمشید بنالیا گیا اور اس طرح اس یادگار لمحے کو جمشید کے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا گیا۔ اسی مناسبت اور تعلق کی وجہ سے جشنِ نوروز کو 'جشن جمشید' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آبجو قطع لگی کرنے روش پر مخمل
(سودا)

● جمشید:

حضرت عیسیٰ سے تقریباً آٹھ سو سال پیشتر، پیش دادی خاندان کا چوتھا تاجدار، قدیم ایران کا بادشاہ اور طہمورث کا بیٹا تھا۔ اس بادشاہ نے سات سو برس تک بادشاہی کی تھی۔ اس کا عہد قدیم ایران کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے۔ متعدد چیزوں کی ایجاد واختراع کا سہرا جمشید کے سر ہی باندھا جاتا ہے۔ تہذیب وتمدن کے سوتے یہیں سے پھوٹے تھے۔ لباس دوزی، کشتی رانی اور طبابت کی شروعات اسی عہد میں ہوئی، لوہے کو نرم کر کے آلاتِ حرب وضرب بنائے گئے، عطر کا اختراع کیا گیا، عمارتیں اور حمام بنوائے گئے۔ اس کے علاوہ بھی کئی چیزوں کی ایجاد بھی اسی بادشاہ سے منسوب ہیں مثلاً جشن نوروز کی ابتدا بھی جمشید کے عہد میں ہوئی۔ شراب کی ایجاد ہوئی اور اسے پینے کے لیے ایک پر تکلف جام بھی بنوایا گیا۔ اس کا تخت بھی عجائباتِ روزگار کا ایک نادر نمونہ تھا۔

اپنے آخری زمانے میں جمشید خود بینی اور غرور کا شکار ہوگیا۔ اس نے خدائی کا دعویٰ بھی کیا جس کی وجہ سے عوام اس سے منحرف اور برگشتہ ہوگئے۔ آخر کار ضحاک نے اسے مغلوب کر لیا اور آرے سے اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی میری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

(اقبالؔ)

● جوئے شیر: تفصیل 'شیریں فرہاد' کے تحت دیکھیں۔

● چاہِ اصفہاں: تفصیل 'دجال' کے تحت دیکھیں۔

● چاہِ بابل:

ہاروت ماروت، چاہ بابل اور زہرہ کی تلمیحات کی اساس درحقیقت ایک ہی واقعے پر رکھی گئی ہے۔ اس واقعے کا ذکر قرآن شریف میں بہت تفصیل سے نہیں کیا گیا ہے۔

> ''اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی تفصیل کے نہایت اختصار کے ساتھ یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ بابل میں ہاروت ماروت دو فرشتوں پر جادو کا علم نازل فرمایا گیا تھا تا کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ انبیا علیہ السلام کے ہاتھوں ظاہر شدہ معجزے جادو سے مختلف چیز ہیں اور جادو یہ ہے جس کا علم خدا کی طرف سے ہمیں عطا کیا گیا ہے، اسی مغالطے سے لوگوں کو بچانے کے لیے اور بطور امتحان فرشتوں کو نازل فرمایا گیا۔''(16)

تلمیحات کے طور پر ہاروت ماروت، چاہِ بابل اور زہرہ جس تفصیل اور واقعے کو پیش کرتے ہیں ان کا ماخذ درحقیقت قرآن نہیں بلکہ اسرائیلی روایات ہیں اور یہ اسرائیلی روایتیں، ان یہودی عالموں کے ذریعہ، جنھوں نے دین اسلام کو قبول کرلیا تھا، مسلمانوں میں رواج پذیر ہوگئیں۔ اس واقعے کی اسرائیلی تفصیل یہ ہے کہ ہاروت و ماروت دو فرشتوں نے ایک مرتبہ خدائے عزوجل کے حضور، انسانی معصیتوں اور نافرمانیوں کا مذاق اڑایا تھا کہ یہ کیسی ذلیل مخلوق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے انعام واکرام کے باوجود برائیوں میں ملوث رہتی ہے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ یہ طنز خدائے تعالیٰ کو پسند نہ آیا، فرشتوں سے کہا کہ اگر تم لوگ بھی دنیا میں ہوتے تو یہی کرتے، فرشتوں نے جب اپنی عصمت و پاکدامنی پر اعتماد ظاہر کیا تو بطور آزمائش انھیں زمین پر اتار دیا گیا۔ دنیا میں رہتے رہتے ان کی نگاہ ایک بے حد خوبصورت اور حسین عورت پر پڑی، زہرہ اس کا نام تھا۔ یہ دونوں اس کے عشق کے دامِ فریب میں گرفتار ہوگئے اور اس عورت سے اس کی قربت کے تمنائی ہوئے۔ عورت نے مطالبہ کیا کہ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب

تم لوگ میرے حکم کی تعمیل میں شراب پیو گے، قتل کرو گے اور بتوں کو سجدہ کرو گے۔ زہرہ کے عشق میں ان دونوں نے ان تینوں گناہوں کا ارتکاب کیا۔ مقاربت اور نزدیکی کی حالت میں زہرہ نے ان سے آسمان پر جانے کا گر سیکھ لیا کہ وہ فرشتے کس طرح سے آسمان پر جاتے ہیں، فرشتوں نے اسے اسم اعظم سکھلا دیا، زہرہ ان سے اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر چلی گئی اور یہ دونوں فرشتے غضبِ الٰہی میں مبتلا ہو گئے اور بابل کے ایک تنگ و تاریک اور تیرہ و تار کنویں میں قید کر دیے گئے۔ اب جو شخص ان سے جادو سیکھنا چاہتا ہے وہ اول اسے منع کرتے ہیں مگر ان کے اصرار پر جادو سکھا دیتے ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرشتے قیامت تک خدا کے عذاب کی وجہ سے اسی طرح کنویں میں الٹے لٹکتے رہیں گے۔

کیا بشر مانند یوسف کیا ملک ہاروت وار
عشق کے ہاتھوں سے ہو جاتا اسیر چاہ ہے
(ذوقؔ)

غرضیکہ واقعے کی تمام تفصیلات، اسرائیلیات کی دین ہیں۔ لیکن تلمیح کے نقطۂ نظر سے شاعروں نے اس خاص واقعے میں کئی تلمیحی پہلوؤں کو اپنی شاعری میں برتا ہے۔ چنانچہ فرشتے جن کی معصومیت و پاکیزگی اور اطاعت و فرماں برداری ضرب المثل ہے ان سے بھی گناہوں اور معصیتوں کا ارتکاب ہوا، زہرہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک حسین طوائف تھی اسم اعظم کی مدد سے آسمان پر جا پہنچی اور ایک ستارہ بن گئی۔ بابل کا وہ کنواں جس میں یہ فرشتے معلق اور مقید ہیں، معصیت اور جادو سیکھنے سکھانے کا مرکز و منبع ہے، بے حد تیرہ و تاریک، دھوئیں سے اٹا ہوا اور انتہائی گہرا، جس کی گہرائی سے بعض شاعروں نے چاہِ ذقن کی گہرائی سے مشابہت پیدا کی ہے اور چاہِ بابل کی تیرگی سے زلفِ محبوب کی سیاہی کو تشبیہ دی ہے۔

چاہِ بابل وہ ذقن اور دھواں زلف کا عکس
دل گرفتار عذاب اس میں ہو ہاروت صفت
(ذوقؔ)

حبذا ساقی، فرخ رخ و خورشید مثال
مرحبا مطرب ہاروت فن و زہرہ خصال

(ذوق)

● چاہِ رستم:

جس رستم کو توران کے بڑے بڑے سورما زیر نہیں کر سکے تھے آخر کار وہ اپنے بھائی کی حیلہ تراشی اور ریشہ دوانی کا شکار ہو گیا۔ رستم کے بھائی کا نام شغاد تھا۔ شغاد ایک کنیز کا بیٹا تھا اور اس طرح وہ رستم کا سوتیلا بھائی تھا۔ اس کی پرورش شاہِ کابل کے دربار میں ہوئی تھی۔ شاہِ کابل نے بعد میں اپنی بیٹی بھی اس کے عقد میں دے دی۔ کابل کا بادشاہ رستم کا باج گزار تھا۔ شغاد کو یہ بات گوارا نہ تھی۔ اس نے رستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے راستے سے ہٹانے کا ارادہ کرلیا۔ ایک بار رستم شکارگاہ میں تھا۔ شغاد نے رستم کے راستے میں گڑھے کھدوا دیے، رستم اور اس کا گھوڑا ان گڈھوں میں گر پڑے۔ گڑھے کے اندر زہر آلود نیزے اور برچھیاں چھپا کر رکھی گئی تھیں۔ ان ہتھیاروں سے رستم و رخش اس قدر زخمی ہو گئے کہ جانبر نہ ہو سکے اور اسی کنویں میں اپنی جان جانِ آفریں کے حوالے کر دیں۔ رستم کی بہادری اور طاقت کا یہ عالم تھا کہ اس نے مرتے مرتے اور انتہائی زخمی حالت میں بھی اپنے سوتیلے بھائی شغاد پر تیر چلا دیا، تیر اس کے سینے کو چیرتا ہوا باہر نکل گیا اور یہی تیر شغاد کی موت کا سبب بنا۔

دلیرانِ محبت کو خلش ہے اس کی مژگاں کی
ہوا کنج لحد بھی پرسناں، جوں چاہ رستم کا

(ذوق)

● چاہِ زمزم:

جب ابراہیمؑ صحیح وسالم آگ کے شعلوں سے باہر نکل آئے تو انھوں نے خدائے واحد کے دین کی تبلیغ واشاعت کے لیے ہجرت کا ارادہ کیا۔ ساتھ میں بیوی سارہ اور برادرزادہ لوط تھے۔ وطن عزیز سے نکل کر فلسطین ہوتے ہوئے مصر جا پہنچے۔ یہاں بادشاہِ مصر نے حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کو چھیننے اور کارِ بد کا ارادہ کیا مگر اللہ نے اسے آگاہ کر دیا کہ یہ ہمارے پیغمبر، خلیل اللہ کی بیوی ہے۔ فرعون، خدائی تہدید سے خائف ہو گیا اور اپنی بیٹی ہاجرہ کو سارہ کی معیت میں کر دیا۔ یہی ہاجرہ بعد میں حضرت ابراہیمؑ کی بیوی بنیں۔ ان سے مشہور پیغمبر حضرت اسماعیل تولد ہوئے۔

حضرتِ ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل کی پیدائش حضرتِ سارہ پر بے حد شاق گذری۔ فطرت انسانی سے مغلوب سارہ رشک وملال سے متاثر، ابراہیم سے کہنے لگیں 'ہاجرہ کو یہاں سے لے جاؤ' ابراہیم عجیب کشمکش میں مبتلا تھے کہ بڑھاپے کے سہارے کو کس طرح اپنی آنکھوں سے دور رکھوں کہ خدائے تعالیٰ کا فرمان آیا کہ ان دونوں کو وادیِ غیر ذی زرع (بن کھیتی کی زمین) میں چھوڑ آؤ۔ تسلیم و رضا کے پیکر حضرت ابراہیمؑ بیوی بچے کو ساتھ لے کر چلے اور وادیِ غیر ذی زرع میں پہنچ کر بیوی بچے کو خدا کے آسرے پر چھوڑ کر واپس چلے آئے۔ حضرت ہاجرہ نے ابراہیمؑ سے سوال کیا کہ کیا یہ خدا کے حکم سے کر رہے ہو؟ حضرت ابراہیمؑ کا جواب 'ہاں' میں پاکر وہ بھی مطمئن ہو گئیں۔ ابراہیم واپس کنعان چلے آئے۔

ادھر حضرت ہاجرہ تنہا رہ گئیں اور ان کی گود میں ایک معصوم بچہ اسماعیل۔ جب تک زادِراہ مہیا تھا باطمینان گذر بسر ہوتی رہی رفتہ رفتہ کھجوریں ختم ہو گئیں اور پانی کا مشکیزہ خالی ہو گیا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے بچہ بلکنے لگا تو حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں نکلیں۔ سامنے دو پہاڑیاں تھیں صفا اور مروہ۔ اسماعیل کو انھوں نے ایک پتھر کے سایے

میں لٹادیا اور صفا اور مروہ پر پانی کی تلاش میں چل پڑیں۔ کچھ دور ایک طرف کو جاتیں پھر واپس چلی آتیں پھر جب بچے کا بلکنا اور رونا ناقابلِ برداشت ہوجاتا تو دوسری جانب چل پڑتیں مگر بچے کی تنہائی کا خیال آتے ہی فوراً واپس لوٹ آتی تھیں۔ سات سات بار صفا و مروہ کا چکر لگانے کے بعد بھی پانی نہ ملا۔ آخری بار جب مروہ پر پہنچیں، ندائے غیبی ان کے کانوں میں پڑی۔ ناگاہ انھوں نے دیکھا کہ خدا کا فرشتہ جبرئیل ہے۔ جبرئیل نے زمین پر اپنا پیر مارا اور پانی کا ابلتا ہوا چشمہ جاری ہوگیا۔ حضرت ہاجرہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا زم زم (ٹھہر جا، ٹھہر جا) اسی دن سے اس چشمے کا نام زمزم پڑ گیا۔ حضرت ہاجرہ نے پانی کے چاروں طرف مینڈ بنانی شروع کر دی تا کہ پانی ضائع نہ ہو جائے۔ حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ امِ اسماعیل پر رحم کرے، اگر وہ زمزم کو اس طرح نہ روکتیں تو آج وہ زبردست چشمہ ہوتا''۔

جو تل تجھ مکھ کے کعبہ میں مجھے حجر اسود دستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہِ زمزم کا اثر دستا
(ولی)

دانے پانی کی تلاش میں حیران و سرگرداں خانہ بدوش بنی جرہم کا قبیلہ اتفاق سے ادھر آنکلا۔ حضرت ہاجرہ کی مرضی پا کر بنی جرہم اسی علاقے میں آباد ہو گئے۔ اسماعیل رفتہ رفتہ جوانی کی منزل میں داخل ہو گئے اسی قبیلے میں ان کی شادی ہوئی اور نسلِ اسماعیلی پھلنے پھولنے لگی۔

● چاہِ سیام: تفصیل 'ماہِ نخشب' کے تحت دیکھیں۔

● چاہ کنعان، چاہ یوسف:

کنعان، نواح شام کا ایک چھوٹا سا علاقہ تھا اب یہ علاقہ فلسطین میں ہے۔

''کنعان سے مقصود وہ علاقہ ہے جو بحر میت کی مغربی جانب واقع ہے اور دریائے اردن سے سیراب ہوتا ہے۔''(17)

ابراہیم کا خاندان اسی علاقے میں آباد تھا، یہ علاقہ تہذیب وتمدن کی برکتوں سے کوسوں دور تھا۔ شکار اور گلہ بانی پر ان کے رزق کا دارو مدار تھا۔ یوسف کا آبائی وطن بھی کنعان تھا۔ اسی علاقے کی رعایت سے حضرت یعقوبؑ کو پیر کنعاں اور حضرت یوسف کو ماہ کنعاں اور حسن کنعاں بھی کہا جاتا ہے۔

دیکھیے اترا پیرہن اپنا
ماہ کنعاں کرے کفن اپنا
(ناسخ)

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوے پیرہن کی آزمائش ہے
(غالب)

ایک دھوکا ہے لحن داوٗدی
اک تماشا ہے حسن کنعانی
(حالی)

ہنسی آتی ہے مجھ کو جب ترے آگے
کوئی ماہ کنعاں کو کہتا حسیں ہے
(ذوق)

اسی علاقے کے ایک تنگ وتاریک، خشک اور غیر آباد کنویں میں برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف کو ڈال دیا تھا۔

تجھ زنخداں کے چاہِ کنعاں میں
یوسفِ مصر، دم بہ دم دستا
(ولی)

- چاہِ مقنع، چاہِ نخشب: تفصیل 'ماہِ نخشب' کے تحت دیکھیں۔
- چاہِ یوسف: تفصیل 'چاہِ کنعاں' کے تحت دیکھیں۔
- چاہِ بیژن: تفصیل 'بیژن ومنیژہ' کے تحت دیکھیں۔

● چشمِ خلیل اور غروبِ آفتاب:

ابراہیمؑ علیہ السلام نے جس سماج میں آنکھیں کھولیں اور سنِ رشد کو پہنچے وہ سرتاسر بت تراشی اور بت پرستی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ شرک کا سب سے بڑا مرکز خود ان کے گھر میں قائم تھا۔ ان کے باپ آزر، ہزاروں قسم کے بت بناتے اور انھیں فروخت کرتے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ قوم ابراہیمؑ مظاہر پرستی اور ستارہ پرستی پر کامل یقین رکھتی تھی۔ یہ بات ان کے دلوں میں عقیدہ بن کر گھر کر چکی تھی کہ سورج، چاند، ستارے اور سیارے غرضیکہ تمام اجرامِ فلکی غیر معمولی قدرت کے حامل ہیں۔ تمام کارخانۂ عالم کا نظم و نسق ان کی حرکات کی تاثیر پر قائم ودائم ہے۔ وہ نہ صرف ہمارے رزق رساں ہیں بلکہ غضب ناک بھی ہوتے ہیں اور ہم انسانوں کو تباہ و برباد بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے ثبوتِ حق اور اتمامِ حجت کے لیے ایک دلچسپ پیرایۂ بیان تلاش کیا۔

تاروں بھری رات تھی۔ آسمان پر چاروں طرف ستارے اپنی ضیا برسا رہے تھے۔ ابراہیمؑ نے ایک روشن ستارے کو دیکھا اور کہا کہ ''یہ میرا رب ہے''۔ وہ روشن ستارہ ایک وقت مقررہ کے بعد اپنی چمک سے محروم ہو گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ابراہیمؑ نے فرمایا ''میں چھپ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ پھر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، گویا ہوئے ''یہ میرا رب ہے''، مگر جب دھیرے دھیرے صبح کا اجالا پھیلنے لگا اور تاریکی نے اپنا دامن سمیٹنا شروع کیا تو چاند کی روشنی بھی رفتہ رفتہ مدھم پڑنے لگی اور ایک نقطے پر آ کر چاند آسمان کی پنہائیوں میں کہیں روپوش ہو گیا تو ابراہیم نے فرمایا ''اگر میرے رب نے ہدایت نہ کی تو میں گمراہ ہو جاؤں گا''۔

جب تاروں بھری رات ختم ہو گئی اور چاند سے بھی اس کا اجالا چھن گیا تو روزِ روشن نے پوری دنیا کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ مشرق سے سورج طلوع ہو کر دھیرے دھیرے تمام دنیا پر نور کی بارش کرنے لگا تو ابراہیمؑ ایک بار پھر گویا ہوئے ''یہ میرا رب ہے کیونکہ کواکب

میں اس سے بڑا ستارہ کوئی دوسرا نہیں ہے'' مگر دن بھر چمکنے اور دنیا کو روشن کرنے کے بعد بالآخر اس کی بھی روشنی اور چمک ضائع ہونے لگی اور کالی اندھیری رات نے بالآخر سورج کو بھی سیاہ چادر اڑھادی تو ابراہیمؑ اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ ''میں تمھارے شرک سے بیزار ہوں اور اپنا رخ اس ذات کی طرف پھیرتا ہوں جو زمینوں اور آسمانوں کا خالق ہے''۔

وہ سکوتِ شام صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل
(اقبالؔ)

● چشمہ حیواں، چشمہ زندگی، چشمہ ظلمات: تفصیل 'آبِ بقا' کے تحت دیکھیں۔

● چشمِ زرقا: تفصیل 'زرقا' کے تحت دیکھیں۔

● چوبِ کلیم: تفصیل 'عصائے موسیٰ' کے تحت دیکھیں۔

● حاتم طائی:

جس طرح ایران کا بادشاہ نوشیرواں انصاف پسندی اور عدل گستری میں یگانۂ روزگار ہے اسی طرح عرب کے حاتم کا نام مہمان نوازی، دریادلی، خداترسی اور سخاوت وکرم میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

حاتم طائی یمن کے قبیلۂ طے کا سردار تھا، اپنے قبیلے کی نسبت سے اسے طائی کہا جاتا ہے۔ خدا نے اسے قبیلے کی سرداری کے ساتھ ساتھ فیاضی اور دریادلی سے بھی نوازا تھا۔ مہمان نوازی اور فقیروں کی دست گیری اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ کبھی کوئی سائل اس کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ اس کی سخاوت، فیاضی اور کرم گستری کی داستانیں مختلف زبانوں کے ادب اور تاریخ کے صفحات کی زینت ہیں۔ ان میں داستانی رنگوں کی آمیزش بھی کی گئی ہے۔

حاتم کی سخاوت کے بے شمار قصے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ہی فقیر کو چالیس دروازوں سے خیرات دیتا تھا اور مہمانوں کی ضیافت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تھا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ حاتم کے پاس ایک اعلیٰ اور اچھی نسل کا گھوڑا تھا۔ کسی بادشاہ نے وہ گھوڑا لانے کے لیے اپنا ایک آدمی حاتم کے پاس بھیجا۔ حاتم کے جانور ابھی جنگل سے واپس نہیں لوٹے تھے، چنانچہ اس نے وہی قیمتی گھوڑا اپنے مہمان کی ضیافت کے لیے ذبح کر ڈالا۔ بعد میں جب مہمان کے آنے کی غرض معلوم ہوئی اسے بے حد افسوس ہوا۔

حاتم خداترس اور نیک آدمی تھا۔ مذہباً وہ آتش پرست تھا۔ اس مردِ نیک کا زمانہ پیغمبرِ اسلام کا زمانہ تھا۔ بعد میں جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو حاتم کا قبیلہ بھی مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ حاتم کے صاحبزادے عدی بن حاتم مشہور صحابی اور راویِ حدیث ہیں۔

حاتم باوجودیکہ آتش پرست تھا مگر جب اس کی بیٹی ایک قیدی کی حیثیت سے دربارِ محمدی میں لائی گئی، اس نے اپنے والد مرحوم کی سخاوت کا حوالہ دے کر پیغمبرِ اسلام سے رحم کی درخواست کی۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے حاتم کی قدر و منزلت اور سخاوت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی بیٹی کو آزاد کر دیا اور بہ صد احترام رخصت کیا۔ یہ واقعہ 630ء میں پیش آیا۔

چھوڑ دے دنیا کو جو کوئی بہ زیرِ آسماں
ہمتِ حاتم کا پہنچے اس کے کب پاسنگ، دوست
(سوداؔ)

شکل ان کی دیکھ کر ہوتا ہے استغنا مجھے
یہ بخیل اس عہد کے ناسخ کم از حاتم نہیں
(ناسخؔ)

● حجر اسود:

حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ میدان میں جس جگہ بھی عبادت گاہ مقرر کرتے، وہاں ایک لمبا ان گھڑا پتھر ستون کی طرح کھڑا کر دیتے تھے۔ حجر اسود بھی اسی

قسم کا پتھر ہے۔ یہ پتھر کعبہ کے ایک کونے میں لگا ہوا ہے اور یہ فائدہ دیتا ہے کہ طواف شروع اور ختم اسی جگہ سے کیا جاتا ہے۔ دورِ جاہلیت میں یہ پتھر بے حد مقدس تصور کیا جاتا تھا، اسلام کے بعد بھی اس کا یہ تقدس برقرار رہا۔ مسلمان بھی اسے بے حد متبرک خیال کرتے ہیں۔ ایک دفعہ فاروق اعظم نے لوگوں کو سنانے کے لیے حجرِ اسود کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تو ایک پتھر ہے، نہ کسی کو نفع نہ ضرر دے سکتا ہے لیکن چونکہ رسول اللہ تمھارا بوسہ لیا کرتے تھے اس لیے میں بھی ایسا کر رہا ہوں۔ عوام میں مشہور ہے کہ یہ پتھر جنت سے اتارا گیا تھا، اس وقت اس کا رنگ سفید تھا لیکن رفتہ رفتہ انسانی معصیتوں سے متاثر ہو کر اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ تلمیح نگار شاعر کی نگاہوں میں حجرِ اسود اس کے محبوب کا تل ہے۔

جو تل تجھ مکھ کے کعبہ میں مجھے اسود حجر دستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہِ زمزم کا اثر دستا
(ولیؔ)

● حسنِ کنعاں، حسنِ یوسف:

خدائے تبارک و تعالیٰ نے حضرت یوسف کو سیرت و اخلاق کی دولت سے مالا مال تو کیا ہی تھا۔ وہ خوبصورت بھی بے پناہ تھے۔ حسن و خوبروئی کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان کے اندر موجود نہ ہو۔ توارت کی زبانی 'یوسف خوبصورت اور نو رپیکر تھے'۔ صحیح مسلم کی حدیث میں آیا ہے کہ "یوسف کو نصف حسن دیا گیا ہے"۔ زلیخا عزیزِ مصر کی بیوی بھی حسنِ یوسف کی جلوہ آرائیوں کا شکار ہوئی اور نقدِ دل و جاں ہار بیٹھی۔

اے زلیخا نقدِ جاں اس میں گرہ سے جائے گا
حسنِ یوسف ہے، یہ کچھ سودا نہیں بازار کا
(جلیلؔ)

زنانِ مصر نے بھی جب دعوت کے دوران، جمالِ یوسفی کا نظارہ کیا تو مدہوشی کے عالم میں اپنی اپنی انگلیاں تراش لیں اور کہنے لگیں 'بخدا! یہ انسان نہیں فرشتہ نور ہے'۔ چونکہ

یوسف کا آبائی وطن کنعان تھا اس لیے حسنِ یوسف کے ساتھ ساتھ حسنِ کنعان اور ماہِ کنعان کا بھی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا
جس نور کو تو نے مہِ کنعان میں دیکھا
(سوداؔ)

ہنسی آتی ہے مجھ کو جب ترے آگے
کوئی ماہِ کنعاں کو کہتا حسیں ہے
(ذوقؔ)

● حشمتِ دارا: تفصیل 'دارا' کے تحت دیکھیں۔

● حکمتِ لقمان:

حضرت لقمان، اہل عرب کے یہاں ایک مشہور شخصیت ہے۔عرب کے قدیم لٹریچر میں ان کا ذکر ایک حکیم، دانا، صاحب تدبیر اور نیک انسان کی حیثیت سے خوب کیا گیا ہے۔ان کے حکیمانہ اقوال صحیفۂ لقمان کے نام سے مشہور ومعروف تھے۔اس ہر دلعزیزی اور مقبولیت کے باوجود ان کی شخصیت کی تعیین میں متضاد آرا پائی جاتی ہیں۔ بعض مورخین انھیں افریقی نسل کا بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ عرب میں ایک غلام کی حیثیت سے آئے تھے اور پیشے کے اعتبار سے بڑھئی تھے۔کچھ یہ کہتے ہیں کہ وہ داوؑد کے زمانے میں قاضی کے عہدے پر مامور تھے۔ایک مورخ کا کہنا ہے کہ لقمان حکیم، عرب کے مشہور قبیلہ عاد سے تھے اور غلام نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔مگر اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ انتہائی مدبر، حکیم، دانا اور صاحب فہم وفراست تھے۔اللہ تعالیٰ نے حکمت سے ان کو حصۂ وافر عطا کیا تھا۔ایک مورخ نے لکھا ہے کہ جب شداد بن عاد کا انتقال ہو گیا تو حکومت اس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی اور اللہ نے لقمان کو وہ چیز عطا فرمائی جو اس وقت انسانوں میں کسی کو بھی نہیں دی گئی تھی ان کو سو انسانوں کے برابر حاسہ اور ادراک عطا فرمایا

تھا اور وہ اپنے عہد کے سب سے طویل آدمی تھے۔ قرآن میں بھی حکمتِ لقمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے حکیمانہ اقوال، پند و نصائح اور حسنِ اخلاق کی تعلیم و تلقین کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی تقریب سے ایک سورت کا نام بھی سورۂ لقمان رکھا گیا ہے۔

اگرچہ اس امر پر بعض لوگوں کا اختلاف ہے کہ لقمان نبی بھی تھے مگر اکثر مفسرین نے ان کو مردِ نیک، عابد و زاہد اور صاحبِ حکمت و دانائی ہی لکھا ہے۔ کہیں کوئی ایسا جملہ نظر نہیں آتا جس سے ان کی نبوت کا بھی ثبوت ملتا ہو۔

تلمیح کے نقطۂ نظر سے حکمتِ لقمان کا استعمال شاعروں نے خوب کیا ہے مثال کے طور پر اس شعر میں:

کون سمجھے گا کلامِ بوعلی کا زیر و بم
کون سلجھائے گا زلفِ حکمتِ لقماں کا خم

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ لقمان کے تعلق سے حکمت کا لفظ اکثر دانائی، فہم و فراست، عقل اور تدبیر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، حکمتِ لقمان اسی معنی میں معروف و مشہور بھی تھی، مگر کچھ شاعروں نے حکمت کا استعمال حکیمی، طبابت اور معالج کے معنوں میں بھی کر لیا ہے۔ یہ ایک شاعرانہ اظہار ہے ورنہ طبابت سے حکمتِ لقمان کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔

تمام دہر میں اس کے مطب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
(غالبؔ)

ہر علم میں حکمت کے، تو یہ ثانیِ لقماں
بندوق کی ہی گولی ہے، وہ ان کی جو حب ہے
(سوداؔ)

مذکور ہووے تیرے جو ذہنِ سلیم کا
آجائے ذکر حضرتِ لقماں کے سامنے
(انشاؔ)

● حوا:

جس طرح آدمؑ پہلی انسانی مخلوق تھے اسی طرح حوا بھی آدم کی ہی جنس سے تھیں۔ وہ پہلی مخلوق عورت تھیں۔ خدا نے انھیں آدم کی دلجوئی، تالیفِ قلب اور زوجیت کے لیے پیدا کیا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ جنت میں مقیم تھے۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لینے کے بعد دونوں کو ساتھ ساتھ اس روے زمین پر بھیجا گیا تھا۔ قرآن، حضرتِ حوا کی پیدائش کی تفصیل نہیں بتلاتا مگر جیسا کہ بائبل میں مذکور ہے اور عوام میں مشہور کہ حوا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں۔ حدیثوں میں عورتوں کے ساتھ رفق اور نرمی کا برتاؤ کرنے کی ہدایت کے پیچھے بھی یہی نکتہ ہے کہ چونکہ اس کی خلقت پسلی سے ہوئی ہے، اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ ورنہ سختی کرنے سے تعلقات شکست وریخت کا شکار ہو جائیں گے۔

آدم وحوا نے گر پتوں سے ڈھانکا تھا بدن
ناخلف ہے اک قدم آگے اگر اس سے بڑھا

● حیاتِ ابد، حیاتِ جاوداں: تفصیل 'خضر' کے تحت دیکھیں۔

● حیزوم: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔

● خاتمِ سلیمانی، مہرِ سلیمانی، نگینِ سلیماں:

قرآن نے اگرچہ حضرت سلیمان کی عظیم الشان حکومت کا ذکر کیا ہے، تختِ سلیمانی کا ذکر کیا ہے، پرندوں اور حشرات الارض کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت اور ان سے باتیں کرنے کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے، مگر حضرت سلیمان کے تعلق سے انگوٹھی کا ذکر نہ تو قرآن میں کیا گیا ہے اور نہ ہی احادیث میں اس کے متعلق کوئی صراحت موجود ہے۔ خاتمِ سلیمانی کا تصور کلی طور پر اسرائیلیات کی دین ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ دنوں کے لیے حضرت سلیمان کے تخت پر ایک شیطان کو قابض کر دیا تھا۔ جس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ حضرت سلیمان کی ایک بیوی بت پرست تھی، اس کا نام امینہ تھا، وہ

حضرت سلیمان کے گھر میں رہتے ہوئے پوشیدہ طور پر بت پرستی کیا کرتی تھی۔ جتنے دنوں تک اس نے بت پرستی کی تھی، اسی مدت تک حضرت سلیمان تختِ سلطنت سے محروم کر دیے گئے تھے۔ ان کی وہ انگوٹھی بھی، جس پر اسمِ اعظم نقش تھا اور جس کی برکت سے وہ تمام مخلوقات پر حکمرانی کرتے تھے، کسی طرح ان کی لونڈی کے ذریعہ شیطان کے ہاتھ میں پڑ گئی اور شیطان اس انگوٹھی کی برکت سے حضرت سلیمان کی شکل اختیار کر کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوتا۔ جب وہ مدت پوری ہو گئی تو وہ انگوٹھی ایک دن اس کے ہاتھ سے نکل کر دریا میں گر گئی، جہاں ایک مچھلی نے اس کو نگل لیا، پھر وہ مچھلی کسی طرح شکار ہو کر حضرت سلیمان کے پاس آئی اور اس کے پیٹ سے وہ انگوٹھی نکال کر انھوں نے دوبارہ اپنا ملک واپس لیا۔ مفسرین اور محققین نے اس طرح کی اسرائیلی روایتوں سے اسلامی روایتوں کو محفوظ رکھا ہے۔

جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں
(اقبالؔ)

حاکمِ وقت ہے تجھ گھر میں رقیبِ بدخو
دیو مختار ہوا، ملکِ سلیمان میں آ
(ولیؔ)

خاتمِ سلیمانی کو نگینِ سلیماں اور مہرِ سلیمانی غالباً اسی لیے کہا گیا ہے کہ انگوٹھی میں نگینے کا استعمال عام بات ہے، پھر حضرت سلیمان تو جنات کے بھی حاکم تھے جو دریاؤں کی گہرائی سے ان کے لیے موتی نکال لاتے تھے۔ ایسی حالت میں سلیمان کی اس انگوٹھی میں نگینے کا استعمال کوئی خاص بات نہیں۔ اور جہاں تک مہر سلیمانی کا سوال ہے تو مہر کے ایک معنی انگوٹھی کے بھی ہوتے ہیں اور اگر مہر بمعنی ٹھپہ بھی مراد لیا جائے تو بھی کوئی اشکال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ سلیمان کے زمانے میں اور بہت بعد تک مہروں کا استعمال دستخط اور ٹھپے کے لیے کیا جاتا تھا، عام طور پر یہ مہریں انگوٹھی سے لگائی جاتی تھیں۔

لوں نہ اک مشتِ خاک کے بدلے
گر ملے خاتمِ سلیمانی
(حالیؔ)

کہیں مجھ دل کوں سب مل خاتم مہر سلیمانی
خیالِ لعلِ دلبر اس میں گر ہو کر نگیں آوے
(ولیؔ)

کیوں پری رویاں نہ آویں حکم میں میرے تمام
تجھ دہن کی یاد ہے مہرِ سلیمانی مجھے
(ولیؔ)

تمن دوائر مکھ ہے نگیں سلیمانی کا
طیور وانس و پری پر کرو سدا تم راج
(قلیؔ)

ہم جاہ وحشم یاں کا کیا کہیے کہ کیا جانا
خاتم کو سلیماں کی انگشترِ پا جانا
(میرؔ)

تو فلس فلس سے ہو ماہیوں کے وقتِ شکار
نگینِ دستِ سلیماں بدستِ ماہی گیر
(ذوقؔ)

ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبا جاگا
خاتمِ دستِ سلیماں کا نگیں بن کے رہا
(اقبالؔ)

● خزانۂ خسرو: تفصیل 'خسرو پرویز' کے تحت دیکھیں۔

● خسرو پرویز:

ایران کا مشہور ساسانی بادشاہ، ہرمز کا بیٹا اور نوشیروانِ عادل کا پوتا تھا۔ یہ 590ء

میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس کا زمانہ وہی ہے جب عرب میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوا تھا۔ خسرو کا عہد ایرانی حکومت واقتدار کا دورِ عروج تھا۔ یہ بادشاہ فارسی اور اردو ادبیات میں حشمت وجلال اور شان وشوکت کا مظہر ہے۔

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی
(فیضؔ)

شعروادب میں جب خسرو پرویز کا ذکر آتا ہے تو اس کے ساتھ فرہاد اور شیریں کی داستانِ عشق بھی ہمارے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ خسرو کی بیوی کا نام شیریں تھا اور فرہاد، شیریں کا عاشق۔ خسرو نے جوئے شیر کے بدلے شیریں کو فرہاد کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب وعدہ وفائی کا وقت قریب آیا تو خسرو نے مکروفریب اور عیاری سے کام لے کر فرہاد کو راستے سے ہٹا دیا۔

شیریں نے کوہ کن سے منگائی تھی جوئے شیر
گر امتحاں ہے اس سے بھی دشوار، کچھ کہو
(سوداؔ)

خسرو، حکومت و دولت، ثروت اور زرگیری کا حریص تھا۔ اپنے اڑتیس سالہ دور حکومت میں سلطنت کی سرحدوں کو وسیع کیا۔ شام، فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور ہر ممکن طریقے سے بے انتہا دولت جمع کی، عوام کی ضروریات اور فلاحی کاموں کو نظر انداز کر کے اپنے خزانوں کو بھرتا رہا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کے خزانے کی مقدار ایک ارب تیس کروڑ سونے کے فرینک کے برابر ہو گئی تھی۔

تاریخ اور وقائع نگاروں نے خسرو پرویز کے دربار کے چند عجائبات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ یہ تمام عجائبات خسرو کی شوقین طبیعت اور رنگین مزاجی کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر طاقدیس نامی تختِ زریں، باربد اور نکیسا جیسے موسیقار اور گویے، شبدیز نامی گھوڑا اور ایک خوانِ زریں، جس کے تمام اسباب وآلات سونے کے تھے۔ یہ سب

کے سب دربارِ خسروی کی شان میں چار چاند لگاتے تھے۔

شبدیز کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ سیاہ رنگ کا گھوڑا تھا جسے شیریں نے تحفتاً خسرو کو پیش کیا تھا۔ اس گھوڑے کا ہمزاد گلگوں، شیریں کی سواری میں تھا۔ شبدیز کا نقش کوہِ بے ستوں میں ابھی تک موجود ہے۔ اس کے علاوہ خسرو کے آٹھ خزانوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان خزانوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1- گنجِ عروس
2- گنجِ بادآورد
3- دیبۂ خسروی
4- گنجِ افراسیاب
5- گنجِ سوختہ
6- گنجِ خضرا
7- گنجِ شادآور
8- گنجِ بار

فردوسی نے صرف سات خزانوں کا ذکر کیا ہے۔ گنجِ بار کا ذکر اس کے ہاں نہیں۔ ان تمام خزانوں کے بارے میں بھی الگ الگ داستانیں مشہور ہیں۔

جب پیغمبر اسلام نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کی غرض سے مختلف بادشاہوں کے پاس خطوط روانہ کیے تھے تو خسرو کے پاس بھی ایک خط ارسال کیا گیا تھا مگر خسرو نے پیغمبرِ اسلام کے خط کو چاک کر دیا اور اسلام قبول کرنے سے باز رہا۔ آخر کار خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے 638ء میں قتل کر ڈالا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ نظامی مثنوی 'خسرو شیریں' میں لکھتا ہے کہ جب شیرویہ نے اپنے باپ خسرو پرویز کو تہ تیغ کر دیا تو شیریں نے بھی خنجر سے خود کو ہلاک کر ڈالا اور پہلوے خسرو میں دفن ہوئی۔

قصۂ خسرو سے ظاہر ہے کہ وقتِ زورِ عشق
باپ کو بیٹا سلار کھے ہے خنجر کار کے
(مصحفی)

● خضر:

خضر کا نام فارسی اور اردو ادبیات میں ایک راہنما، ایک پیر و مرشد، ایک مرد نیکو کار اور ایک ولی اللہ کے طور پر مستعمل ہوتا ہے جو عام طور پر انسانی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں؛ جنگل، بیابان اور ویرانے ان کا مستقر ہیں۔ قافلے سے دور بھٹک جانے والوں اور گم کردۂ راہ انسانوں کو ان کی منزل تک پہنچاتے ہیں اور حیات دائمی کے حامل ہیں۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
(غالبؔ)

وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن
سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا
(میرؔ)

کہیں تو دکھادیں گے عشق کا جنگل
بہت ہی خضر کو غرہ ہے رہنمائی کا
(میرؔ)

خضر کے تعلق سے ادب میں اسی طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ ان کی شخصیت کے اردگرد اسرائیلیات، عوامی روایات اور حقائق کے تانے بانے اس قدر گتھے ہوئے ہیں کہ اصل حقیقت تو کہیں گم ہوگئی اور عوامی روایات نے اس قدر شہرت حاصل کرلی کہ اس کے سامنے اب اصل حقیقت بے معنی ہے۔ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی ملاقات کا ذکر جس عبد صالح سے کیا گیا ہے اس کی صراحت احادیث میں وارد ہوئی ہے اور اس بات پر تقریباً سبھی مفسرین اور محققین متفق ہیں کہ وہ عبد صالح خضر ہی تھے۔ ان کو خضر اس لیے

کہا جاتا ہے:

''خضر کے معنی سرسبز اور شاداب کے ہیں، ایک مرتبہ سفید زمین پر بیٹھے
تو وہ حصہ زمین ان کے نیچے سرسبز ہو کر لہلہانے لگا۔ اسی وجہ سے ان کا نام
خضر پڑ گیا۔'' (18)

اب سرسبزی و شادابی کی رعایت کے طور پر خضر کا استعمال عام ہے۔ اسی خوبی کی مناسبت سے خضر کو مبارک قدم اور خجستہ پے بھی کہا گیا ہے۔

کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
(اقبالؔ)

خضر کو خضر کہنے کے پیچھے ایک منطق یہ بھی ہے کہ وہ سبز پوش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ حضرت خضر کے نام کی نذر مانتے ہیں، سبز کپڑے زیب تن کرتے ہیں۔ کبھی کبھی خضر کا ذکر سفید لباس میں ملبوس مرد بزرگ کی حیثیت سے بھی کیا جاتا ہے۔

شادابی اس میں ایسی کہ جوں خضر سبز پوش
بیٹھا ہوا ہو چشمۂ حیواں کے سامنے
(انشاؔ)

یہ سبزہ برلب جو دیکھنا ہے کیا شاداب
کہ غوطہ دے کے نکالی خضر نے سبز عبا
(سحرؔ)

خضر عام طور پر انسانی نگاہوں سے چھپے رہتے ہیں اور صرف اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب کوئی شخص ان کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ غیب سے ظاہر ہو کر اس کی حاجت روائی کرتے ہیں اور پھر نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔

تلاشِ خضر بہر منزل مقصد نہ کر سوداؔ
کوئی خود رفتگی سے راہبر بہتر نہیں ہوتا
(سوداؔ)

موسیٰ سے ملاقات کے علاوہ حضرت خضر کا ذکر سکندر کے نام کے ساتھ ہوا ہے۔ خضر وموسیٰ کی ملاقات کی تصدیق تو آیات قرآنی اور احادیث نبوی کرتی ہیں لیکن سکندر و خضر کی ملاقات کی تصدیق باوثوق ذرائع سے نہیں ہو سکی؛ البتہ یہ بات عوام الناس میں مشہور ہے کہ سکندر، حضرت خضر کی راہنمائی میں آب حیات کی تلاش میں نکلا تھا۔ آب حیات وہ مشہور پانی کا چشمہ ہے جو ظلمات میں رواں ہے اور اسے پینے والا حیات دائمی حاصل کر لیتا ہے۔ سکندر، خضر کی معیت میں آب حیات کے چشمے تک پہنچ تو گیا مگر اس کا پانی پینے سے محروم رہا اور خضر نے وہ پانی پی کر حیات دوام حاصل کر لی۔ اسی لیے خضر کا نام درازیٔ عمر، حیات دوام، عمر جاودانی، حیات ابد، عمر ابد اور عمر جاوید کے مترادف کے طور پر مستعمل ہوتا ہے۔ حالانکہ عمر خضر کی درازی اور حیات ابدی کسی نصِ شرعی سے ثابت نہیں ہے۔

اے سکندر نہ ڈھونڈھ آبِ حیات
چشمۂ خضر خوش بیانی ہے
(ولیؔ)

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی
(غالبؔ)

ایک روایت یہ ہے کہ خضر کا ٹھکانا جنگل اور بیابان ہے۔ وہ جنگل اور بیابان میں گم ہو جانے والوں کو راستہ دکھاتے ہیں، قافلے سے دور رہ جانے والوں اور بچھڑ جانے والوں کو سوار کرتے ہیں اور ان کی منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ پیاسوں اور تھکے ماندوں کو پانی بھی پلاتے ہیں۔

حضرت خضر کے ساتھ ساتھ الیاس کے نام کا استعمال بھی عام ہے۔ مشہور ہے کہ آب حیات پینے میں حضرت خضر کے شریک یہ بھی تھے اور جس طرح حضرت خضر کو حیات دوام حاصل ہے، الیاس کو بھی ہمیشہ کی زندگی عطا ہوئی۔ کچھ لوگوں نے خضر کو خشکی کی راہ نمائی اور الیاس کو بحری راہنمائی پر مامور ہونے کا ذکر کیا ہے اور کچھ لوگوں نے اس کے برعکس۔

توشۂ بحر برائے شاہِ سکندر فر ہو
دے خدا عمر خضر تجھ کو حیاتِ الیاس
(ذوقؔ)

حفاظت بحر و بر کی تب تو سونپی جائے قدرت سے
بندھے جب خضر اور الیاس سے مرتاض کا جوڑا
(انشاؔ)

بہر حال تلمیح کے نقطۂ نظر سے حضرت خضر کی شخصیت بہت سارے مضامین و مطالب کا مرجع و ماخذ ہے، اور شاعروں اور تلمیح نگاروں نے ایک ایک مضمون پر اپنا زورِ قلم دکھلایا ہے۔ کہیں عمرِ خضر کا ذکر ہے کہیں خضر کے مبارک قدم اور خجستہ پائی کا؛ کہیں آبِ حیات پی کر زندۂ جاوید ہونے کا اور کہیں موت کی لذت سے ناآشنا اور محروم رہ جانے کا؛ کہیں ہادی اور راہ نما بننے کا اور کہیں ہادی و راہ نما بن کر بھی طلب گاروں کی حاجت روائی نہ کرنے کا۔ غرضیکہ خضر کی شخصیت شاعری میں ایک ایسا شجرِ بارآور ہے جس سے ہر شاعر نے بقدرِ ظرف خوشہ چینی کی ہے۔

لحاظ میں کوئی دور ساتھ چلتا ہے
وگرنہ دہر میں اب خضر کا بھرم کیا ہے
(فیضؔ)

● خضر و موسیٰ:

ایک بار کا ذکر ہے کہ موسیٰ بنو اسرائیل کے ایک مجمع سے خطاب کر رہے تھے۔ مجمع کے ایک آدمی نے موسیٰ سے پوچھا کہ اس زمانے کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا کہ میں اس عہد میں سب سے بڑا عالم ہوں۔ بات اگرچہ حقیقت پر مبنی تھی مگر خدائے تعالیٰ کو ان کی یہ ادا پسند نہ آئی اور بذریعہ وحی ان کو مطلع کیا کہ جہاں دو سمندر ملتے ہیں وہاں ہمارا ایک بندہ تم سے بھی زیادہ علم و دانائی رکھتا ہے۔

دو دریاؤں کے سنگم والی یہ کون سی جگہ تھی جس کو قرآن نے مجمع البحرین کہا

ہے؟اس سلسلے میں مختلف اقوال منقول ہیں۔کوئی اسے بحرروم اور بحرقلزم کا سنگم قرار دیتا ہےاور کوئی اسے خلیج سویز اور خلیج عقبہ کا سنگم قرار دیتا ہے اس ضمن میں راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں پر خلیج سویز اور خلیج عقبہ کا نقطہ اتصال ہے وہی جگہ مجمع البحرین ہے کیونکہ وادیِ سینا، کوہِ طور اور میدان تیہ یہ تمام علاقے اسی جگہ آباد ہیں۔

موسیٰ کے دل میں، اس مرد بزرگ سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ مچھلی کو توشہ دان میں رکھ لو اور جس مقام پر وہ مچھلی گم ہو جائے گی وہیں وہ شخص ملے گا۔موسیٰ اپنے خلیفہ (یوشع بن نون) کو لے کر روانہ ہو گئے۔چلتے چلتے ایک مقام پر پہنچ کر، آرام کرنے کی غرض سے پتھر پر سر رکھ کر سو گئے۔اسی دوران مچھلی میں زندگی پیدا ہوئی اور وہ توشہ دان سے نکل کر سمندر میں چلی گئی۔جس راستے وہ سمندر میں گئی تھی وہاں ایک خاص قسم کا راستہ یا لکیر بھی بن گئی تھی۔یہ واقعہ یوشع کی نگاہوں کے سامنے ہوا تھا۔بہر حال موسیٰ بیدار ہوئے اور منزل کی تلاش میں چل پڑے کچھ دور چل کر جب بھوک کا احتیاج ہوا اور یوشع سے مچھلی طلب کی تو انھوں نے گزرے ہوئے واقعے کی تفصیل بتائی۔تفصیل سن کر موسیٰ نے فرمایا، وہی وہ جگہ تھی، ہم جس کی تلاش میں نکلے تھے۔الٹے قدموں وہ لوگ پھر اسی مقام پر آ پہنچے۔دیکھا تو ایک خوش لباس شخص بیٹھا ہوا ہے۔روایتوں کے مطابق یہ خضر تھے۔حضرت موسیٰ نے ان سے علم حاصل کرنے کی بابت دریافت کیا۔پہلے پہل تو حضرت خضر نے انکار کیا پھر بعد میں اس شرط پر راضی ہو گئے کہ تم ہم سے کوئی سوال نہ کرنا میں خود تمہیں اس کی حقیقت بتلا دوں گا۔اس کے بعد دونوں ایک راستے پر چل پڑے۔

جب سمندر کے کنارے پہنچے تو سامنے ایک کشتی نظر آئی۔کشتی والوں نے موسیٰ اور خضر کو بلا اجرت کشتی پر سوار کر لیا اور کشتی روانہ ہو گئی کشتی ابھی کچھ دور ہی گئی تھی کہ حضرت خضر نے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا اور اس کو عیب دار بنا دیا۔موسیٰ نے جب دیکھا تو یارائے ضبط نہ رہا، بول پڑے کہ ایک تو کشتی والوں نے ہم پر احسان کیا کہ ہمیں بلا معاوضہ کشتی میں سوار کر لیا اور آپ نے ان کے احسان کا بدلہ اس شکل میں دیا۔خضر نے کہا میں پہلے ہی

کہتا تھا کہ آپ صبر نہ کر سکیں گے۔ موسیٰ بے حد شرمندہ ہوئے اور اگلی بھول نہ کرنے کے وعدے پر آگے چل پڑے۔

کشتی سے اتر کر ایک میدان میں پہنچے، وہاں کچھ بچے کھیل رہے تھے، حضرت خضر آگے بڑھے اور ایک بچے کو قتل کر ڈالا۔ موسیٰ کی نگاہوں میں یہ جرم عظیم تھا، انھوں نے پھر احتجاج کیا تو خضر نے ان کو وعدہ یاد دلایا اور ایک بار پھر اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔ چلتے چلتے دونوں ایک بستی میں وارد ہوئے۔ سفر اور تکان کا غلبہ تھا۔ دونوں نے اہالیانِ بستی سے مہمان نوازی کی درخواست کی مگر بستی والوں نے ان کو مہمان بنانے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ لوگ ابھی بستی سے گزر ہی رہے تھے کہ خضر ایک ایسے مکان کی طرف بڑھے جس کی دیوار خمیدہ تھی اور اس کے گر جانے کا اندیشہ تھا۔ خضر نے دیوار کو ہاتھ کا سہارا دیا اور دیوار سیدھی کر دی۔ حضرت موسیٰ کے لیے یہ بھی تعجب کی بات تھی۔ انھوں نے پھر خضر سے کہا کہ بستی والوں نے ہمارے ساتھ بہتر سلوک نہیں کیا، ہمیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا اور آپ نے بلا اجرت ان کی دیوار سیدھی کر دی۔ حضرت خضر نے جواب دیا اب میری اور تمھاری جدائی یقینی ہے کیونکہ تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکتے۔ غرض دونوں کے درمیان جب مفارقت ہونے لگی تو خضر نے کہا کہ یہ تمام کام میں خدا کے حکم سے کر رہا تھا مگر اب تم ان کی تفصیل بھی سنتے جاؤ۔

کشتی در حقیقت چند مسکینوں کی تھی، یہ مسکین سمندر میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ وہ جس طرف جا رہے تھے وہاں ایک ظالم بادشاہ ہے جو اچھی کشتیوں کو بزور بازو چھین لیتا ہے میں نے اس میں سوراخ اس لیے کر دیا تھا کہ عیب دار سمجھ کر بادشاہ اسے نہیں لے سکے گا۔ اور جہاں تک معصوم بچے کا سوال تھا، اس کے والدین مومن اور شریف تھے مجھے خوف محسوس ہوا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر انھیں اذیت اور مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔ میں نے اسے اس لیے قتل کر ڈالا کہ خدا نیک والدین کو اس سے کہیں بہتر اولاد عطا کرے گا۔ بوسیدہ دیوار کو کھڑا کر دینے کے پیچھے یہ مصلحت اور راز پوشیدہ تھا کہ وہ گھر شہر کے دو یتیم بچوں کا

تھا، اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا۔ ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی کہ بچے جب جوان ہو جائیں تو اپنا خزانہ صحیح سلامت نکال لیں۔ خضر یہ کہہ کر رخصت ہو گئے۔

خضر کے بارے میں عجیب و غریب قسم کی بے شمار روایات، تاریخ اور ادب کی کتابوں میں موجود ہیں۔ نہ جانے وہ سب روایات اس قدر چلن میں کیسے آگئیں۔ قرآن شریف اور احادیث صحیحہ میں ان کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ غالباً یہ اسرائیلیات کی دین ہیں مثلاً وہ دائمی زندگی حاصل کر چکے ہیں اور ہر زمانے اور ہر عہد میں گم کردہ راہ لوگوں کی راہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ حدیثوں میں صاف طور پر آیا ہے کہ حیاتِ ابدی کسی بھی بندے کو عطا نہیں کی گئی ہے۔ اس میں خضر کا استثنا بھی نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ خضر اپنی طبعی عمر کے بعد وفات پا چکے ہیں۔ البتہ ان کو حق تعالیٰ نے بعض اسرارِ کونیہ کا علم ضرور عطا کیا تھا۔

کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
(اقبالؔ)

● خلیلِ بت شکن:

حضرت ابراہیمؑ کی طبیعت بت پرستی اور بت سازی کے ماحول سے شروع سے ہی بیزار تھی۔ خدا نے انھیں رشد و ہدایت اور بصیرت کی آگہی عطا کی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے دینِ حق کی تبلیغ اپنے باپ سے شروع کی۔ انھیں خدا کی وحدانیت اور ربانیت کا یقین دلایا مگر بار بار سمجھانے کے باوجود بھی ان کا باپ بدستور بت سازی اور بت پرستی کرتا رہا۔ خدا کی بتلائی ہوئی راہ پر گامزن ہونا تو درکنار وہ خود ابراہیمؑ کو طرح طرح کی دھمکیاں دینے لگا اور انھیں سنگسار کر دینے کے لیے کہا۔ جب ابراہیمؑ باپ کی روش سے پوری طرح مایوس ہو گئے تو اہلِ قوم کو مخاطب کیا اور انھیں راہِ راست پر لانے کی

ہر ممکن کوشش کی۔ مگر قوم نے بھی ان کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا اور بدستور مشرکانہ اعمال و عقائد کی راہ پر گامزن رہی۔

اب ابراہیمؑ نے اہلِ قوم کو بت پرستی کی راہ سے واپس موڑنے اور خدا کی راہ پر ڈالنے کے لیے ایک نئی حکمتِ عملی تیار کی۔ کسی موقعے پر انھوں نے قوم کے افراد سے کہا تھا کہ ''میں تمھارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا'' چنانچہ اس حکمتِ عملی کو روبہ عمل لانے کے لیے وہ موقعے کی تلاش میں رہنے لگے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں قوم کا ایک مذہبی میلہ پیش آ گیا۔ پوری قوم اس میلہ میں شرکت کے لیے چل پڑی۔ کچھ لوگوں نے ابراہیمؑ سے بھی میلے کی تقریب میں شرکت کے لیے اصرار کیا مگر ابراہیمؑ نے بیماری کا بہانہ تراش لیا اور میلے میں شریک ہونے سے باز رہے۔

جب قوم کے سبھی افراد میلے میں جا چکے اور وہاں ناچ رنگ اور شراب و کباب میں مشغول ہو گئے تو ابراہیم گھر سے نکلے اور سب سے بڑے دیوتا کے مندر میں پہنچے۔ دیکھا تو وہاں اور بھی سیکڑوں بت نصب تھے اور ان کے آس پاس قسم قسم کے پھل اور مٹھائیاں بہ طور چڑھاوے کے رکھے تھے۔ ابراہیم نے تو پہلے ان بتوں سے طنزیہ لہجے میں کچھ باتیں کیں اور جواب نہ ملنے پر آخر کار بڑے بت کو چھوڑ سبھی بتوں کو توڑ ڈالا اور کلہاڑی سب سے بڑے بت کے کاندھے پر رکھ کر چلے آئے۔ اس طرح ابراہیمؑ نے پوری قوم کے اصول و عقائد سے بغاوت کی اور خدا کی وحدانیت و حقانیت کا برملا اعلان کر دیا۔

خلیل بت شکن کا خوف مانع تھا مجھے ورنہ
سخن بت خانۂ معنی تھا اور فکرِ رسا آزر
(نظم طباطبائی)

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
(اقبالؔ)

● خمِ افلاطون: تفصیل 'افلاطون' کے تحت دیکھیں۔

● خوابِ زلیخا:

بازارِ مصر سے ہوتے ہوئے یوسف عزیزِ مصر کے ایوان میں داخل ہوئے تو عزیز مصر کے گھر میں رفتہ رفتہ کئی برس بیت گئے۔ یوسف نے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا۔ کل کا معصوم اور خوش شکل بچہ آج جوان ہو کر حسنِ مجسم اور رعنائی کا پیکر بن چکا تھا۔ حسن و خوبروئی کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان کے اندر موجود نہ ہو۔ چہرہ، چاند اور سورج کی مانند روشن اور تابناک تھا۔ عزیزِ مصر کی بیوی اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی، نفسِ امارہ کی شورشوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ حضرت یوسف پر دل و جان سے پروانہ وار نثار ہونے لگی۔ اب شب و روز وہ اسی فکر میں رہتی کہ کس طرح اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرے۔ وہ حضرتِ یوسف کو رام کرنے کے نئے نئے راستے ڈھونڈھتی رہی اور ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے رات دن خواب دیکھنے لگی۔

کم سے کم حسنِ تخیل کا تماشا دیکھتے
جلوۂ یوسف تو کیا خوابِ زلیخا دیکھتے
(اصغؔر)

یہاں ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ''توریت نے تو عزیزِ مصر کا نام فوطی فار بتلایا ہے لیکن اس کی بیوی کا نام کہیں نہیں لکھا۔ نہیں معلوم ہمارے مفسرین نے کہاں سے یہ بات معلوم کر لی ہے کہ اس کا نام زلیخا تھا؟ بہر حال اس کی کوئی قابلِ اعتماد اصلیت پائی نہیں جاتی''

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اب عوام الناس اور بعض مفسرین کے درمیان عزیزِ مصر کی بیوی کا نام زلیخا اس قدر معروف ہو چکا ہے کہ اس فرضی نام نے اصل نام کی جگہ لے لی ہے اور داستانوں، ناولوں اور شاعری میں زلیخا کے نام سے ہزاروں کہانیاں اور اشعار زبان زدِ خاص و عام ہے۔

زلیخا نے جب یوسف کی جانب سے کچھ التفات نہ دیکھا تو ایک دن جوشِ فریفتگی میں بے قابو ہو کر شرم و حجاب کی ساری سرحدیں توڑ ڈالیں۔ اس نے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور یوسف سے شادکامی کے لیے اصرار کرنے لگی۔ یوسف کے لیے سخت امتحان اور آزمائش کی گھڑی تھی۔ زلیخا اور یوسف دونوں جوان۔ گھر کے دروازے بند، حسنِ زلیخا کی بے پناہ عشوہ طرازیوں کی بارش؛ مگر یہ تمام دنیاوی لذتیں، صبر و استقامت اور عصمت و پاکدامنی کے پہاڑ کو متزلزل نہ کر سکیں۔ یوسف نے زلیخا کو لاکھ سمجھانا چاہا اور اس کو ارادۂ بد سے باز رکھنا چاہا مگر زلیخا پر شیطان سوار تھا۔ یوسف نے دیکھا کہ یہ عورت برائی کے ارتکاب پر مصر ہے تو باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف دوڑے۔ زلیخا بھی یوسف کا تعاقب کرنے کے لیے دوڑی۔ اتفاقاً یوسف کی قمیص کا پچھلا حصہ، زلیخا کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے پکڑ کر کھینچنا چاہا، کھینچا تانی میں کرتا پھٹ گیا مگر یوسف جوں توں کر کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اس درمیان اس کھینچا تانی میں دروازہ کسی طرح کھل گیا، سامنے عزیزِ مصر اور زلیخا کا ایک رشتے دار، کھڑے نظر آئے۔ عورت نے جب خاوند کو سامنے کھڑا دیکھا تو جھٹ معصوم بن گئی اور یہ کہتے ہوئے کہ ایسے شخص کی سزا قید خانہ یا دردناک عذاب کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے جو تیرے اہل کے ساتھ ارادۂ بد رکھتا ہو، سارا الزام یوسف کی گردن پر رکھ دیا۔

یوسف نے دیکھا کہ عورت تمام الزام ان پر دھر رہی ہے تو صورتِ حال واضح کر دی اور کہا مجھے برائی پر مجبور کرنے والی یہی ہے میں اس سے بچنے کے لیے باہر دروازے کی طرف بھاگتا آیا ہوں۔

● خوابِ یوسف:

حضرت یوسفؑ ابھی کم عمر ہی تھے کہ خواب میں انھوں نے دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر ان کے روبرو سجدہ ریز ہیں۔ بیٹے نے یہ خواب باپ سے بیان کیا۔ حضرت

یعقوبؑ، یوسفؑ کی خوش بختی اور سعادت پر بے حد مسرور ہوئے۔ یعقوبؑ کو یہ اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہ لگی کہ ان کا یہ بیٹا خدا کا برگزیدہ بندہ اور عظمت وشان کا حامل ہوگا مگر ساتھ ہی انھوں نے یوسف کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ اپنے بھائیوں سے اس خواب کا تذکرہ ہرگز نہ کریں۔ مبادا شیطان ان کے دلوں میں رشک وحسد کی بھڑکتی آگ کو تیز تر نہ کر دے اور تیرے بھائی تیرے درپے آزار نہ ہو جائیں۔ مگر رفتہ رفتہ بھائیوں کو کسی نہ کسی طرح اس خواب کا علم ہو گیا۔ حضرت یعقوبؑ کا اندیشہ درست ثابت ہوا اور بھائی شب و روز یوسف کی ہلاکت وبربادی کا تانا بانا بننے لگے۔ یوسف کا یہ خواب، خوابِ یوسف کی تلمیح کے طور پر مستعمل ہے۔

کیوں کر نہ بکوں میں ہاتھ اس کے
یوسف کی طرح میں خواب دیکھا

(سوداؔ)

یوسف کے بھائیوں نے ان کی ہلاکت کا سامان کر ڈالا۔ پہلے پہل ان کا ارادہ قتل کرنے کا تھا مگر ایک بھائی (روبن) کے مشورے سے وہ یوسف کو کسی اندھے کنویں میں ڈال دیے جانے پر رضامند ہو گئے۔ باہمی صلاح ومشورے کے بعد وہ سب یعقوبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے:

''آپ یوسف کو ہمارے ساتھ کیوں نہیں بھیجتے۔ کیا آپ کو ہمارے اوپر اعتماد نہیں۔ کل آپ اسے ضرور ہمارے ساتھ بھیج دیجیے کہ خوب کھائے پیے اور کھیلے اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں۔''(19)

یعقوبؑ ان کی شاطرانہ چالوں کو سمجھ تو گئے مگر انکار نہ کر سکے صرف اتنا کہا:

''اسے تمہارا لے جانا مجھے صدمہ دے گا اور یہ بھی کھٹکا لگا رہے گا کہ تمہاری غفلت میں اسے بھیڑیا کھا جائے۔''(20)

غرض بھائیوں کو یوسف کو اپنے ساتھ سیر وتفریح کے لیے لے جانے کی اجازت

مل گئی۔ وہ یوسف کو سیر کرانے کے بہانے جنگل میں لے گئے اور مشورے کے مطابق ایک تنگ و تاریک کنویں میں ڈال دیا۔

قصہ نہیں سنا کیا یوسف ہی کا جو تو نے
اب بھائیوں سے چندے تو گرگ آشتی کر
(میرؔ)

جہاں میں قصۂ یوسف ہے آئینہ کہ پسر
پدر کا درد، نہ مہر برادری جانے
(سوداؔ)

● خوانِ خلیل:

ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں اور بہت سے اوصافِ کریمانہ سے نوازا تھا وہیں ان کی طبیعت میں ایک اور خوبی ودیعت کر رکھی تھی۔ ابراہیم بڑے مہمان نواز مشہور تھے۔ ان کے دروازے ہمیشہ مہمانوں کے لیے کھلے رہتے تھے۔ جب بھی کوئی مہمان آتا، ابراہیمؑ اس کی ضیافت اور خاطر داری فرض سمجھ کر کرتے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ابراہیمؑ جنگل کی سیر کر رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ تین مہمان آرہے ہیں وہ لپک کر ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھے اور انھیں اپنے گھر لے آئے اور ان کی خاطر تواضع ایک بھنے ہوئے بچھڑے سے کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مہمان انسان نہیں بلکہ خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جو ابراہیمؑ کو بیٹے کی خوشخبری دینے اور قوم لوط کی ہلاکت کا سامان کرنے آئے ہیں۔

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
(غالبؔ)

ابراہیمؑ کی مہمان نوازی اور ضیافت کا ایک واقعہ بعض کتابوں میں ملتا ہے۔ قرآن شریف میں تو اس واقعے کو بیان نہیں کیا گیا ہے مگر صاحب قصص القرآن نے اپنی کتاب میں تحریر فرمایا ہے جس کا خلاصہ تحریر کیا جارہا ہے۔

ابراہیمؑ کا دستور یہ تھا کہ وہ مہمانوں کے انتظار میں سرِ راہ کھڑے رہتے تھے اور جب تک کوئی مہمان نہ آجاتا ان کا دسترخوان نہ بچھتا تھا اور نہ ہی وہ کھانا کھاتے تھے۔

جسم کوست روح سوں آدے بہت مشتاق ہو
گر تیری امت خلیل اللہ کی مہمانی کرے
(ولی)

ایک دن معمول کے مطابق جنگل میں کھڑے ہو کر مہمانوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک بوڑھا آدمی نظر آیا۔ ضعف اور کمزوری کے باعث اس کی کمر خمیدہ ہو چکی تھی اور بمشکل لکڑی کے سہارے چل پا رہا تھا۔ ابراہیم آگے بڑھے اور بصد مسرت و احترام اسے گھر لے آئے۔ دسترخوان بچھایا گیا اور سب لوگوں نے کھانا تناول فرمایا۔ جب کھانے سے سب لوگ فارغ ہو چکے تو ابراہیمؑ نے اس بوڑھے آدمی سے کہا کہ اس خدائے یکتا کا شکر ادا کرو جس نے ہم سب کو یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ بڈھا خشم ناک ہو گیا اور کہنے لگا میں نہیں جانتا کہ تیرا خدا کون ہے میں تو اس بت کا شکر ادا کرتا ہوں جو میرے گھر میں ہے۔ ابراہیم اس جواب سے ناراض ہو گئے اور اس بوڑھے کو گھر سے نکال دیا۔ کچھ وقت نہ گزرا تھا کہ ان کو اپنے اس عمل پر ندامت اور شرمندگی ہونے لگی کہ خدائے تعالیٰ نے آج تک کبھی بھی اپنے رزق کا دروازہ بند نہ کیا تو مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اس کی مشرکانہ باتوں سے ناراض ہو کر گھر سے نکال دوں۔ صاحب قصص القرآن مزید لکھتے ہیں:

> ''یہ واقعہ اپنی تاریخی حیثیت میں قابل قبول ہو یا نا قابل قبول لیکن اس حقیقت کا ضرور اعلان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اخلاق کریمانہ کی بلندی ضرب المثل بن چکی تھی اور زبان زدِ خلائق تھی۔''

خوانِ نعمت پر ہے تیرے مہمانوں کا ہجوم
نام پھر زندہ ہوا خوانِ خلیل اللہ کا
(حالی)

● دارا:

خاندانِ کیانی کا چشم و چراغ اور قدیم ایران کا مشہور بادشاہ گزرا ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب ہے، دارا بن داراب بن بہمن بن اسفندیار بن گشتاسپ۔ دارا کے باپ کو دارائے اکبر اور خود دارا کو دارائے اصغر بھی کہا جاتا ہے۔ دارا محض بارہ برس کی عمر میں تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوا اور رومی بادشاہوں سے خراج وصول کیا۔

ایرانیوں میں یہ بات مشہور ہے کہ دارا اور سکندر باہم بھائی بھائی تھے۔ دارا کے باپ داراب نے قیصرِ روم کی بیٹی سے عقد کیا تھا لیکن کسی بات پر ناراض ہو کر اپنی بیوی کو اس کے میکے بھیج دیا تھا۔ اس وقت وہ امید سے تھی۔ اپنے باپ کے گھر میں اس نے ایک بچے کو جنم دیا یہی بچہ بعد میں سکندر رومی کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔ اس طرح دارا اور سکندر کے بیچ دو بھائیوں کا رشتہ تھا۔

سکندر نے جب ایران پر حملہ کیا تو دارا سے اس کا مقابلہ ہوا۔ سکندر کے مقابلے دارا کمزور پڑا اور شکست سے دوچار ہوا۔ فردوسی کے شاہنامے کے مطابق 'دارا کے دو وزیر سکندر سے ملے ہوئے تھے اور ایک رات جب دارا محوِ خواب تھا، دونوں وزیروں نے خنجر سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سکندر کو اس کی خبر نہ تھی۔ بعد میں جب سکندر کو علم ہوا کہ دارا اس کا بھائی تھا تو اس کے قتل کی پاداش میں سکندر نے دونوں وزیروں کو تہِ تیغ کر ڈالا'

دارا، سلطنت و فرماں روائی اور شوکت و عظمت میں معروف ہے۔ اس کے خزانوں کو سکندر نے خرد برد کر دیا۔

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

(آتش)

● داؤد:

حضرت داؤد، قوم بنو اسرائیل کے لیے پیغمبر بنا کر مبعوث کیے گئے تھے۔ حضرت

داوٗدؑ سے قبل بنو اسرائیل میں یہ سلسلہ اور روایت چلی آ رہی تھی کہ نبوت و رسالت ایک خاندان سے وابستہ تھی اور دوسرے خاندان میں بادشاہی اور حکومت چلی آ رہی تھی۔ داوٗدؑ پہلے ایسے نبی ہیں جن کو نبوت و رسالت اور حکومت و سلطنت دونوں ہی نعمتیں ایک ساتھ عطا کی گئیں۔ مشہور پیغمبر اور بادشاہ حضرت سلیمان آپ کے فرزند تھے جن کی حکومت و سطوت اور شان و شوکت کی شہرت چار دانگِ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہی وہ داوٗد ہیں جن کو تورات میں اور اس کے تعلق سے انگریزی ادبیات میں 'کنگ داوٗدؑ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مگر یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تورات کے کنگ داوٗد اور قرآن کے داوٗد کی شخصیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تورات میں جہاں داوٗد کے تعلق سے بہت ساری ایسی داستانوں کو بھی بیان کر دیا گیا ہے جو ایک نبی کے شایانِ شان قطعاً نہیں ہیں، قرآن ان کی تصدیق بھی نہیں کرتا، ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسی داستانوں کو بھی جگہ دی گئی ہے جس سے ان کی پیغمبرانہ شان، اخلاقِ عالیہ اور راست بازی و پاک بازی پر حرف آتا ہے۔ قرآن کی روشنی میں داوٗد ایسے نبی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت سے بھی سرفراز کیا، انھیں حکومت و سلطنت کی بھی ذمہ داریاں دیں، آسمانی کتاب زبور بھی عطا فرمائی اور معجزات و کرامات کی شان بھی بخشی۔ لحنِ داوٗدی اور زرہِ داوٗدی اسی پیغمبرانہ معجزات کی صداقت کی گواہی دیتی ہیں۔

''حضرت داوٗد کا زمانہ حکومت 1013 ق۔م تا 973 ق۔م کا ہے۔'' (21)

خضر اس کی سرکار کا آب دار
زرہ ساز داوٗد سے دس ہزار
(میر حسنؔ)

● دجال:

ایک ایسا فتنہ پرور شخص جو قربِ قیامت میں ظاہر ہوگا۔ دجال کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ چونکہ یہ شخص دریائے دجلہ کے آس پاس ظہور کرے گا اس نسبت سے اسے

دجال کہا گیا ہے۔ ایک اور توجیہہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ دجال دِجل سے مشتق ہے اور صیغۂ مبالغہ ہے جس کے معنی ہوں گے بہت بڑا فریب دینے والا اور بہت بڑا مکار۔ دجال چونکہ فطرتاً فریبی اور مکار ہوگا اس لیے اسے اس توصیفی نام سے یاد کیا گیا۔

فتنۂ دجال کی تلمیح فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں رائج رہی ہے۔ دجال کا ذکر کچھ حدیثوں میں بھی وارد ہوا ہے اور شعروادب کی کتابوں میں تو اس کی فتنہ انگیزیوں اور ظالمانہ حرکتوں کا ذکر کثرت سے ہوا ہے۔

روایتوں میں آیا ہے کہ دجال وہ شخص ہے جو اس دنیا میں بالکل آخری زمانے میں ظاہر ہوگا، یہ قربِ قیامت کا دور ہوگا۔ اس کے ایک طرف پانی کی نہر اور دوسری طرف آگ کی نہر رواں ہوگی۔ جو شخص آگ کی نہر میں جائے گا اسے حقیقت میں آبِ سرد و شیریں ملے گا اور جو شخص آبِ سرد کا آرزومند ہوگا اس کے نصیب میں آگ کے شعلے ہوں گے۔ ایک وقت میں دجال تمام دنیا میں اپنا تسلط قائم کرلے گا مگر مکہ اور مدینہ اس کی دست رس سے باہر رہیں گے۔ اس کی پیشانی پر کافر (ک+ف+ر) کا لفظ نوشتہ ہوگا جسے صرف اہلِ ایمان اپنی بصیرتِ ایمانی سے پہچان سکیں گے۔

روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ دجال یک چشم ہوگا۔ اس کے لیے دجال اعور یا کانا دجال کے الفاظ عوام میں مشہور ہیں۔ شرح مثنوی شریف میں لکھا ہے کہ "اہل ایران کا عقیدہ ہے کہ دجال اہلِ اصفہان سے ہوگا اور شہر اصفہان میں ایک کنواں ہے جو دجال کا نشیمن تصور کیا جاتا ہے۔" (22) چاہِ اصفہان کی تلمیح اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

دجال جب قربِ قیامت میں ظہور کرے گا تو ایک گدھے پر سوار ہوکر آئے گا۔ خرِ دجال کی تلمیح اس کے لیے مستعمل ہے۔ وہ شہروں کو تاخت وتاراج کرے گا اور عوام الناس کو ظلم وِستم کا شکار بنائے گا۔ اپنی خدائی کا دعویٰ کرے گا اور جو اہل ایمان اس کے دامِ فریب میں نہ آئیں گے انہیں سخت سے سخت سزا دے گا۔ جب دجال کا فتنہ اپنی انتہا کو پہنچ چکے گا تو اس کی بیخ کنی کے لیے حضرتِ عیسیٰ کا ظہور ہوگا۔ وہ آسمانِ چہارم سے اس دنیا میں تشریف

لائیں گے۔ یہ نماز کا وقت ہوگا اور مسلمان حضرتِ مہدی کی امامت میں نماز کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ نماز کے بعد حضرت عیسیٰ دجال سے برسرِ پیکار ہوں گے اور اپنے مخصوص حربہ سے اسے بابِ لد پر قتل کر دیں گے۔ بابِ لد شہر دمشق کے شہر پناہ کا ایک دروازہ ہے۔

کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ دجال خود کو مہدی کہے گا اور لوگوں کی ہدایت کا دعویٰ کرے گا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ وہ خود کو مسیحِ ہدایت کہے گا اور لوگوں کو گمراہ کرتا رہے گا لیکن بالآخر حضرت عیسیٰ کے ساتھ جنگ میں کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔ انگریزی زبان میں دجال کو ضدِ مسیح (Anti Christ) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ہے قوی تر دوست اے ناسخ جو دشمن ہے قوی
ساتھ مہدی کے ہوں میں کچھ غم نہیں دجال کا
(ناسخ)

● دربارِ سلیمانی: تفصیل 'بلقیس وسلیماں' کے تحت دیکھیں۔

● درختِ مریم: تفصیل 'نخل مریم' کے تحت دیکھیں۔

● درفشِ کاویانی:

ضحاک کو شکست دینے کے بعد فریدوں جب تختِ سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے کاوہ آہن گر کے اسی چرمی پیش بند کو ایران کا قومی جھنڈا قرار دیا جس کے سایے تلے کاوہ نے فریدوں کی قیادت میں اہلِ ایران کو اکٹھا کیا تھا۔ اس وقت سے یہ جھنڈا شاہانِ ایران کا قومی جھنڈا قرار پایا اور اسی آہن گر کے نام پر اس کا نام 'درفشِ کاویانی' رکھا گیا۔

'درفش' کے معنی جھنڈے کے ہوتے ہیں اور درفش، اس سہ گوشے کپڑے کو بھی کہا جاتا ہے جو علم کی شکل میں باندھا جاتا ہے۔ کاویانی دراصل کاوہ کی جانب نسبت کی گئی ہے۔ اس طرح درفش کاویانی کا مطلب ہوگیا 'کاوہ کا جھنڈا'۔

اہلِ ایران کے علاوہ عرب مورخین نے بھی اس جھنڈے کی بعض خصوصیات کا ذکر

کیا ہے۔ طبری کے مطابق ''یہ جھنڈا چیتوں کی کھالوں کا بنا ہوا تھا اور آٹھ ہاتھ چوڑا اور بارہ ہاتھ لمبا تھا''۔ بلعمی لکھتا ہے کہ ''اہل ایران ہر جنگ میں فتح پانے کے بعد آرائش کے لیے اس پر جواہرات جڑ دیتے تھے اور وہ سارے کا سارا سونے، چاندی، موتیوں اور جواہرات سے بھرا ہوا تھا''۔

مسعودی کے بیان کے مطابق ''یہ جھنڈا جنگِ قادسیہ میں ایک عرب کے ہاتھ لگا جس کا نام ضرار بن الخطاب تھا۔ جنگ قادسیہ 636ء میں حضرت سعد بن ابی وقاص کی سرکردگی میں لڑی گئی تھی۔ تین دنوں کی مسلسل جنگ کے بعد ایرانی پسپا ہو گئے اور یہ جھنڈا ضرار بن الخطاب کے ہاتھ لگا۔ انھوں نے اس کو تیس ہزار دینار میں فروخت کر ڈالا، حالانکہ اس کی قیمت بارہ لاکھ دینار سے کم نہ تھی''۔ ثعالبی نے لکھا ہے:

> ''حضرت سعد بن ابی وقاص نے اس کو یزدجر کے دوسرے جواہرات اور خزانوں کے ساتھ جو خدا نے مسلمانوں کو نصیب کیے تھے، شامل کر دیا اور اس قسم کی قیمتی چیزوں کے ساتھ حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیج دیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اس کو نیزے سے اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔''(23)

چوں درفشِ کاویانی چاک شد
آتشِ اولادِ ساساں خاک شد
(اقبال)

● دستِ سفید، دستِ کلیم، دستِ موسیٰ: تفصیل 'ید بیضا' کے تحت دیکھیں۔

● دعائے نوح:

حضرت نوحؑ مسلسل ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم میں تبلیغ و اشاعتِ دین کا فرض ادا کرتے رہے، اس طویل مدت میں صرف چالیس آدمی نوحؑ کی پیغمبری اور خدا کی وحدانیت کے قائل ہو سکے۔ اب قوم کی ہدایت سے نوحؑ بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ قوم کی

باطل کوشی، عناد اور ہٹ دھرمی ان پر واضح ہوگئی تھی؛ وہ قوم کے اس عمل سے سخت ملول اور آزردہ خاطر تھے۔ تب خداے تعالیٰ نے ان کی تسلی کے لیے فرمایا کہ 'اے نوح! جنھیں ایمان لانا تھا وہ لے آچکے اب ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں بچا ہے تو ان کی حرکات سے غم نہ کھا'۔ جب نوحؑ کو ہر طرف سے ان کی ضلالت و گمراہی کا یقین ہوگیا تو انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں دستِ دعا دراز کیے۔ ''اے میرے پالنے والے! تو روے زمین پر کسی کافر کو باقی نہ چھوڑ اگر تو انھیں چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور یہ فاجروں اور ڈھیٹ کافروں کو ہی جنم دیں گے''۔ دعاے نوحؑ، بارگاہِ ایزدی میں فوراً قبول ہوگئی اور قومِ نوحؑ نے اپنی آنکھوں سے اس طوفانِ بلاخیز کا نظارہ کیا جس کی نظیر قوموں کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔

آہ میری کب دعاے نوحؑ تھی
چشمِ تر طوفاں اٹھانا چھوڑ دے
(مومنؔ)

● دمِ جبرئیل: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔

● دمِ عیسیٰ: تفصیل 'اعجازِ مسیحا' کے تحت دیکھیں۔

● دیدۂ زرقا: تفصیل 'زرقا' کے تحت دیکھیں۔

● دیوارِ قہقہہ:

کسی نامعلوم جگہ پر تعمیر کی گئی ایک ایسی دیوار جس کی ساخت اور بناوٹ عجیب و غریب ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ یہ دیوارِ چین کا ہی دوسرا نام ہے۔ کچھ لوگ سدِ سکندری کو دیوارِ قہقہہ کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں اور بعض لوگ بخارا اور ترمذ کی درمیانی سد کو دیوارِ قہقہہ کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ایسی دیوار ہے جس کی تعمیر اور شکل عجیب و غریب قسم کی ہے۔ عوام میں مشہور ہے کہ اس دیوار کے اس پار کا حال کوئی نہیں جان سکتا۔

جب کوئی اس پر چڑھ کر دوسری طرف جھانکتا ہے تو ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتا ہے اور اسی جانب کود جاتا ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا۔ چونکہ ادھر سے کوئی واپس نہیں آتا بلکہ جھانکنے کے بعد ادھر کا ہی ہو رہتا ہے اس لیے دوسری طرف کا حال معلوم نہیں ہو پاتا۔ کسی چیز کو دیکھ کر جب بے ساختہ ہنسی آ جائے تو اس جگہ یہ تلمیح کام آتی ہے۔

ہنسے جو وہ مرے رونے پہ توصفِ مژگاں
نہ سمجھو تم اسے دیوار قہقہہ سمجھو
(ذوقؔ)

کیا جانے ان کو آتی ہے کیوں اس قدر ہنسی
دیوار قہقہہ مری تصویر بن گئی

دیوار اس صنم کی دیوارِ قہقہہ ہے
جو اس طرف کو جھانکا پھر اس طرف کہاں ہے

● ذوالفقار: تفصیل 'علی' کے تحت دیکھیں۔

● ذوالنون: تفصیل 'یونس' کے تحت دیکھیں۔

● رام کہانی:

رامائن اور مہابھارت، سنسکرت زبان کے دو مشہور رزمیے ہیں۔ رامائن میں شری رام چندر جی کی داستان حیات بیان کی گئی ہے اور مہابھارت میں کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ آزمائی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ رامائن کو پہلے پہل بالمیکی نے تقریباً 500 قبل مسیح میں تصنیف کیا تھا اور دوبارہ اسے مشہور شاعر تلسی داس نے اپنے زور قلم سے لافانی شاہکار بنا دیا۔

رامائن دراصل شری رام چندر کے واقعات زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ مختصر تفصیل اس کی یہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں دریائے سرجو کے کنارے اجودھیا میں راجا دشرتھ کی حکومت تھی۔ ان کے تین رانیاں اور چار بیٹے تھے۔ کوشلیا سے رام، سومترا سے لکشمن اور

شترودھن اور کیکئی سے بھرت۔ رام جری، بہادر اور پاک طینت تھے۔ ان کی شادی راجا جنک کی بیٹی سیتا سے ہوئی۔ سوئمبر میں سیتا سے شادی کی یہ شرط ٹھہری کہ جو کوئی دشنو کے کمان کو خم کردے گا، سیتا اسے بیاہ دی جائے گی۔ محفل میں موجود سبھی شاہزادوں نے اپنی قسمت آزمائی کی لیکن وہ کمان کو ہلا تک نہ سکے۔ رام جی نے چشم زدن میں اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے اور سیتا ان کے عقد میں آ گئیں۔

راجا دشرتھ نے اپنے بڑے لڑکے رام چندر کو تخت و تاج دینا چاہا تو بھرت کی ماں، کیکئی راہ میں آڑے آ گئی اور اس نے بہلا پھسلا کر رام کو بن باس جانے کے لیے مجبور کر دیا۔ رام ایک فرماں بردار اور پاک باز بیٹے کی طرح جنگل جانے کے لیے تیار ہو گئے، سیتا اور لکشمن بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ جنگل میں ان لوگوں نے چودہ برس کا بن باس کاٹ دیا۔ ان حالات میں بھرت نے بھی گدی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا اور وہ رام کی کھڑاؤں گدی پر رکھ کر راج پاٹ چلانے لگے۔

جنگل میں رام اور سیتا کی آزمائش ابھی باقی تھی۔ لنکا کا راجا راون، سیتا کو اغوا کر لے گیا۔ راون بڑا ظالم اور طاقتور راجا تھا۔ آخر کار رام چندر نے بندروں کے راجا سگریو اور اس کے جنرل ہنومان کی مدد سے لنکا پر چڑھائی کی اور ایک لمبی لڑائی کے بعد سیتا کو آزاد کرا لائے۔ اس جنگ میں راون اور اس کا بھائی دونوں مارے گئے۔ راون، لنکا کا راجا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے:

> ''بہت شریر، ظالم اور بدی کا پتلا تھا۔ اس کے دس سر تھے، بیس ہاتھ تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں، صورت خوفناک تھی۔ اس میں اس قدر طاقت تھی کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتا تھا۔ سمندر کو متحرک کر سکتا تھا۔ دیوتا اس کی خدمت انجام دیتے تھے۔''(24)

راون کو شکست دینے کے بعد رام چندر جی اجودھیا لوٹ آئے اور نئے سرے سے ان کا راج تلک کیا گیا اور ان کی حکومت لمبے زمانے تک رہی۔ یہی رام راج کہلاتا ہے۔

اس کہانی میں کچھ تلمیحی پہلو پوشیدہ ہیں۔ مثال کے طور پر غم زدہ اوردکھ بھری داستان حیات کورام کہانی کی ترکیب سے تعبیر کرتے ہیں۔رام جی کے بن باس جانے کو اطاعت والدین کی قابل قدر مثال اوررام جی کومریادا پرشوتم کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ سیتا کا کردار ایک فرماں بردار اور پاک باز بیوی کی تمام خوبیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ سیتا اور مریم، پاک بازی وعفت کا استعارہ ہیں۔راون ایک انتہائی طاقت وراور جفاجو راجا،لیکن پاک بازی اوراستقامت کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے
کیوں خاموش رہا کرتا ہوں
چھوڑو میری رام کہانی
میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں
(فیض)

فرصت خواب نہیں ذکر بتاں میں ہم کو
رات دن رام کہانی سی کہا کرتے ہیں
(میر)

آتش عشق نے راون کو جلاکر مارا
گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں
(میر)

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا
(اقبال)

● رخشِ رستم: تفصیل 'رستم' کے تحت دیکھیں۔

● رستم:

ایران کا مشہور بہادر، نا قابلِ شکست جنگ جو اور قوت بازو میں بے مثال تھا۔ رستم کی شخصیت کے دو پہلو ہیں ایک تاریخی اور دوسرا نیم تاریخی۔ اس کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ عہدِ اسلامی میں جب اسلامی فوجیں ابوعبیدہ الجراح کی قیادت میں سرزمینِ ایران کو فتح کرنے کے ارادے سے آگے بڑھیں تو شاہنشاہِ ایران نے رستم کو اپنا سپہ سالار بنا کر اسلامی فوجوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے بھیجا تھا۔ بقول شبلی:

''حضرت ابوبکر صدیق کے عہد میں عراق پر جو حملہ ہوا اس نے ایرانیوں کو چونکا دیا تھا۔ چنانچہ پوران دخت نے رستم کو، جو نہایت شجاع اور صاحبِ تدبیر تھا، دربار میں طلب کیا اور وزیرِ حرب مقرر کر کے تمام اختیارات سونپ دیے اور تمام امرا و اعیانِ سلطنت کو تاکید کی کہ وہ رستم کی اطاعت سے کبھی انحراف نہ کریں۔ پوران دخت نے ایک فوجِ گراں رستم کی اعانت کے لیے تیار کی......ادھر حضرت ابوعبیدہ نے اسلامی فوج کو سروسامانِ حرب سے آراستہ کیا اور پیش قدمی کر کے خود حملے کے لیے بڑھے۔ (ایرانی) بڑی ثابت قدمی سے لڑے لیکن بالآخر شکست کھائی۔'' (25)

رستم کے کردار اور اس کی شخصیت کو بے حد دلچسپ اور پرکشش بنانے میں فردوسی کے شاہنامے کا زبردست ہاتھ ہے۔ فردوسی کے شاہنامے کے مطابق رستم منوچہر کے زمانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ کا نام زال اور دادا کا نام سام تھا۔ یہ دونوں بھی اپنے زمانے کے مشہور پہلوان تھے۔ رستم کی بیوی تہمینہ شاہِ سمنگان کی بیٹی اور سہراب کی ماں تھی۔

ضعیف وقوی دونوں رہتے نہیں
نہ یاں زال ٹھہرا نہ رستم رہا
(میر)

سمنگان کے محلِ وقوع اور حدودِ اربعہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ فرہنگوں میں سمنگان سے توران اور خراسان کے سارے علاقے مراد لیے گئے ہیں۔ رستم کے بیٹے کا نام سہراب تھا جس نے انجانے میں اپنے باپ سے مقابلہ کیا اور اس کے ہاتھوں قتل ہوا۔

رستمی کا عوض افلاک سے لوں گا پسِ مرگ
قتل عاشق ہے یہ خوں ریزیِ سہراب نہیں
(مومن)

رستم کے گھوڑے کا نام رخش تھا۔ اسی لیے کبھی کبھی اسے رخشِ رستم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ گھوڑا بھی بہادری اور فرماں برداری میں بے مثال تھا۔ اس کے بعض کمالات تو فوق فطری خوبیوں کے حامل تھے۔

بھواں کی گوشگی جب تھے تمھیں چرائے کماں
سوار رخش ہوئے کیوں کہ رستمِ دستاں
(قلی)

رستم کے باپ زال اور سیمرغ (عنقا) کی دوستی مشہور ہے۔ شاہنامے کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے کہ سیمرغ نے زال کی پرورش کوہِ البرز پر کی تھی۔ سیمرغ نے رستم کی پیدائش میں بھی زال کی مدد کی تھی اور جب رستم اور اسفندیار کے بیچ جنگ ہوئی تو بھی سیمرغ رستم کا معاون و مددگار تھا۔ سیمرغ نے اپنے پروں سے رستم کے زخموں کو مندمل کیا اور اسفندیار کو قتل کرنے کی ترکیب بھی سجھائی۔ سیمرغ کا نشیمن اور ٹھکانا کوہِ البرز میں ہے۔

زرتشتی روایات کے مطابق البرز وہ پہاڑ ہے جو زمین کے گرداگرد پھیلا ہوا ہے۔ اسلامی روایات میں کوہِ البرز ہی کوہِ قاف ہے۔ اس سے قاف تا قاف کے محاورے کا چلن ہوا ہے جس کے معنی شش جہاتِ عالم کے ہوتے ہیں۔

رستم نے بے شمار جنگیں لڑیں اور کامیابی و کامرانی سے ہم کنار ہوا۔ اس نے دیووں سے بھی مقابلہ کیا اور ان کو زیر کیا۔

باندھوں ہوں میں جس طرح سے مضمون زبردست
رستم نہ کرے دیو کو یوں زیر ہوا پر
(سوداؔ)

شاہنامے کی روایت کے مطابق کیکاؤس کے زمانے میں مازندران کا بادشاہ ایک سفید دیو تھا۔ کیکاؤس نے جس وقت مازندران پر فوج کشی کی، دیو سفید نے جادو کے اثر سے کیکاؤس کو قید کر کے اندھا کر دیا اور ایرانیوں کو شکستِ فاش کھانی پڑی۔ جب رستم کو اس کی اطلاع ہوئی وہ مازندران کی جانب روانہ ہو گیا تا کہ دیو سفید سے مقابلہ کر کے کیکاؤس کو آزاد کرا سکے۔ دیو سفید نے رستم کے مقابلے کی تیاری شروع کر دی اور جادو کے اثر سے رستم کے راستے میں ہفت خواں بنا ڈالا۔

یہ ہفت خوان دشوار گزار راستوں، وادیوں اور غاروں کی مختلف منزلیں تھیں جن میں خوفناک جانوروں، خطرناک جادوگروں اور ہیبت ناک دیووں کا ٹھکانا تھا۔ لیکن رستم اپنی بہادری اور حسنِ تدبر کی بدولت ان تمام پرخطر راہوں سے کامیابی کے ساتھ باہر آیا اور سب سے اخیر میں اس کا سامنا دیو سفید سے ہوا۔ سفید دیو ایک غار میں محوِ خواب تھا، رستم نے اسے نیند سے بیدار کیا اور نبرد آزما ہوا۔ اسے زمین پر پٹک دیا اور اس کے سینے کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس کے خونِ جگر کو کیکاؤس کی آنکھوں سے لگایا۔ دیو سفید کا خونِ جگر جیسے ہی کیکاؤس کی آنکھوں سے مس ہوا اس کی بینائی واپس آ گئی۔ ہفت خوانِ رستم کی تفصیل یہ ہے۔

1۔ پہلی منزل میں رخش نے ایک شیر کو مار ڈالا تھا۔
2۔ دوسری منزل میں رستم کو پیاس کی شدت کا سامنا کرنا پڑا۔
3۔ تیسری منزل میں رستم کا مقابلہ ایک بڑے اژدہے سے ہوا، رستم نے اسے مغلوب کیا۔
4۔ چوتھی منزل میں رستم کے ہاتھوں ایک جادوگرنی کا قتل ہوا۔
5۔ پانچویں منزل میں رستم کے ہاتھوں جادوگرنی کے لڑکوں کی گرفتاری ہوئی۔
6۔ چھٹی منزل میں رستم کا مقابلہ ارژنگ دیو سے ہوا، یہ بے حد سخت مقابلہ تھا، آخرکار

رستم اس منزل سے بھی شادکام باہر آیا۔

7۔ اس منزل میں رستم نے دیوسفید سے جنگ آزمائی کی اور اسے کیفرِ کردار تک پہنچایا۔

کن مشکلوں سے ٹوٹے ساتوں جو آسماں تھے
اے تیرِ آہ، یہ بھی رستم کے ہفت خواں تھے
(قدرؔ)

● رضوان:

ایک فرشتے کا نام ہے جو جنت کی دربانی اور نگہبانی کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ جنت کا سارا انتظام وانصرام رضوان ہی کے ذمہ ہے۔ اللہ کے رسول، شب معراج میں جب آسمانوں کی سیر کر رہے تھے تو جبرئیل نے آپ کی ملاقات اس فرشتے سے کرائی تھی۔ اسی نام کی رعایت سے جنت کے لیے باغِ رضوان اور گلزارِ رضواں کے الفاظ بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

جنت میں کب دیے ہیں وہ رضواں کو مرتبہ
جو مرتبہ ہے تیری گلی کے مقیم کا
(ولیؔ)

کوچۂ جاناں میں جا نکلے جو غلماں بھول کر
یاد ہوا اس کو نہ پھر گلزارِ رضواں بھول کر
(فانیؔ)

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا
(غالبؔ)

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
(غالبؔ)

● روح الامین، روح القدس: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔

● روز جزا، روز حشر، روز عدل، روزِ قیامت:

قیامت کے دن سے مراد وہ دن ہے جب سارا نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا اور دنیا نیست و نابود اور فنا ہو جائے گی۔ پھر سبھی مخلوقات عالم اپنے رب کے حضور، پیش ہوں گی اور ان کے نامۂ اعمال کی بنیاد پر جزا و سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔ قیامت کے دن کو روزِ جزا و سزا، روز حشر اور روزِ عدل بھی کہتے ہیں۔

بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو
(فیض)

قرآن کریم میں قیامت کی آمد اور ظہور کو مختلف پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان سبھی کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کا دن ہولناکیوں سے بھرا ہوگا۔ دنیا کی ہر شے اپنے مرکز اصلی سے ہٹ جائے گی؛ آسمان پھٹ جائے گا، سورج اور چاند لپیٹ دیے جائیں گے، ان کی روشنی ختم ہو جائے گی؛ ستارے بے نور ہو جائیں گے، پہاڑ چلائے جائیں گے، ان کی مضبوط بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی اور وہ دھنی ہوئی روئی کی طرح ہوا میں تیرتے پھریں گے؛ سمندر بہہ نکلیں گے، قبریں اکھاڑ دی جائیں گی اور مردے قبروں سے زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے۔ زمین کو بالکل صاف اور ہموار کر دیا جائے گا، اس دن اونچے نیچے پہاڑ، وادیاں اور فلک بوس عمارتیں سب صاف ہو جائیں گی، سمندر اور دریا خشک ہو جائیں گے، ساری زمین چٹیل میدان ہو جائے گی۔

اے روزِ حشر کچھ شبِ ہجراں بھی کم نہیں
بدنام ہو جہاں میں تیری بلا عبث
(مومن)

قیامت کی ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ صور پھونکے جاتے ہی سب کے سب اپنی اپنی

قبروں سے نکل نکل کر پروردگار کی طرف چلنے لگیں گے۔ کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ یہ روز عدل ہوگا ہر کسی کو اس کے کاموں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا۔ خدا کے سامنے میزانِ عدل نصب کی جائے گی جس میں صحائف اعمال تولے جائیں گے۔ صور پھونکتے جاتے ہی قیامت آجائے گی؛ آواز کی کرختگی کانوں کو بہرا کردے گی۔ اس دن آدمی اپنے بھائی سے، ماں اور باپ سے، بیوی اور اولاد سے بھاگے گا۔ ہر شخص کو اپنی ہی فکر دامن گیر ہوگی، کوئی کسی کو نفع اور سہارا نہ دے سکے گا۔

حشر کا خوف ولی کو تو نہیں ہے واللہ
ہے شفاعت جو وہاں احمدِ مختار کے ہاتھ
(ولیؔ)

قیامت کی شدت اور ہولناکیوں کا ذکر قرآن کے علاوہ حدیث میں بھی وارد ہوا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ 'سب لوگ میدانِ محشر میں ننگے بدن، ننگے پیر، پیدل اور غیر مختون ہوں گے'۔ یہ تکلیف کی شدت اور مجبوری کی انتہا ہوگی۔ ایک دوسری جگہ مذکور ہے کہ 'جس وقت رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے تو پسینہ انسانوں کے آدھے آدھے کانوں تک پہنچا ہوگا' اور 'قیامت والے دن سورج مخلوق کے اتنا قریب ہوگا کہ ایک میل کی مقدار کے قریب فاصلہ ہوگا۔ لوگ اپنے اعمال کے مطابق پسینے میں ہوں گے؛ یہ پسینہ کسی کے ٹخنوں تک، کسی کے گھٹنوں تک اور کسی کی کمر تک ہوگا اور کسی کے لیے یہ لگام بنا ہوگا'۔

آگ ہُئی ہے بقدرِ نیزہ بلند
شمع نہیں آفتابِ محشر ہے
(ولیؔ)

غرضیکہ قیامت کا دن انسان کے لیے انتہائی مجبوری اور آزمائش کا دن ہوگا۔ جسمانی اور روحانی طور پر یہ سب سے سخت دن ہوگا۔ حساب اور کتاب کی آزمائشیں اس پر مستزاد؛

قیامت کے دن کے لیے روز جزا وسزا، روز عدل اور روز حشر کے الفاظ مستعمل ہیں۔ جس میدان میں میزانِ عدل نصب کی جائے گی اسے میدانِ محشر اور عرصۂ محشر کے نام سے جانا جاتا ہے اور سورج کی حدت اور تمازت کے لیے آفتابِ حشر کی تلمیح مستعمل ہے۔

جلوۂ رخ آفتابِ حشر سے کچھ کم نہیں
شورِ محشر ہے تری اٹھتی جوانی کا جواب
(فانیؔ)

● روزۂ مریم:

حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بعد حضرت مریم کے اضطراب کا ایک دور تو ختم ہو گیا مگر یہ خیال رہ رہ کر ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا کہ آخر کس طرح وہ اپنی قوم کو اپنی عفت، پاک دامنی اور بے گناہی کا یقین دلائیں گی؟ آخر کار خدائے تعالیٰ نے اپنی نیک نفس اور پاک بندی کے پاس تسلی اور تالیفِ قلب کے لیے ایک فرشتے کو بھیج دیا اور یہ کہا کہ جب تم اپنی قوم میں پہنچو اور لوگ تم سے اس بچے کی بابت سوال و جواب کریں تو تم خود خاموش رہنا، کوئی جواب نہ دینا بلکہ اشارے سے صرف یہ بتلا دینا کہ میں روزے سے ہوں، اس لیے آپ لوگوں سے بات نہیں کر سکتی ؛ تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اس بچے سے معلوم کر لو۔ بنو اسرائیل میں خاموشی کا روزہ بھی رکھا جاتا تھا اور یہ داخلِ عبادت تھا۔

حضرت مریم نے خدا کا یہ پیغام سن کر بچے کو گود میں اٹھایا اور بیت المقدس کی جانب چل پڑیں۔ جیسے ہی شہر کے اندر داخل ہوئیں، لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان کو ہر چہار جانب سے گھیر لیا اور سوالوں کی بوچھار کرنے لگے۔ وہ اتہام اور بہتان طرازی سے بھی باز نہ آئے۔ آخر خدا کے حکم کی تعمیل میں مریم نے بچے کی جانب اشارہ کر دیا اور خود خاموش رہیں۔ لوگ ازراہِ تعجب کہنے لگے کہ بھلا اس نومولود سے کیسے باتیں کی جا سکتی ہیں؟ اسی وقت وہ شیر خوار بول پڑا اس نے اپنی پیدائش کے مختلف مقاصد پر روشنی ڈالی اور اس طرح حضرت مریم کی عصمت پر لگا داغ دھل سکا۔ لوگوں کو یقین آ گیا کہ یہ خدا کی خاص مصلحت

اور اس کا نشان ہے۔ صومِ مریم یا روزۂ مریم اسی پورے واقعے کی تفصیل بتلاتا ہے۔

غنچہ میں ہے خامشی کا عالم
یا صومِ سکوت میں ہے مریم
(محسنؔ)

دعوتِ کام و زباں روزۂ مریم مگر
زادۂ طبعِ رواں مثل جواں حرف زن
(منیرؔ)

● ریشِ فرعون: تفصیل 'ید بیضا' کے تحت دیکھیں۔

● زرقا:

لغت میں زرقا اس عورت کو کہتے ہیں جس کی آنکھیں سبز اور نیلی ہوں۔ تاریخ میں یہ نام ایک عرب خاتون کا ہے۔ زرقا، یمامہ کی رہنے والی ایک عرب خاتون، جس کی تیز بینی ضرب المثل بن گئی ہے۔ عربی زبان کا ایک مقولہ ہے 'ابصر من زرقا' یعنی زرقا سے بھی زیادہ تیز بین۔ مشہور ہے کہ یہ عورت دو یا تین دن کی مسافت سے ہی سواروں کو پہچان لیتی تھی۔ اردو میں اس کے لیے دیدۂ زرقا اور چشمِ زرقا کی تلمیح مروج ہے۔

تراسمند ہے وہ تیز رو کہ وقتِ خرام
نظر ہو دیدۂ زرقا کی بھی نہ اس کی نظیر
(ذوقؔ)

● زرہِ داؤدی: تفصیل 'اعجاز داؤدؑ' کے تحت دیکھیں۔

● زلالِ بقا، زلالِ خضر، زلالِ زندگانی: تفصیل 'آبِ بقا' کے تحت دیکھیں۔

● زلفِ ایاز: تفصیل 'محمود و ایاز' کے تحت دیکھیں۔

● زنانِ مصر:

عزیزِ مصر نے رسوائی اور بدنامی سے بچنے کے لیے یوسف اور زلیخا کے معاملے کو 'بات آئی گئی ہوگئی' سمجھ کر ختم کر دیا تھا مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی۔ عشقِ زلیخا اور اس کی بے حجابی کا چرچا شاہی خاندان کی عورتوں میں جا پہنچا۔ امرا کی عورتیں زلیخا پر طعن و تشنیع کرتیں کہ عزیزِ مصر کی بیوی کس قدر بے حیا ہے کہ اپنے غلام پر ہی ریجھ گئی، یہ تو صریح بدچلنی میں پڑ گئی ہے۔ حالانکہ بعض روایتوں کے مطابق یوسف کے بے مثال حسن و جمال کا شہرہ، جس عورت کے کان میں پڑتا تھا، یوسف کے دید کا اشتیاق اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگتا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ زلیخا پر طعن و تشنیع کرنے والوں کے دلوں میں یہی غرض پوشیدہ ہو کہ زلیخا کو غصہ دلا کر کوئی ایسی سبیل پیدا کی جائے جو دیدارِ یوسف کا سبب بن جائے۔

بہر حال طنز و تشنیع کے یہ تیر زلیخا کے کانوں تک بھی پہنچے۔ اس نے مصر کی عورتوں سے انتقام لینے کی سوچی اور ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ جب مسندیں آراستہ ہو چکیں اور دستور کے مطابق سب نے اپنے ہاتھوں میں چھریاں پکڑ لیں تو عزیزِ مصر کی بیوی نے اپنے اسی زر خرید غلام کو سرِ مجلس آنے کا حکم دیا۔ جیسے ہی مالکہ کے حکم سے یوسفؑ جلوہ آرا ہوئے، جمالِ یوسفؑ کی تابانی سے مصری عورتیں مبہوت ہو گئیں اور ترنج کاٹنے کے بجائے اپنی اپنی انگلیاں زخمی کر بیٹھیں۔

یوسف کا ہور قصہ زلیخا کا جگ بھریا
ہم تم کو دیکھ کاٹ لیے ہاتھ جوں ترنج
(قلی)

وہ سب بے ساختہ پکار اٹھیں بخدا یہ انسان نہیں فرشتۂ نور ہے یہ سن کر عزیزِ مصر کی بیوی بہت محظوظ ہوئی اس نے اپنا انتقام پا لیا تھا۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
(غالب)

عزیز مصر کی بیوی نے دیکھا کہ اس کی چال کامیاب رہی ہے اور عورتیں یوسف کے جلوۂ جہاں آرا سے مدہوش ہوگئی ہیں تو وہ کہنے لگی کہ اس کی ایک جھلک سے تمھارا یہ حال ہوگیا ہے کیا اس غلام سے محبت کرنے پر اب بھی طعنہ زنی اور ملامت کروگی؟

عورتوں سے حوصلہ افزائی پا کر ایک مرتبہ پھر اس نے ارادۂ بد کا اظہار کیا اور دھمکی آمیز لہجہ میں کہنے لگی کہ اگر یہ میرا کہا نہ مانے گا تو قیدی ہونے کی ذلت اور رسوائی سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ صبر واستقامت کا پتلا اور پیغمبرانہ شان کا حامل یوسفؑ اپنی جگہ اٹل رہا اور جواب دیا 'قید خانہ مجھے پسند ہے لیکن راستی سے منحرف ہونا میں پسند نہیں کرتا۔' عزیز مصر پر اگرچہ یوسفؑ کی راست بازی اور پاکبازی کے جوہر کھل چکے تھے اور وہ اپنی بیوی کی گمرہی اور مکر وفریب سے بھی آشنا تھا لیکن وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ یوسفؑ کو حوالہ زندان کردے۔ چنانچہ اس نے یوسفؑ کو قید خانہ میں ڈال دینے کا حکم صادر فرما دیا۔

● زنبیلِ عمرو:

خواجہ عمرو، داستانِ امیر حمزہ کا ایک کردار ہے جو عیاری اور مکاری میں بے مثال اور تمام عیاروں کا سردار تھا۔ اس کا لقب 'ریش تراشندۂ کافراں وسر برندۂ جادوگراں' تھا۔ اپنی عیاری اور مکاری میں طاق ہونے کی وجہ سے وہ مختلف محاذوں پر کامیابی سے ہم کنار ہوتا تھا۔ عمرو عیار کو پیغمبروں اور بزرگوں نے مختلف عجائبات اور بیش بہا تحائف عطا کیے تھے جن کی بدولت اس کی عیاری میں چار چاند لگے تھے۔ انھی تحائف میں ایک زنبیل بھی تھی۔ زنبیل کا لفظ 'جھولی'، 'ٹوکری'، 'تھیلی' اور 'کاسۂ گدائی' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس زنبیل کا کمال یہ تھا کہ اس میں ایک دنیا آباد تھی، اس کے اندر خواہ کتنے ہی حجم کی چیز ڈال دو، سما جائے گی۔ زنبیل، عمرو کے بدن سے چپکی رہتی تھی کوئی اسے لینا چاہتا تو نظروں سے غائب ہوجاتا۔ اس کے اندر سات شہر آباد تھے، سات دریا بہتے تھے۔ اس سلطنت میں

خواجہ عمرو کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ عمرو نے عیاری کے زور سے اس زنبیل میں ہزاروں کفار و شیاطین، جنات اور ساحروں کو قید کر رکھا تھا۔ ان قیدیوں سے انتہائی مشقت کے کام لیے جاتے، کھیتی باڑی کرائی جاتی۔ غرض یہ کہ خواجہ عمرو اس زنبیل کا بے تاج بادشاہ تھا۔ چوں کہ عمرو نہایت درجہ حریص اور لالچی تھا اس لیے وہ زنبیل میں ہر قسم کا سامان رکھ چھوڑتا تھا اس کے باوجود وہ کبھی پُر نہ ہوتی تھی۔ اس کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ ہزارہا اشیا کے درمیان سے مطلوبہ شے بہ وقت ضرورت فوراً باہر نکل آتی تھی۔ اب تلمیحاً عمرو کی زنبیل ہر اس شے کو کہا جاتا ہے جو کبھی پُر اور آسودہ نہ ہوتی ہو اور اس میں ہر چیز سما جاتی ہو۔

آدھ سیر آٹے کا خدا ہے کفیل
پیٹ اس کا ہے عمرو کی زنبیل
(سوداؔ)

درِ معنی سے مرا صفحہ: لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ: عمرو کی زنبیل
(غالبؔ)

- زنجیرِ عدل: تفصیل 'عدل نوشیرواں' کے تحت دیکھیں۔
- زندانِ یوسف: تفصیل 'تعبیرِ یوسفی' کے تحت دیکھیں۔
- زہرہ: تفصیل 'چاہِ بابل' کے تحت دیکھیں۔
- ساغرِ جم: تفصیل 'جامِ جمشید' کے تحت دیکھیں۔
- ساقیِ کوثر: تفصیل 'کوثر و تسنیم' کے تحت دیکھیں۔
- سحرِ سامری، طلسمِ سامری، گوسالۂ زر:

فرعونیوں سے نجات پانے کے بعد بنو اسرائیل جب جزیرہ نمائے سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو آئینِ الٰہی دینے کی غرض سے کوہِ طور پر بلا بھیجا۔ طور پر جانے کا یہ

دوسرا موقع تھا۔موسیٰ چالیس راتوں کے لیے کوہِ طور پر چلے گئے اور اپنی جگہ حضرت ہارون کو خلیفہ مقرر کر دیا کہ وہ بنواسرائیل کے احوال کی نگرانی کرتے رہیں گے۔موسیٰ ادھر خدا سے ہم کلامی میں مصروف تھے،ادھر میدان خالی دیکھ کر،قومِ موسیٰ کے ایک فرد سامری نے بنواسرائیل کو ایک نئے فتنے میں مبتلا کر دیا۔سامری بظاہر موسیٰ کا پیرو تھا مگر اس کے باطن میں شرک اور اس کی نجاست بھری ہوئی تھی۔سامری نے بنواسرائیل سے کہا کہ اگر تم لوگ وہ تمام زیورات جو مصر سے اپنے ساتھ لائے ہو میرے پاس لے آؤ تو میں تمھارے فائدے کی ایک بات کروں۔تمام لوگوں نے اپنے اپنے زیورات سامری کے پاس لا کر اکٹھا کر دیا،اس نے ان کو بھٹی میں ڈال کر گلا دیا اور سونے کا ایک بچھڑا تیار کر دیا۔

کھلائے نہ کیوں سرمہ گو سالہ کو
خجل سامری چشمِ پرفن سے ہے
(مومنؔ)

جب بچھڑا تیار ہو گیا تو سامری نے ایک مشتِ خاک اس کے اندر ڈال دی۔ بچھڑے میں آثارِ حیات پیدا ہو گئے اور وہ 'بھائیں بھائیں' کرنے لگا۔

چلتا ہوا ہے افسوں، اڑتا ہوا چھلاوہ
پھر اس کے آگے بڑھ کر کیا سحرِ سامری ہو
(ذوقؔ)

سامری نے یہ مٹی جبرئیل کے گھوڑے کے قدموں کے نیچے سے اس وقت حاصل کر لی تھی جب موسیٰ اور بنواسرائیل بحرِ قلزم عبور کر رہے تھے اور فرعون اور اس کا لشکر ان کے تعاقب میں آ رہا تھا تو جبرئیل،فرعون اور موسیٰ کے درمیان حائل ہو گئے تھے۔سامری نے دیکھا کہ جہاں جہاں گھوڑے کے قدم پڑتے ہیں،خشک زمین پر سبزہ اگ آتا ہے اور اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔اس نے فوراً مٹھی بھر مٹی اپنے پاس محفوظ کر لی۔بعد میں وہی مٹی جب اس نے بچھڑے میں ڈالی تو بچھڑا آوازیں نکالنے لگا۔

اب سامری نے قوم کے افراد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''تمھارا معبود تو یہ ہے، موسیٰ بھول گئے ہیں اور معبود کی تلاش میں کوہِ طور پر گئے ہیں''۔ سامری کی اس ترغیب سے بنو اسرائیل فوراً قائل ہو گئے اور گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ حضرت ہارون نے ہر چند ان کو روکنا چاہا مگر ان کو اپنے ارادے میں کامیابی نہ ملی۔

ادھر حضرت موسیٰ کو بذریعہ وحی، سامری کے اس سوانگ کی خبر دے دی گئی وہ غصے کے عالم میں واپس آئے اور ہارون سے استفسار کرنے لگے۔ فرطِ جوش میں موسیٰ نے ہارون کی ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑ لیے۔ بعد میں وہ سامری سے مخاطب ہوئے اور اس کے بچھڑے کے طلسم کو توڑ ڈالا۔

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری
(اقبالؔ)

اور سامری کو بد دعا دی جس کے نتیجے میں جب کوئی آدمی سامری کے پاس آتا تو سامری اس سے کہتا 'مجھے نہ چھو' چھونے والا شخص اور سامری دونوں بخار میں مبتلا ہو جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ بعد میں سامری انسانوں کی بستی سے نکل کر جنگل میں چلا گیا جہاں اس کی باقی زندگی جانوروں کے ساتھ گزری۔[26]

سامری کی قومیت اور نام کے بارے میں مولانا آزاد کی تحقیق کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے: ''سامری قومِ سمیری کا ایک فرد تھا، عربی میں اسی کو سامری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ عراق میں اب بھی اس قوم کے افراد اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔ حضرت مسیح سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے دجلہ و فرات کے دوآبے میں دو مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں اور ایک نئے تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک قوم عرب تھی، یہ جنوب سے آئی تھی، دوسری قوم شمال سے اتری تھی، یہ سمیری قوم تھی۔ تاریخ قدیم کے شہر سامرہ اور اُر اسی قوم کی یادگار ہیں۔ بہر حال سمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا

مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مصر سے ان کے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آچکا ہے پس معلوم ہوتا ہے کہ اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ کا بھی معتقد ہو گیا اور جب بنو اسرائیل مصر سے نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ اسی کو قرآن نے 'السامری' کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ گائے، بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی۔ گویا اب صاف ہو گیا ہے کہ سامری ایک شخص کا نام نہ تھا بلکہ اس کی قومیت کا اسمِ نسبتی تھا۔ (27)

● سخائے حاتم: تفصیل 'حاتم طائی' کے تحت دیکھیں۔

● سدسکندری:

ایسی مضبوط، بلند، پائیدار اور مستحکم دیوار کو کہتے ہیں جو نا قابل عبور ہو اور شکست و ریخت کی خامیوں سے یکسر بے نیاز ہو۔ درحقیقت یہ مضبوط دیوار، ایران کے مشہور بادشاہ ذوالقرنین نے اپنی سلطنت کے شمالی علاقے میں تعمیر کرائی تھی۔ اس علاقے کے باشندوں نے ذوالقرنین سے ایک ایسی سد تعمیر کرادینے کا مطالبہ کیا تھا، جس سے وہ لوگ یاجوج ماجوج قبائل کی فتنہ انگیزیوں، قتل و غارت گری اور ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ چنانچہ ذوالقرنین نے ان لوگوں کی درخواست پر یہ مضبوط دیوار تعمیر کرائی تھی۔ یہ دیوار اتنی پائیدار اور مستحکم تھی کہ یاجوج و ماجوج جیسے وحشی، خونخوار اور قتل و غارت گری میں یکتا قبائل کے لیے اس کا توڑنا ممکن نہ ہو سکا۔ دیوار کی مضبوطی کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ یاجوج وماجوج نہ تو اس پر چڑھنے میں کامیاب ہو سکے اور نہ ہی اس کی شکست و ریخت کا کوئی راستہ نکال سکے۔ اس طرح سے ذوالقرنین کی قلمرو کا شمالی حصہ یاجوج و ماجوج کے فتنوں سے ہمیشہ کے لیے مامون و محفوظ ہو گیا۔

یاجوج ہو رقیب جب آیا سجن کے پاس
پیدا کیا حجاب سکندر کی، سد کے تئیں

(ولی)

سد سکندری کے نام سے مشہور یہ دیوار، ایران کے اس مشہور بادشاہ نے بنوائی تھی، قرآن نے جس کو ذوالقرنین کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ کچھ مورخین اس مشہور سد کا انتساب مشہور بادشاہ سکندر رومی کی جانب کرتے ہیں جو تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے؛ کیونکہ یہ سد شمال کے جس علاقے میں واقع ہے، سکندر رومی کا علاقہ وہاں سے انتہائی دوری پر واقع تھا اور سکندر کا گزر بھی اس علاقے سے کبھی نہیں ہوا تھا، مزید ایک بات اور کہ سکندر رومی کے عہد کا کوئی بھی واقعہ اہلِ تاریخ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سد کو سد سکندری کیوں اور کب سے کہا جاتا ہے؟ یہ نکتہ اپنے آپ میں ایک بحث طلب مسئلہ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشہور صاحب مغازی محمد بن اسحاق نے سب سے پہلے اپنی سیرت میں ذوالقرنین کا نام سکندر نقل کردیا ہے اور چونکہ ان کی سیرت بہت مشہور و مقبول ہے اس لیے ذوالقرنین کے ساتھ ساتھ سکندر کا نام بھی شہرت پا گیا۔ گویا اس طرح ذوالقرنین کو سکندر کہا جانے لگا اور اس کے ذریعہ تعمیر کرائی گئی سد کو سد سکندری کا نام دیا گیا۔

لطافت طبع کی تھی مثل سیل آب آئینہ
مگر اس سیل کو روکے ہوئے تھی سد اسکندر
(نظم طباطبائی)

ادھر تاریخ کا ایک اور بادشاہ سکندر نام کا روم کی سرزمین سے اٹھا، دنیا اسے سکندر اعظم کے نام سے جانتی ہے اس کی فتوحات کا دائرہ بھی بے حد وسیع و عریض تھا اور ایک زمانے میں تو وہ دو مشہور بادشاہتوں روم و فارس کا حکمران ہوگیا تھا اس لیے بعض لوگوں نے اس اعزاز کی بنیاد پر اس کو بھی ذوالقرنین کہنا شروع کردیا۔ اس کا نام تو سکندر تھا ہی، ذوالقرنین کے لقب نے مل کر قرآن کے ذوالقرنین اور سکندر اعظم کے امتیاز کو ختم کردیا؛ اب یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی نام سکندر ذوالقرنین کے نام سے مشہور ہوگئیں اور ذوالقرنین کی تعمیر کرائی گئی دیوار کو سکندر رومی کی جانب منسوب کردیا گیا۔ جب کہ حقیقت

واقعہ یہ ہے کہ یہ دیوار سکندر اعظم کی دین نہیں ہے بلکہ ایران کے مشہور بادشاہ گورش کی دین ہے۔ یہ وہی بادشاہ ہے، یہودی جس کو خورس، یونانی سائرس، فارسی گورش اور کے ارش اور عرب کیخسرو کے نام سے جانتے ہیں۔ ایرانی تاریخ کے عہد زریں کا یہی وہ بادشاہ ہے قرآن نے جس کو ذوالقرنین کا لقب عطا کیا ہے۔ تاریخ میں گورش کے علاوہ اور کوئی ایسا بادشاہ نہیں گزرا جس کا عہد، تاریخی مہمات، فوجی اقدام، فتوحات، عدل وانصاف اور سب سے بڑھ کر وہ تین اہم مہمات جس کا ذکر قرآن نے بڑی تفصیل اور وضاحت سے کیا ہے، ہو بہو قرآن اور تاریخ کی بیان کردہ حقیقتوں سے میل کھاتا ہو۔ یہ تمام واقعات، معرکہ آرائیاں اور حسن انتظام کی خصوصیتیں صرف اسی ایک بادشاہ پر صادق آتی ہیں۔ تورات اور قدیم وجدید تاریخی حوالوں اور عہد حاضر کی تحقیقات کی روشنی میں یہی بادشاہ ذوالقرنین ہے اور اس کے ذریعہ تعمیر کرائی گئی سد کو سد سکندری کہا جاتا ہے۔

سد سکندری کے بانی کی تعیین کے بعد اب اس دیوار کے محل وقوع کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دیوار کہاں اور کس جگہ تعمیر کی گئی تھی۔ چنانچہ اس بات کی تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ مختلف زمانوں میں مختلف مقامات پر مختلف سدیں تعمیر ہوئی تھیں اور ان تمام سدوں کی تعمیر کی غرض ایک تھی، یاجوج وماجوج کی دست برد سے اپنی حفاظت کرنا۔ دراصل یاجوج وماجوج کی تاخت وتاراج اور قتل وغارت گری کا دائرہ اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ ایک طرف تبت اور چین کے باشندے ان کی لوٹ مار اور رہزنی کا شکار تھے تو دوسری جانب کاکیشیا اور کوہِ قاف کی وادیوں میں رہنے والے بھی ان کی ستیزہ کاریوں سے محفوظ نہیں تھے۔ چنانچہ اسی غرض کے حصول کے لیے الگ الگ سدیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک سد تو وہ ہے جو دیوارِ چین کے نام سے مشہور ہے یہ دیوار تقریباً ایک ہزار میل طویل ہے۔ دوسری سد وسط ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے اور اس کے محل وقوع کا نام دربند ہے، یہ سد مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں بھی موجود تھی۔ تیسری سد، روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور

ہے اور جب اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں بڑھتے ہیں تو ایک درہ ملتا ہے جو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور یہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے ہو کر گزرا ہے، یہاں ایک چوتھی سد ہے جو قفقاز یا جبلِ قوقایا جبلِ قاف کی سد کہلاتی ہے اور یہ سد دو پہاڑوں کے درمیان بنائی گئی ہے۔

تو اب دیوارِ چین کو چھوڑ کر باقی تین سدوں میں سے اصلی سد سکندری کون ہے؟ یہ ایک دلچسپ اور اہم مسئلہ ہے۔ دیوارِ چین کے بارے میں تو دنیا جانتی ہے کہ اس کو تیسری صدی قبل مسیح میں چین کے بادشاہ کن شی ہوانگ نے بنوایا تھا۔ دیوارِ چین کے علاوہ باقی تین سدوں میں سے دربند والی سد کے بارے میں لکھا ہے کہ اس دیوار میں آہنی پھاٹک لگے ہوئے ہیں اور یہ دیوار پتھر اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے اور آہنی دروازوں کے علاوہ کسی جگہ بھی لوہے اور تانبے کا استعمال نہیں کیا گیا ہے اس کے علاوہ اس دیوار کا ایک حصہ سطحِ زمین پر بھی بنایا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف دو پہاڑوں کی چوٹیوں کے درمیان ہی قائم کی گئی ہو۔

دوسری سد کے بارے میں جو دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے، کہ اس دیوار کا بہت بڑا حصہ سطحِ زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اور آگے بڑھ کر پہاڑ پر بھی بنایا گیا ہے۔ یہ دیوار بعض مقامات پر دہری بھی ہے اور اس میں متعدد لوہے کے پھاٹک لگے ہوئے ہیں تاہم یہ دیوار لوہے کے ٹکڑوں اور تانبے سے نہیں بنائی گئی بلکہ عام دیواروں کی طرح پتھر اور چونے سے ہی تعمیر کی گئی ہے۔ پس یہ دیوار کچھ اور تو ہو سکتی ہے سد سکندری نہیں ہو سکتی۔

تیسری سد وہ ہے جو دربند یا باب الابواب سے مغرب کی جانب آگے بڑھتے ہوئے ایک درے میں ملتی ہے، یہ جگہ درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور قفقاز اور تفلس کے درمیان واقع ہے یہ درہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے ہو کر گزرا ہے اور قدرتی طور پر پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اسی درے کو لوہا اور تانبا پگھلا کر ایک سد کے ذریعہ بند کر دیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہی دیوار وہ سد ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن نے

کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے بتائے ہوئے دونوں وصف اسی ایک دیوار پر صادق آتے ہیں۔ یہی وہ مضبوط اور پائدار دیوار ہے، یاجوج وماجوج جسے عبور نہ کر سکے اور اس کی مضبوطی اور استحکام نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلی۔

بھروسا ہر کسی کو اک حصارِ عافیت کا ہو
مجھے نام مبارک کا ہے، ذوالقرنین کو سد کا
(شہیدی)

ملکِ دانش میں ہو کیا جہل کے یاجوج کا دخل
قوتِ عقل سے کھینچی ہے سد اسکندر
(امیر)

● سرچشمۂ حیواں: تفصیل 'آب بقا' کے تحت دیکھیں۔

● سروش: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔

● سفینۂ نوح: تفصیل 'کشتی نوح' کے تحت دیکھیں۔

● سکندر:

تاریخِ عالم اور تاریخِ ادب میں سکندر کی شخصیت بڑی پہلودار رہی ہے۔ تاریخی روایتوں کی روشنی میں سکندر یونان کا بادشاہ تھا جو فلپس کا بیٹا تھا اور اس نے اپنی مختصر سی تینتیس سالہ زندگی میں ایران وہندوستان کو مسخر کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی دنیا کے کئی ممالک اس کے تصرف میں آچکے تھے۔ اپنی عظیم الشان فتوحات کی بدولت سکندر جہاں گیری اور جہاں گردی کا استعارہ بن گیا ہے۔

مجھ گدا نے بھی کسی شاہ سے ڈالا نہ سوال
گو مجھ بخت نے اسکندر و دارا نہ کیا
(سودا)

سکندر 356 قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ ابھی بمشکل بیس برس کا تھا کہ 336 قبل مسیح

میں تخت نشین ہوااور دنیا کو فتح کرنے کے لیے نکل پڑا۔ 326 قبل مسیح میں اس نے ایران کے بعد ہندوستان کا رخ کیا اور ہندستانی راجا پورس سے جنگ آزما ہوا۔323 قبل مسیح میں اس نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اسلامی اور قدیم فارسی تاریخ میں یہی شخص سکندر رومی کے نام سے معروف ہے۔

سکندر ہو کے مالک سات اقلیموں کا آخر کو
گیا دستِ تہی لے یاں سے یہ کچھ کر گیا حاصل
(میر)

● سگ اصحابِ کہف: تفصیل 'اصحاب کہف' کے تحت دیکھیں۔

● سلسلۂ نوشیرواں: تفصیل 'عدل نوشیرواں' کے تحت دیکھیں۔

● سلیمان علیہ السلام:

حضرت سلیمان، حضرت داؤد کے صاحبزادے تھے۔خدا نے آپ کو فصلِ مقدمات کے سلسلے میں بہترین مشورہ دینے کا اور مقدمات کے منطقی نتیجوں تک پہنچنے کا خاص ملکہ بچپن سے ہی عطا کیا تھا۔ان کے اسی ملکۂ خداداد کے باعث حضرت داؤد امورِ مملکت میں انھیں ساتھ رکھتے تھے۔ خاص طور پر مقدمات کے فیصلوں میں ان کی رایوں کو خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ حضرت سلیمان رفتہ رفتہ امورِ مملکت میں خاصے ماہر اور تجربہ کار ہو گئے تھے چنانچہ جب داؤد نے پیغامِ اجل کو لبیک کہا تو نبوت وحکومت کی ساری ذمہ داریاں حضرت سلیمان کے کاندھوں پر آ ئیں۔

جس طرح حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ نے بعض خصوصیات اور نشانِ امتیاز سے نوازا تھا اسی طرح حضرت سلیمان کو بھی کچھ ایسی خصوصیتیں اور پیغمبری نشان عطا کیے گئے تھے جو ان کی نبوت وحکومت کا طغرائے امتیاز بن گئی تھیں۔ حضرت سلیمان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی پرعظمت وپرشکوہ سلطنت بخشی تھی جو نہ تو ان سے قبل کسی کو عطا کی گئی تھی اور نہ ان کی موت

کے بعد کوئی اور اس جیسی حکومت کا بادشاہ ہو سکے گا۔ حضرت سلیمان کی شہنشاہی اور حکومت ان کی دعاؤں کے طفیل عطا کی گئی تھی۔ ان کی حکومت کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ ہوا، پہاڑ، چرند پرند، حیوانات اور جنات سبھی ان کی فرماں روائی میں شامل تھے اور یہ تمام مخلوقات، ایک فرماں بردار عوام کی طرح حکومت کے کاموں میں ہاتھ بٹاتیں اور اپنے اپنے فرائض کو انتہائی مستعدی، ایمانداری اور نظم وضبط کے ساتھ ادا کرتیں۔ حضرت سلیمان ان تمام غیر انسانی مخلوقات کی بولیاں بھی سمجھتے تھے، عام حالات میں جن کی تفہیم ناممکن مانی جاتی ہے۔

گر سلطنت سلیماں کی ہے محیطِ عالم
ہم نے بھی اپنے دل کا گھیرا ہے ایک کونا
(سودا)

حضرت سلیمان کی زندگی، حکومت اور حکومت کے دائرۂ کار میں اتنی وسعت و گہرائی اور تحیر خیزی ہے کہ تلمیحات کے زاویے سے ایسے بے شمار پہلو اور گوشے ہیں جہاں شاعروں کی دور رس نگاہوں نے رسائی پائی ہے مثلاً ہوا کے دوش پر تختِ سلیمان کا چلنا، جنات کا مطیع وفرماں بردار ہونا، پیغامات کی ابلاغ وترسیل کا اچھوتا طریقہ، ہدہد، ملکۂ سبا کا ذکر اور چشم زدن میں اس کا تخت دربارِ سلیمانی میں لا پہنچانا، حضرت سلیمان کا شیش محل وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ داستانوں کی تحیر خیزیاں ہوں یا مافوق الفطری عناصر کی موجودگی، زندگی سے بھرپور ان کے حیرت انگیز کارنامے ہوں یا ان کی معرکہ آرائیاں، حکومت و شہنشاہی کی جلوہ سامانیاں ہوں یا اربابِ حکومت کی داروگیر سلیمان کی زندگی کے واقعات داستانوں کے عناصرِ ترکیبی سے بھرے ہوئے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس واقعے میں تلمیحات کے کچھ خاص پہلو سامنے آتے ہیں۔

دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی
جا کشورِ ایراں میں سلیماں سو کہوں گا
(ولی)

● سوزنِ عیسیٰ:

حضرت عیسیٰ کو خدائے تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا تھا اور اب وہ آسمان پر خدائے تعالیٰ کی بندگی میں مصروف ہیں اور قربِ قیامت میں زمین پر تشریف لائیں گے؛ دجال کو قتل کریں گے۔

حضرت عیسیٰ آسمان پر تشریف فرما ہیں لیکن کس آسمان پر موجود ہیں؟ اس بارے میں محققین اور مفسرین میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ چوتھے آسمان پر موجود ہیں، ایک روایت میں ذکر ہوا ہے کہ ان کا مستقر تیسرا آسمان ہے۔ حدیث معراج میں آیا ہے کہ اللہ کے رسول کی ملاقات حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے دوسرے آسمان پر ہوئی تھی۔ اردو ادب میں حضرت عیسیٰ کا مستقر آسمانِ چہارم متعین کیا گیا ہے۔

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے
(آتش)

سورج بھی چوتھے آسمان پر چمکتا ہے اسی لیے عیسیٰ اور سورج کی ہمسائیگی کی تلمیح بھی مستعمل ہے۔ حضرت عیسیٰ چوتھے آسمان سے آگے نہ جا سکے تھے، اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ چونکہ ان کے جامے (پیرہن) میں ایک سوئی الجھی رہ گئی تھی اور یہ عالم اسباب کا ضمیمہ تھا، اس لیے انھیں چوتھے آسمان سے آگے جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

سوزنِ عیسیٰ سے رم کرنے لگے قدوسیاں
یہ ضمیمہ رہ گیا تھا عالمِ اسباب کا
(انشا)

بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ جس وقت عرشِ الٰہی کی جانب محوِ پرواز تھے، اثنائے راہ میں جبرئیل کو دیکھا۔ جبرئیل نے عیسیٰ سے پوچھا: یہ تمھاری عبا یا پیرہن میں کیا لگا ہوا ہے؟ عیسیٰ نے کہا: سوئی ہے۔ جبرئیل نے عرض کیا کہ چونکہ آپ کے ساتھ عالم ظاہر کی

ایک شے آ گئی ہے اس لیے آپ آگے نہ بڑھیں اور یہیں ٹھہر جائیں؛ حضرت عیسیٰ وہیں ٹھہر گئے۔ اور جب سے ان کا مستقر اور قیام گاہ آسمانِ چہارم ہے اور وہ وہیں عبادتِ الٰہی میں مصروف ہیں۔

سوزن و رشتے کی بدنامی تو لی، پر کیا حصول
کب کسی عاشق کے زخمِ دل کو عیسیٰ نے سیا
(سوداؔ)

ہم یقینی جوشِ وحشت سے فلک پر پہنچتے
خار دامن گیر پر عیسیٰ کی سوزن ہو گیا
(مومنؔ)

● شاہِ نجف: تفصیل 'علی' کے تحت دیکھیں۔

● شبانی (گلہ بانی):

حضرت موسیٰ پہلی بار جب مصر سے نکلے تھے تو سیدھے مدین پہنچے۔ مدین کی آبادی مصر سے آٹھ منزل پر واقع تھی۔ موسیٰ جیسے ہی مدین کی سرزمین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک کنویں سے بستی کے تمام لوگ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں، صرف دو لڑکیاں الگ انتظار میں کھڑی ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہیں۔ موسیٰ نے ان سے استفسارِ حال کیا تو لڑکیوں نے جواب دیا کہ یہ طاقتور لوگ پہلے خود اپنے جانوروں کو پانی پلا لیتے ہیں اور پھر باقی ماندہ پانی ہمارے حصے میں آتا ہے یہی روز کا معمول ہے۔ ہمارے والد کمزور اور ضعیف ہیں اس لیے وہ خود یہاں تک نہیں آسکتے۔ موسیٰ مظلومیت اور زبردستی کے حامی تو تھے ہی، فوراً ڈول لیا اور کنویں سے پانی نکال کر لڑکیوں کے جانوروں کو سیراب کر دیا۔ لڑکیاں اپنے گھر روانہ ہو گئیں۔ چونکہ لڑکیاں معمول سے بہت پہلے گھر پہنچ گئی تھیں، ان کے والد کو تعجب ہوا ان کے استفسار پر لڑکیوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ باپ نے کہا جاؤ، اس کو میرے پاس لے آؤ۔

لڑکی برق رفتاری سے موسیٰ کے پاس پہنچی۔ موسیٰ سفر کی شدت سے تھکے ماندے، بھوک سے نڈھال، فوراً ہی ساتھ ہو لیے۔ گھر پہنچے تو بزرگ نے کھانا کھلایا خوب خاطر تواضع کی اور موسیٰ کی زبانی ساری داستان سننے کے بعد گویا ہوئے کہ اب خوف کا کوئی مقام نہیں، خاطر جمع رکھو۔

لڑکیوں کے کہنے پر باپ نے موسیٰ کو مویشیوں کی گلہ بانی کے لیے ملازم رکھ لیا۔ اور یہ شرط رکھی کہ اگر تم آٹھ سال تک میری بکریاں چراؤ گے تو میں اپنی بیٹی کی شادی تمھارے عقد میں دے دوں گا اور اگر دس سال چراؤ گے تو یہ اور بھی اچھی بات ہوگی۔ یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا۔ حضرت موسیٰ برضا و رغبت تیار ہو گئے۔ وہ شیخِ مدین کی بھیڑ بکریاں چراتے رہے یہاں تک کہ دس سال کا عرصہ بیت گیا۔ مدین کے اسی بزرگ کی بیٹی سے ان کی شادی ہو گئی، مفسرین نے موسیٰ کی بیوی کا نام صفورہ بتایا ہے۔ بیشتر مفسرین نے شیخِ مدین کی تعیین حضرت شعیبؑ سے کی ہے اگرچہ قرآن نے شیخِ مدین کا نام نہیں بتایا ہے مگر ابن جریر طبری، حسن بصری اسی قول کو راجح قرار دیتے ہیں۔

اگر شعیب کوئی آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے
(اقبالؔ)

- شبدیز: تفصیل 'خسرو پرویز' کے تحت دیکھیں۔
- شجرِ ایمن، شجرِ کلیم: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔
- شجرِ ممنوعہ: تفصیل 'آدم' کے تحت دیکھیں۔
- شجرِ وادیِ ایمن: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔
- شداد:

شداد بن عاد عہدِ قدیم کا ایک جابر بادشاہ تھا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اس

بادشاہ کا سلسلۂ نسب شداد بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح بتایا گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت داؤد نے شداد کو اللہ کے دین کی دعوت دی تھی اور اس سے جنت کا وعدہ کیا تھا مگر شداد خدا کے دین کی طرف تو راغب نہیں ہوا مزید اس نے بہشت کی خوبیاں سن کر اس کے مقابل میں ایک جنت ارضی تعمیر کرائی تھی۔ بہشت کی جتنی خوبیاں اس نے سن رکھی تھیں یا اس کے حاشیۂ خیال میں آسکتی تھیں وہ تمام سہولتیں، آسائشیں اور تکلفات اس جنت ارضی میں موجود تھے۔ بڑے بڑے باغات، خوب صورت اور دل کش محلات میں سونے اور چاندی کا استعمال کیا گیا تھا۔ ان کی دلکشی اور خوب صورتی میں اضافہ کرنے کے لیے یاقوت اور بیش قیمتی پتھروں سے مدد لی گئی تھی۔ صاف شفاف روشوں کے متوازی دودھ اور شہد کی نہریں رواں تھیں۔ حور وغلمان کی جگہ خوب صورت لڑکے لڑکیوں کی خدمات لی گئی تھیں۔ غرضیکہ عیش وعشرت کا کوئی سامان ایسا نہیں تھا جو اس مصنوعی جنت میں موجود نہ ہو۔ شداد کی یہ مصنوعی جنت بہشتِ شداد، باغِ ارم، جنت ذات العماد اور قصر ارم کے ناموں سے مشہور ہے۔

ترے مکھ کے گلستاں کی اگر حوراں میں شہرت ہو
تو ہر یک مست ہو کر چھوڑ گلزارِ ارم نکلے
(ولیؔ)

آخر کار جب یہ جنت بن کر تیار ہوگئی تو شداد اسے دیکھنے کے لیے روانہ ہوا مگر ابھی وہ اس کے دروازے پر ہی پہنچا تھا کہ فرشتۂ اجل نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ اس جنت کے دیدار کی حسرت لیے اس دنیا سے چل بسا۔

کام شداد کے آیا نہ بہشت شداد
روح دوزخ میں پڑی بعد فنا جلتی ہے
(صباؔ)

پانوْ جنت میں نہ رکھا تھا کہ نکلی تن سے روح
بے کسی نے رو دیا منہ دیکھ کر شداد کا

اس زمین پر بہشتِ شداد کا کوئی وجود ہے؟ یا اس کی حیثیت زیب داستان سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتی، اس امر میں مفسرین اور محققین کی روایتوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کے بارے میں مبہم سا اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں: الم تر کیف فعل ربك بعاد☆ارم ذات العماد☆التی لم یخلق مثلها فی البلاد☆ (الفجر) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عادیوں کے ساتھ کیا کیا۔ ستونوں والے ارم کے ساتھ۔ جس کی مانند (کوئی قوم) ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی (ترجمہ)

بعض مفسرین انھی آیات سے بہشتِ شداد کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ کچھ مفسرین ارم کو عرب بادیہ کا ایک قبیلہ مانتے ہیں جو دیارِ عرب کے جنوب میں بود و باش رکھتا تھا۔ کچھ کا خیال ہے کہ ارم عاد اولیٰ کے ایک قبیلے کے ذریعہ بنائی گئی عظیم الشان عمارت ہے۔ کیونکہ یہ قوم مضبوط بنیادوں پر عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرنے میں مہارت رکھتی تھی۔ ایک فارسی محقق 'دہ خدا' نے اپنے لغت نامہ میں شداد کے ضمن میں یہ بیان کیا ہے کہ 'جالوت، جو حضرت داؤد کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچا تھا، چند شدادوں میں سے ایک تھا'، ایک خیال یہ بھی ہے کہ خداے تعالیٰ نے یہ جنت ارضی اس دنیا سے اٹھالی ہے اور اسے آٹھویں جنت یا اعراف کا نام دے دیا ہے۔

بہر حال ان اقوال کی روشنی میں بہشتِ شداد کے بارے میں کوئی حتمی اور فیصلہ کن رائے قائم کرنا ایک مشکل امر ہے لیکن تلمیح کے نقطۂ نظر سے باغِ شداد کا اطلاق صاف ستھرے، خوب صورت اور کاری گری میں بے مثال ایسے محلات اور باغات پر ہوتا ہے جس میں انسانی تخیل میں آنے والی تمام خوبیاں، آسائشیں اور تکلفات موجود ہوں۔

خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہمدوشِ ارم
جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبر کے قدم
(اقبالؔ)

● شرارۂ ایمن: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔

● شعلۂ ایمن، شعلۂ سینا: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔

● شعلۂ نمرود:

حضرت ابراہیمؑ نے قومی تہوار کے ایک موقعے پر جب ساری قوم میلے میں گئی تھی، اپنی قوم کے بت خانے میں جا کر سارے بت توڑ ڈالے تھے۔ خلیلِ بت شکن میں اسی واقعے کی تلمیح موجود ہے۔ بت شکنی کرنے کے بعد وہ باطمینان گھر چلے آئے ادھر جب لوگ میلے سے واپس آئے تو بتوں کا یہ حال دیکھ کر سخت برہم ہوئے، انھیں یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ یہ اسی نوجوان ابراہیمؑ کا کام ہے جو ہمارے دیوتاؤں سے بیزار ہے اور ان کے ساتھ خفیہ چال چلنے کی دھمکی بھی دے چکا ہے۔ کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سنا تو غم و غصے سے مشتعل ہو اٹھے۔ انھوں نے ابراہیمؑ کو پیش کرنے کا حکم صادر کیا، ابراہیمؑ ان کے سامنے حاضر کیے گئے۔ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ کاہنوں نے پوچھا 'کیوں ابراہیم؟ تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ کیا ہے' ابراہیم نے بڑی سادگی اور معصومیت سے جواب دیا کہ اس بڑے بت سے پوچھ لو اسی نے یہ کیا ہے''۔ ندامت اور شرمساری سے کاہنوں اور سرداروں کی گردنیں جھک گئیں وہ سمجھ گئے کہ ابراہیمؑ کا مقصد کیا ہے؟ وہ ہمارے بتوں کی لاچاری اور بے بسی ثابت کرنا چاہ رہا ہے۔ انھوں نے جھٹ پہلو بدلا اور ابراہیمؑ سے عداوت و دشمنی کا نعرہ بلند کر دیا اور بیک آواز کہہ اٹھے کہ اگر دیوتاؤں کی خوشنودی اور رضامندی چاہتے ہو تو اسے دہکتی ہوئی آگ میں جلا ڈالو تاکہ یہ قصہ پاک ہو۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شدہ شدہ یہ خبر بادشاہِ وقت کے کانوں تک پہنچیں۔ نمرود اس زمانے کا بادشاہ تھا۔ اس نے جب ابراہیمؑ کی تبلیغ و اشاعتِ دین اور بت شکنی کا واقعہ سنا تو آپے سے باہر ہو گیا کیونکہ ابراہیمؑ کے اس کام سے اس کی ربوبیت و ملوکیت پر

ضرب پڑتی تھی۔ اس نے ابراہیمؑ کو سر دربار حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ابراہیم دربار میں حاضر ہوئے تو نمرود نے باقاعدہ ان سے مناظرہ کیا، کہا کہ ایسا تیرے رب میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں۔ ابراہیم نے جواب دیا: میرا رب وہ ہے جو موت وحیات بخشتا ہے۔ نمرود نے جھٹ دو قیدیوں کو بلایا، ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کی جان بخش دی اور کہا یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ ابراہیم سمجھ گئے کہ نمرود کٹ حجتی پر آمادہ ہے۔ وہ گویا ہوئے میرا خدا سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھادے۔ نمرود یہ جواب سن کر مبہوت ہو گیا جب اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین سے بیزاری کا الزام لگا کر ابراہیم کو دہکتی ہوئی آگ میں جلا دینے کا حکم صادر کر دیا۔

اب نمرود اور قوم نے ابراہیمؑ کو سزا دینے کے لیے ایک مخصوص جگہ بنوائی اور اس میں مسلسل کئی دنوں تک آگ دہکائی گئی یہاں تک کہ اس کے شعلوں سے قرب وجوار کی چیزیں تک جھلسنے لگیں۔

نور تجھ رخسار کا سینے میں ہے نت جلوہ گر
مجمر دل آتشِ نمرود رکھتا ہے ہنوز
(ولی)

محمود نیازی نے لکھا ہے:

''شاید یہ دنیا کی سب سے شدید آگ تھی۔ اس آگ کے شعلے اتنے بلند تھے کہ اس پر سے پرندے بھی اڑ کر نہیں گزر سکتے تھے اور اس کی تپش سے چار چار فرلانگ تک کسی ذی روح کا رہنا محال تھا۔''(28)

مگر قرآن میں بہ صراحت اس کا ذکر کہیں نہیں ہے اور نہ ہی کسی تفسیر میں یہ بیان ملا کہ اس آگ کی شدت اور تاثیر سے پرندے بھی پر نہیں مار سکتے تھے۔ میرے خیال میں ہمیں اتنا یقین کرنا چاہیے کہ آگ انتہائی شدید تھی۔

جب بادشاہ اور قوم کو یہ کامل اطمینان ہو گیا کہ ابراہیمؑ کا اس آگ سے بچ نکلنا

محال ہے تب ایک منجنیق کی مدد سے ابراہیم کو اس دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا۔ ابراہیم کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آئی وہ عزم کا پہاڑ بن کر کھڑے رہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
(اقبالؔ)

برہ کی آگ میں دستا نہیں ہے فکر کچھ دل کوں
کہ جیوں غم نہیں ہے ابراہیم کو آتش میں جانے کا
(ولیؔ)

دنیا کی مادی قوت وسطوت کے برخلاف خدائے کارساز کی قوت وطاقت کا اظہار ابھی باقی تھا۔ پانی کو ٹھنڈک اور آگ کو تپش عطا کرنے والے خدا نے آگ کو حکم دیا کہ وہ اپنی تپش اور جلن کا اثر ابراہیمؑ پر نہ ہونے دے اور اس کے حق میں سلامتی کے ساتھ سرد پڑ جائے۔ آگ فوراً ہی ابراہیمؑ کے حق میں گل وگلزار ہوگئی اور ابراہیمؑ دہکتی آگ سے سالم و محفوظ باہر نکل آئے۔ آتش نمرود جس کی تپش، آس پاس کی چیزوں کو جھلسائے دے رہی تھی نہ صرف بے اثر ثابت ہوئی بلکہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر کے لیے گلستانِ خلیل اور گلزارِ ابراہیم بن گئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندے کو دشمنوں کی سازش سے بچالیا۔

یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
(فیضؔ)

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا
(اقبالؔ)

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
(اقبالؔ)

پیش دشمن نہ گزر حق سے، نہیں سانچ کو آنچ
بلکہ ہے آتشِ نمرود، گلستانِ خلیل
(ذوقؔ)

آتشِ آہ، بے اثر سے میری
آسماں، گلشنِ خلیل ہوا
(مومنؔ)

● شق قمر:

معجزہ شق القمر یعنی چاند کے پھٹ جانے کا معجزہ، نبی کریم ﷺ کے بڑے معجزات میں سے ایک ہے۔ کفارِ مکہ نے علمائے یہود سے دریافت کیا تھا کہ ہم کو محمد کی صداقت کا کیا نشان طلب کرنا چاہیے؟ علمائے یہود نے کہا کہ تم لوگ محمد سے یہ مطالبہ کرو کہ وہ چاند کے دو ٹکڑے کردے۔ الغرض کفار مکہ نے اللہ کے رسول کے سامنے یہ مطالبہ رکھا اور آپ نے انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کردیے۔ چاند کا ایک حصہ کوہِ حرا کے ایک طرف اور دوسرا حصہ دوسری طرف ہوگیا۔

مرا دل چاند اور تیری نگہ اعجاز کی انگلی
کہ جس کی یک اشارت سے مجھے شق القمر دستا
(ولیؔ)

اس معجزے کو صحابیوں کی ایک بڑی جماعت نے نقل کیا ہے، چنانچہ عبداللہ بن عمر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ 9 نبوت میں پیش آیا تھا اور وہ اس کے چشم دید گواہ تھے۔ بخاری و مسلم میں عبداللہ ابن مسعود کی روایت ہے کہ "رسول اللہؐ کے عہد مبارک میں چاند دو ٹکڑے ہوگیا، ایک ٹکڑا پہاڑ کے ادھر اور دوسرا اس سے نیچے تھا؛ رسول اللہؐ نے فرمایا: دیکھو گواہ رہنا"۔ ایک اور صحابی حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ "اہل مکہ (کفار) نے نبیؐ سے درخواست کی تھی کہ ان کو کوئی بڑا نشان دکھایا جائے۔ نبیؐ نے انھیں چاند کا پھٹنا دکھلایا۔ اس کے دو ٹکڑے تھے، کوہِ حرا ان دونوں کے درمیان تھا"۔ ابن مسعود کی

ایک اور روایت ہے کہ ''جب چاند پھٹا تو اس وقت ہم بھی مع دیگر صحابہ کے حضور کی خدمت میں حاضر تھے''۔ جبیر بن مطعم کی روایت ہے کہ ''ہم مکہ میں تھے جب شقِ قمر کا واقعہ پیش آیا''۔

اس معجزے کا ذکر قرآن شریف میں بھی کیا گیا ہے۔ اگر چہ بعض لوگ اس معجزے کا انکار کرتے ہیں مگر ان کے انکار کی پشت پر کوئی روشن اور واضح دلیل نہیں ہے جب کہ اس واقعے کو مختلف صحابۂ کرام نے اپنی اپنی روایتوں میں بیان کیا ہے۔ جہاں اللہ کے رسول کو اور بھی بہت سارے معجزے عطا کیے گئے تھے انھیں میں سے ایک روشن اور واضح معجزہ یہ بھی تھا کہ آپ نے انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے تھے۔

جنگ میں کرتی ہے یہ تیغ، سپر دو ٹکڑے
جس طرح چرخ پہ انگشتِ پیمبر نے قمر
(امیرؔ مینائی)

- شمعِ ایمن: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔
- شہادتِ حسین:

حضرت امام حسین کی شخصیت اور کردار پر خوش اعتقادی اور عقیدت مندی کی اتنی دبیز چادر پڑی ہوئی ہے کہ ان کی شخصیت ایک اسلامی شخصیت سے زیادہ ایک قومی ہیرو، شجاعت وجواں مردی کے پیکر اور مافوق الفطرت خوبیوں کے حامل ایک ایسے مردِ خدا کی شخصیت رہی ہے جسے انتہائی بے بسی، لاچاری اور مظلومی کی حالت میں شہید کیا گیا تھا۔ امام حسین کا نام فارسی اور اردو ادب میں شجاعت و مظلومیت اور جاں سپاری کا استعارہ ہے جس نے حق کی بقا اور استحکام کے لیے اپنی جان دے دی مگر ظالم بادشاہِ وقت کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
(محمد علی جوہرؔ)

تاریخ اسلام کی روشنی میں امام حسین کی شخصیت یہ ہے:

''وہ رسولِ کریمؐ کے نواسے اور حضرت علیؓ کے چھوٹے بیٹے تھے۔ حسین اور شبیر دونوں نام تھے، ابوعبداللہ کنیت اور ریحانۃ النبی لقب تھا۔ ولادت جنوری 626ء میں مدینہ میں ہوئی۔ حضرت امیر معاویہ کے بعد جب ان کا لڑکا یزید تخت نشین ہوا تو اس نے حضرت امام حسین سے اپنی بیعت چاہی۔ آپ نے انکار کر دیا کیونکہ یزید فاسق و فاجر شخص تھا۔ حضرت امام حسین 680ء میں مع اپنے اہل و عیال مکہ تشریف لائے۔ یہاں پہنچ کر اہل کوفہ کی طرف سے متعدد خطوط پہنچے کہ آپ یہاں آ کر ہمیں یزید کے مظالم سے بچائیے اور اپنی بیعت سے مشرف کیجیے۔ آپ کوفیوں کی دعوت پر مع اپنے جاں نثاروں اور اہل و عیال کے جو بہتر افراد پر مشتمل تھے، کوفہ روانہ ہو گئے۔ آپ کو وہاں پہنچ کر اہل کوفہ کی وفاداری پر شک ہوا اور آپ راستے میں کربلا میں خیمہ زن ہو گئے جہاں یزید کی فوج کے ساتھ معرکۂ کربلا پیش آیا۔ امام حسین نے حق کے لیے جنگ کی اور باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اس جنگ میں آپ نے اپنی اور اپنے اعزا کی قربانی دے کر حق کو سربلند کر دیا۔ یہ واقعہ 10 محرم مطابق اکتوبر 680ء کو جمعہ کے دن پیش آیا۔''(29)

شہیدِ کربلا نے جان دی حق کی حمایت میں
نہیں باطل کے آگے اپنی گردن عجز سے خم کی

(ظفر علی خاں)

ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ممالک میں اسی واقعے کو یاد کرنے کے لیے مجالس اور عزاداری کا اہتمام ہوتا ہے، تعزیے نکالے جاتے ہیں، آہ و زاری اور نوحہ و ماتم کی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں اور اس طرح امام حسین اور ان کے رفقا و اعزا سے اپنی عقیدت و نیازمندی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

امام حسین کی اس تاریخی شخصیت سے بالکل الگ ان کے کردار کے گرداگرد شیعی روایتوں کی ایسی چادر تنی ہوئی ہے جس کے پار سے ان کی شخصیت جلوۂ خداوندی سے منور نظر آتی ہے۔ ان کے یومِ پیدائش سے لے کر شہادت کے دن تک بے شمار معجزے ان سے ظہور میں آئے جن کی تفصیل شیعی کتابوں میں موجود ہیں۔ اردو مرثیوں اور نظموں میں امامِ حسین کی یہی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مرثیہ نگاروں نے امامِ حسین کے صبر و رضا اور جاں نثاری و جاں سپاری کی داستان سرائی میں بے حد مبالغے سے کام لیا ہے۔ ایسے موقعوں پر امام حسین اس زمین کے انسان نہیں بلکہ مافوق الفطرت خوبیوں کے پتلے معلوم ہوتے ہیں۔

مرثیہ نگاروں نے امام حسین کے لیے لاتعداد القاب استعمال کیے ہیں۔ تلمیح کے نقطۂ نظر سے ان میں سے چند کا ذکر ضروری ہے۔

ابن علی، ابن فاطمہ، ابن مرتضیٰ، آفتابِ دیں، آقائے نامدار، امامِ دہر، امامِ زماں، امامِ غیور، امامِ ہمم، بازوئے حیدر، بوسہ گاہِ مصطفیٰ، پسر سید البشر، تاجدارِ دو عالم، جگر بندِ مصطفیٰ، چشمۂ فیض، خامسِ آلِ عبا، خسروِ زمن، درِ نجف، راکب دوش نبی، رکن دین، سبطِ پیمبر، سلطانِ مشرقین، سید الشہدا، شاہِ بطحا، شاہِ تشنہ کام، شاہِ حجاز، شاہِ کربلا، شاہِ یثرب، شمعِ قبر رسالت پناہ، شہِ عرش نشیں، شہنشاہِ امم، صاحب تطہیر، غریبِ نینوا، فاطمہ کا لال، فرزند بوتراب، فرزند پیمبر، قبلۂ عالم، قمر آسمان ودیں، گل ریاضِ محمد، لختِ جگر مصطفیٰ، مسافر کربلا، مظلوم کربلا، نیر دیں، اللہ کا پیارا اور شہِ گلگوں قبا وغیرہ۔

حضرت امام حسین شیعوں کے تیسرے امام ہیں۔ صحرائے کربلا میں یزید کے فوجیوں نے ان کو شہید کیا تھا۔ سنان نخعی نے آپ کے جسمِ اطہر سے سرِ مبارک الگ کیا تھا اور شمر ذی الجوشن کے حوالے کر دیا تھا۔ شمر ذی الجوشن یہ سر یزید کے دربار میں لے گیا تھا۔

معرکۂ کربلا میں یزید کے فوجیوں نے ابن زیاد کی قیادت تلے قساوت و سنگ دلی

کی تمام حدوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ظالم فوجیوں نے نہ صرف امام، ان کے اہل بیت اور ساتھیوں کو شہید کیا بلکہ انتہائی سنگ دلی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے دریائے فرات کا پانی بھی ان پر بند کر دیا تھا۔ امام حسینؑ اور ان کے تمام رفقا اور اعزا نے پیاس کی حالت میں جامِ شہادت نوش کیا تھا۔

● شہپر روح القدس: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔

● شہیدِ کربلا: تفصیل 'شہادت حسینؑ' کے تحت دیکھیں۔

● شیریں فرہاد:

جس طرح کبھی عرب کے صحرا و بیابان، ریگستان اور وادیاں، لیلیٰ مجنوں کی داستانِ عشق و وفا سے گونج اٹھے تھے؛ ایران کے مرغزار اور سبزہ زاروں نے بھی شیریں اور فرہاد کے حسن و عشق اور وفاداری کا گیت سنا تھا، جس کی صدائے بازگشت، کوہِ بے ستون کی وادیوں اور چٹانوں میں گونجی تھی۔ شیریں، فرہاد اور خسرو اس داستانِ عشق کے تین الگ الگ کردار تھے۔ خسرو پرویز، ایران کا حاکم اور مطلق العنان بادشاہ، امارت و جہاں گیری کا مظہر تھا؛ شیریں، خسرو کی چہیتی بیوی اور معشوقہ تھی؛ اس کہانی کا دوسرا کردار تھی اور فرہاد، خسرو کی حکومت کا ایک مزدور اور سنگ تراش، جو اس کی بیوی کا عاشق تھا؛ اس داستان کا سب سے اہم اور مشہور کردار ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی کہانی کی طرز پر اس داستان نے بھی شاعروں اور ادیبوں کو بے شمار خیالات فراہم کیے، شاعروں اور ادیبوں نے اس داستان کے ہر ہر پہلو سے خیالات مستعار لیے، شاعری کی اور خیالات کی نیرنگیوں سے ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔

قیس و فرہاد کے ماتم سے تو جگ میں اب تک
دشت ہیں خاک بسر، روتے ہیں کہسار ہنوز
(سوداؔ)

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ
دشت میں قیس رہے کوہ میں فرہاد رہے
(میرؔ)

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ خسرو پرویز، ایران کا بادشاہ تھا اور شیریں اس کی محبوبہ اور بیوی تھی۔ شیریں، ملکِ ارمنستان کی ملکہ مہین بانو کی بھتیجی تھی اور حد درجہ خوبصورت اور نازک؛ باوجود اس کے کہ خسرو کی دل بستگی شیریں سے بہت زیادہ تھی مگر مدت تک دونوں کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ بہت بعد میں دونوں کی شادی ممکن ہو سکی اور دونوں یک جان دو قالب بن کر زندگی گزارنے لگے۔

خسرو کو شیریں سے والہانہ لگاؤ اور وابستگی تھی اور شیریں کو تازہ دودھ سے بہت زیادہ رغبت تھی۔ خسرو کا ایک محل جو کوہِ بے ستوں کی بلندی پر واقع تھا، شیریں کی قیام گاہ تھا۔ کوہِ بے ستون کی وادی میں خسرو کی چراگاہ تھی اور بکریاں وادی کے دامن میں چرا کرتی تھیں، لیکن تازہ دودھ محل تک پہنچتے پہنچتے باسی ہو جاتا تھا۔ شیریں کی دل بستگی کے لیے یہ ترکیب نکالی گئی کہ اگر کوہِ بے ستون تراش کر ایک نہر نکال دی جائے تو چراگاہ سے نہر کے ذریعہ تازہ دودھ کی فراہمی ممکن تھی۔ نہر بننے سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا اور شیریں کو تازہ دودھ پہنچایا جا سکتا تھا لیکن بے ستون کی سختی اور بلندی اس راہ میں حائل تھی۔ بے ستون کے بارے میں آیا ہے کہ وہ ایران کا ایک مشہور پہاڑ ہے جو کافی اونچا ہے اور سخت پتھر کا ہے۔ ایران میں جو سلسلۂ کوہ آذربائیجان سے خلیجِ فارس تک کھینچا ہوا ہے اس کا ایک جزو کوہِ بے ستون ہے۔ الوند بھی اسی سلسلۂ کوہ میں واقع ہے۔ بے ستون، ہمدان اور حلوان کے درمیان واقع ہے۔ اس طرح نہر سازی کا خواب تعبیر کی منزل سے ابھی بہت دور تھا۔

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
(غالبؔ)

شیریں نے کوہ کن سے منگائی تھی جوئے شیر
گر امتحاں ہے اس سے بھی دشوار کچھ، کہو
(سوداؔ)

اسی زمانے میں خسرو کی سلطنت کا ایک شخص فرہاد، کسی طرح شیریں پر عاشق ہوگیا۔ داستان گویوں نے ان اسباب کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے کہ کیوں کر سلطنت کا ایک عام شخص ملکۂ ایران کی بارگاہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکا۔ فرہاد ایک عام شخص تھا، کچھ داستان نگاروں نے اسے پیشے کے اعتبار سے مزدور لکھا ہے، کچھ نے ماہر سنگ تراش اور بے مثال نقش گر سے اس کو تعبیر کیا ہے۔ کچھ ایک نے اس کو فوجی کے کردار میں پیش کیا ہے۔

شیریں اور فرہاد کے عشق کی شہرت جب عام ہوچلی تو یہ بات خسرو کے کانوں تک بھی پہنچی۔ خسرو شہنشاہِ وقت تھا اسے یہ بات قطعاً گوارا نہ تھی کہ اس کی محبوب بیوی اور ملکۂ ایران کا نام سلطنت کے ایک عام شخص کے ساتھ داستانوں کی زینت بنے۔ اس نے فرہاد کو راستے سے ہٹانے کا ایک آسان راستہ تلاش کرلیا۔ خسرو نے فرہاد سے کہا کہ شیریں کو تازہ دودھ سے رغبت ہے، اگر کوہِ بے ستوں تراش کر ایک نہر نکال دی جائے تو شیریں کو حسبِ رغبت تازہ دودھ مل سکے گا۔ دودھ کی نہر نکالنے کے لیے خسرو نے فرہاد کو راضی کرلیا۔ فرہاد اس شرط پر تیار ہوگیا کہ نہر کا کام مکمل ہونے کے بعد شیریں اس کو بخش دی جائے گی۔ خسرو نے یہ سوچ کر ہامی بھرلی کہ نہر کا کام اس قدر دشوار ہے کہ ایفائے وعدہ کا موقع ہی نہیں آئے گا۔

ہو سکے کیا خاک دست و بازوئے فرہاد سے
بے ستوں، خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے
(غالبؔ)

فرہاد اپنے کام میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ اس نے اپنے تیشے سے سب سے پہلے شیریں کے مجسمے تراشے اور ان مجسموں سے وہ وصالِ محبوب کا شگون لیتا تھا۔

حسنِ بتاں کو ہے دلِ خارا تلک، جگہ
شیریں کی جس پہ کھودی ہے تصویرِ سنگ ہے
(سوداؔ)

فرہاد لکھا صورت معشوق حجر پر
میں صورت دلبر دلِ شیدا پہ لکھا ہوں
(ولیؔ)

فرہاد، ایک ایک وار سے بے ستوں تراشتا رہا۔ اس کا وار اتنا زبردست ہوتا تھا کہ بلعمی نے لکھا ہے کہ ''پتھر کا ایک ٹکڑا جو وہ کھود کر نکالتا تھا؛ اتنا وزنی ہوتا تھا کہ آج سو آدمی مل کر بھی اسے اٹھا نہ سکیں''۔ ایک دوسرے مورخ طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

''شیریں وہ عورت تھی جس پر فرہاد عاشق تھا اور اس کے لیے بے ستوں تراش ڈالا تھا۔ فرہاد اس قدر وزنی اور بھاری پتھر کاٹتا تھا کہ دس آدمی بلکہ سو آدمی بھی مل کر اسے جگہ سے ہلا نہیں سکتے تھے اور آج تک اسی حالت میں باقی ہے۔''(30)

ٹالا ہی تھا پہاڑ کو فرہاد نے ولے
آئی کو کیا کرے جو وہ سر سے نہ ٹل سکے
(سوداؔ)

آخر کار کئی برس کی مسلسل محنت اور تگ و دو کے بعد فرہاد نے اپنی راہ کا یہ پتھر ٹال دیا۔ نہر اب آہستہ آہستہ اپنی تکمیل کے مراحل میں تھی۔ خسرو کو معلوم ہوا کہ بازی پلٹنے والی ہے تو اس نے مکر و فریب اور عیاری کا سہارا لیا۔ اس کے دربار کا ایک مصاحب، بوڑھی عورت کے بھیس میں فرہاد کے پاس پہنچا اور گریہ وزاری کرنے لگا۔ فرہاد کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ شیریں مر گئی ہے، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی، تمھاری ساری محنت اور تگ ودو اکارت چلی گئی۔ شیریں کی موت کی جھوٹی خبر سن کر فرہاد از خود رفتہ ہو گیا، اس نے وہی پھاوڑا اپنے سر پر دے مارا، جس کا ایک ایک وار اسے اس کے محبوب سے قریب تر کر رہا

تھا۔ تیشے کا یہی وار فرہاد کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا
(غالبؔ)

سبب مرگِ فرہاد کا ہوگیا تھا
نگوں ہے سرِ تیشہ خجلت سے اب تک
(میرؔ)

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہ کن کے پانو
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
(غالبؔ)

تلمیح کے نقطۂ نظر سے اس داستانِ عشق میں کئی دل چسپ پہلو پوشیدہ ہیں اور شاعروں نے اس واقعے سے کئی تلمیحات اخذ کی ہیں مثلاً شیریں اور فرہاد، عاشق و معشوق کے روپ میں، شیریں کی رغبت دودھ سے تھی اور فرہاد نے اس کے لیے کوہِ بے ستوں جیسا سخت پہاڑ کاٹ کر نہر بنا ڈالی۔

کام آئی کوہ کن کے مشقت نہ عشق کی
پتھر سے جوئے شیر کے لانے نے کیا کیا
(سوداؔ)

جوئے شیر کی تلمیح اسی نہر کی جانب اور مشکل کام کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ فرہاد کی مشقت اور آشفتہ سری کو شاعروں نے کبھی مزدور کا استعارہ بنایا، کبھی کوہ کن سے ملقب کیا، کبھی سادہ لوح عاشق اور ماہر و بے مثال سنگ تراش کی حیثیت سے پیش کیا۔

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
(غالبؔ)

خسرو پرویز، فرہاد کا رقیب بھی ہے، دولت و امارت اور شہنشاہی و جبروت کا

مظہر بھی جو موقع محل کے لحاظ سے مکر و فریب کا بھی سہارا لیتا ہے لیکن بالآخر ہمدردی فرہاد کا مقدر بنتی ہے اور خسرو کے سر لعنت وملامت کا تاج آتا ہے۔ فرہاد نے کوہ کنی کے لیے تیشہ استعمال کیا تھا، یہ تیشہ اس کا ہتھیار بھی ہے آلۂ جنگ بھی اور رسوم وقیود کا استعارہ بھی۔ تیشۂ فرہاد کی تلمیح میں یہ سبھی پہلو نظر آتے ہیں۔

تیشے سے کوہ کن سے دلِ کوہ جل گیا
نکلے ہے سنگ سنگ سے اکثر شرر ہنوز
(میرؔ)

اسی طرح نہر کی تکمیل کے وقت جو مصاحب، فرہاد کے پاس ایک بوڑھی عورت کے بھیس میں شیریں کی موت کی خبر لے کر پہنچا تھا، اس کے لیے پیرزن کی تلمیح عام ہے۔ پیرزن بھی مکر و فریب اور عیاری و مکاری کا مظہر ہے۔

● صاحب الحوت: تفصیل 'یونس' کے تحت دیکھیں۔

● صبر ایوب:

حضرت ایوب، اللہ کے برگزیدہ اور نیک بندے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں سخت آزمائش اور امتحان میں ڈالا تھا مگر کسی بھی صورت میں انھوں نے صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن میں حضرت ایوب کی مدحت اور تعریف بیان کی گئی ہے اور انھیں صابر کہا گیا ہے۔ صبرِ ایوب کی تلمیح اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

حضرت ایوب کی شخصیت، نسل اور ان کے عہد کی تعیین کو لے کر علما و محققین کے درمیان سخت اختلافات ہیں۔ تورات، مورخینِ عرب اور مورخین اسلام کی اس بارے میں الگ الگ آرا اور الگ الگ دلیلیں ہیں۔ صاحب قصص القرآن ان سب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صحیح اور تحقیقی بات یہ ہے کہ ایوب کا زمانہ، حضرت موسیٰ اور حضرت اسحاق ویعقوب کے زمانہ کے درمیان ہے اور تقریباً 1500 ق۔م اور

1300ق۔م کے حدود میں تلاش کرنا چاہیے۔"(31)

مورخین نے حضرت ایوب کو حضرت لوط یا حضرت یوسف کا نواسہ تسلیم کیا ہے۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر اور نیک انسان تھے۔قرآنی آیات کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مال و دولتِ دنیا اور کثرتِ اولاد کی نعمتوں سے نوازا تھا۔بطورِ آزمائش و امتحان ،ان سے ساری نعمتیں چھین لی گئیں حتیٰ کہ جسمانی صحت سے بھی محروم کردیے گئے اور بیماریوں میں گھر کر رہ گئے۔ان زبردست آزمائشوں اور ابتلاؤں کے باوجود بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور وہ خدائے تعالیٰ کا صبر و شکر ہی ادا کرتے رہے۔

مفسرین کی زبانی ،ایوب کی ہر قسم کی بیماری اور بربادی کے بعد جب کوئی ان کا تیماردار اور غمگسار باقی نہ رہا تو صرف ایک بیوی ان کے ساتھ رہ گئی ؛ جو صبح و شام ان کی خدمت بھی کرتی اور کام کاج کر کے دو وقت کی روٹیوں کا بھی انتظام کر لیتی۔ایک مرتبہ اس نے حضرت ایوب کی انتہائی تکلیف سے بے چین اور مضطرب ہو کر چند ایسے کلمات کہہ دیے جو صبر ایوبی کی شان استقلال کے خلاف تھے اور ان سے شکوے کی بو آتی تھی۔ حضرت ایوب نے قسم کھائی کہ میں تجھے سو کوڑے ماروں گا۔جب ان کی آزمائش کا وقت پورا ہو گیا اور قسم پوری کرنے کا وقت آیا تو بیوی کی غمگساری، ہمدردی اور حسنِ خدمت کو دیکھتے ہوئے وہ تردد کا شکار ہو گئے۔اللہ تعالیٰ نے بیوی کی خدمت اور وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ اس نے ایوب کو حکم دیا کہ وہ سو تنکوں کا ایک جھاڑو بنا کر بیوی کو اسی سے مار کر اپنی قسم پوری کرلیں۔الغرض اس طرح حضرت ایوب کی قسم پوری ہو سکی۔

ایوب ہر قسم کے مصائب و آلام اور آزار کو خندہ پیشانی اور صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔اور اسی طرح کئی برس بیت گئے۔روایتوں میں آتا ہے کہ ایوب تیرہ سال تک امتحان و آزمائش میں مبتلا رہے۔آخر کار انھوں نے خدا کے حضور عرضِ حال کردیا، رحمتِ الٰہی بھی جوش میں آگئی۔فرمان ہوا کہ اپنے پیروں کو زمین پر مارو۔پیروں کے زمین

پر مارتے ہی چشمہ ابل پڑا، جس کا پانی پینے سے اندرونی بیماریاں اور غسل کرنے سے ظاہری بیماریاں دور ہو گئیں۔ان کے تمام مال واسباب، دولتِ دنیا اور اولادیں پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں عطا کی گئیں، صبر وشکر کے بدلے یہ خدا کی رحمت ونعمت کا عطیہ تھا۔

حضرت ایوب کے مرض کے بارے میں بعض اسرائیلی روایات مبالغے کی حدوں تک جا پہنچی ہیں جیسے جذام یا پھوڑے پھنسیوں کا اس حد تک پہنچ جانا کہ بدن گل سڑ جائے، اس میں بدبو اور کیڑے پیدا ہو جائیں وغیرہ وغیرہ۔قرآن اور احادیث میں اس طرح کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ایک لمبی روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت ایوب نے زمین پر ٹھوکر ماری تو پانی کا چشمہ ابل پڑا اور انھوں نے غسلِ صحت کیا اور پہلے سے زیادہ صحیح وتندرست نظر آنے لگے۔ایوب، تازگی اور شگفتگی کے ساتھ اس طرح سامنے آئے کہ ان کی بیوی قطعاً پہچان نہ سکیں۔غالباً اس طرح کی روایتیں اسرائیلی ماخذوں سے لی گئی ہیں کیوں کہ قرآن میں اس کی کہیں کوئی تفصیل موجود نہیں ہے۔مگر پھر بھی اس پورے واقعے کی تفصیلات سے اتنا ثابت ہو جاتا ہے کہ ایوب ایک ایسے بندے تھے جنھوں نے مصیبت وبلا، رنج ومحن اور عسرت وتنگ حالی میں صبر ورضا کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور ابتلا وآزمائش کے مدمقابل کوہِ استقامت بن کر کھڑے رہے۔

اس کے وعدے کی وفا تک وہ کوئی ہووے گا جو
ہو معمر نوح سا، صابر ہو پھر ایوب سا
(میرؔ)

کہاں سے لاؤں صبر حضرتِ ایوب اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا
(شادؔ)

یوں آیا وصل کا اس دھن کو دولت
ملیا ایوب کو جس دھات صحت
(ابن نشاطی)

● صحرائے مجنوں: تفصیل 'لیلیٰ مجنوں' کے تحت دیکھیں۔

● صلیبِ عیسیٰ:

یہ تلمیح اس مخصوص واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک طرف جہاں حضرت عیسیٰ کی ذاتِ بابرکات مرجع خلائق اور بندگانِ خدا کا محور تھی اور مخلوقِ خدا ان کی برکتوں سے شفا اور تسکین پاتی تھی؛ وہیں دوسری طرف یہودیوں کے لیے ان کی شخصیت اور مقبولیت، حسد ورقابت کا سبب بن گئی اور وہ ان کے درپے آزار ہو گئے۔ یہ یہودیوں کا وطیرہ اور قومی مزاج بن گیا تھا کہ وہ انبیا ورسل کے قتل سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام ان کے اسی قومی اور نسلی تعصب کا شکار ہوئے تھے۔ یہودیوں سے حضرت عیسیٰ کی مقبولیت بھی برداشت نہ ہو سکی، ان لوگوں نے ان کے اردگرد سازشوں کا تانا بانا بننا شروع کر دیا اور بادشاہِ وقت کے کان میں ان کے خلاف زہر بھرتے رہے۔ اس زمانہ میں شام کا یہ علاقہ رومیوں کے زیرِ نگیں تھا اور ایک رومی حکمران، قیصرِ روم کی نیابت میں اس علاقے کی گورنری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ یہودیوں نے اس کافر بادشاہ سے پیغمبرِ خدا کو گرفتار کرنے کا پروانہ حاصل کر لیا اور کسی سازگار وقت کا انتظار کرنے لگے کہ موقع دیکھ کر حضرتِ عیسیٰ کو گرفتار کر لیا جائے۔ جب حضرتِ عیسیٰ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو انھوں نے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور دین استقامت پر قائم ودائم رہنے کی تلقین کی، ان کی طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد وہ یہودیوں کی سازش اور اقدام کا انتظار کرنے لگے۔

یہودی ادھر موقع کی تاک میں تھے ادھر خدائے تعالیٰ کی خفیہ تدبیریں بھی سرگرم عمل تھیں۔ خدا نے انھیں دشمنوں کے آزار سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے رکھی تھی۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا اور جب وہ مکان میں داخل

ہوئے تو روایتوں میں آتا ہے کہ ساری صورت حال ان پر مشتبہ ہوگئی اور وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ البتہ کچھ ایسا ہوا کہ سپاہی جب اندر داخل ہوئے تو انھوں نے حواریوں میں سے ایک شخص کو حضرتِ عیسیٰ کے ہم شبیہ پایا اور اس کو گرفتار کر کے لے گئے اور صلیب پر لٹکا دیا پھر قوم میں یہ مشہور کر دیا کہ عیسیٰ قتل کیے جا چکے ہیں اور انھیں صلیب دے دی گئی ہے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس دوران اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو زندہ اور صحیح سلامت آسمان پر اٹھالیا تھا وہ دشمنوں کی سازشوں اور مکر سے محفوظ رہے۔ مذکورہ شخص کی گرفتاری کے وقت وہ وہاں موجود ہی نہیں تھے وہ زندہ جسمِ عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھائے جا چکے تھے۔ قرآن اور حدیث کی روایتوں کے مطابق حضرت عیسیٰ آسمان پر زندہ ہیں اور قیامت کے قریب ان کا نزول دوبارہ اس دنیا میں ہوگا۔ وہ دمشق میں منارۂ شرقیہ کے پاس فجر کی نماز کے وقت اتریں گے۔ آپ خنزیر کو قتل کریں گے، صلیب توڑ دیں گے، دجال کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے اور یاجوج و ماجوج کے فتنوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھیں گے۔

مستہلک اس کے عشق کے جانیں ہیں قدرِ مرگ
عیسیٰ و خضر کو ہے مزا کب وفات کا
(میر)

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر، چھوڑ کر زمیں میں نے
(اقبال)

اسرائیلی روایتوں کے مطابق جب یہودیوں نے مکان کا محاصرہ کر لیا تو پھر حضرت عیسیٰ کو گرفتار کر کے بادشاہِ وقت کے پاس لے گئے اور سولی پر لٹکانے کی سفارش کی۔ ہر چند بادشاہ نے عیسیٰ کو بے قصور اور معصوم سمجھ کر چھوڑنا چاہا مگر یہودیوں کے اصرار کے آگے وہ جھک گیا اور پھر سپاہیوں نے پیغمبر خدا کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور توہین و تذلیل کی ساری حدوں کو توڑتے ہوئے سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا۔ غرضیکہ حضرت عیسیٰ نے

انتہائی کس مپرسی اور بے بسی کے عالم میں اپنی جان دے دی۔ یہودیوں کی یہ خود ساختہ داستان، عیسائیوں نے بھی من وعن قبول کر لی اور اسے مذہب کا رنگ دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کی عبادت گاہوں، اسکولوں اور عمارتوں میں حضرت عیسیٰ کی یہی تصویر آویزاں رہتی ہے۔ قرآن اور حدیث کے مطابق یہ قطعاً واقعے کے خلاف ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ اور صحیح سلامت آسمان پر موجود ہیں۔

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا
(ذوقؔ)

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ چوتھے آسمان پر تشریف رکھتے ہیں۔ چوتھے آسمان پر موجود ہونے کی روایت نہ جانے کب اور کیسے چل پڑی۔ جہاں جہاں حضرت عیسیٰ کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہاں صرف انھیں آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کا ذکر ملتا ہے، البتہ معراج والے واقعے کے بارے میں ایک طویل حدیث موجود ہے۔ اس حدیث کے مطابق اللہ کے رسول سے حضرت عیسیٰ کی ملاقات دوسرے آسمان پر ہوئی تھی حضرت یحییٰ بھی ان کے ہمراہ تھے، اس طرح گویا حضرت عیسیٰ چوتھے نہیں بلکہ دوسرے آسمان پر موجود ہیں۔

وہ اضطراب کہاں ضعف سے مگر اب بھی
ہو آؤں حضرت عیسیٰ تک اتنا حال تو ہے
(مومنؔ)

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے
(آتشؔ)

● صورِ اسرافیل:

اسرافیل، خدا کے مقرب فرشتوں میں سے ہیں۔ قرآن کریم اور دوسری اسلامی روایتوں میں آیا ہے کہ قیامت کے روز اسرافیل صور میں پھونک ماریں گے اور ساری

کائنات تہ وبالا ہو جائے گی۔ صور ایک قسم کا قرنا، نرسنگھا ہے۔ عہد عتیق میں بابلیوں، کنعانیوں اور عبرانیوں میں یہ دستور تھا کہ شاہی اجلاس اور اعلانِ جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا۔ اس سے شاہی شان وشوکت اور جاہ وجلال کا اظہار مقصود ہوتا تھا اور جنگ کے مواقع پر یہ خطرے کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ اسلامی روایات میں یہ تصور موجود ہے کہ اسرافیل اس کے منہ پر اپنے ہونٹ لگائے فرمانِ الٰہی کے منتظر کھڑے ہیں۔

بنی ہے صورِ اسرافیل آہِ بے تاثیر
کہ میرے دم پہ قیامت نفس نفس گزرے
(مومن)

قرآن کریم کی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسرافیل صور میں دو بار پھونک ماریں گے۔ پہلی پھونک سے جملہ مخلوق نیست ونابود اور فنا ہو جائے گی اور دوسری پھونک سے یہ دوبارہ زندہ ہو جائے گی اور اپنی اپنی قبروں سے نکل نکل اپنے رب العالمین کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑے گی۔

روح پر روح لگی گرنے برائے تعجیل
جب ہوا نغمہ سرا صور میں یوں اسرافیل

صور اسرافیل درحقیقت اس دنیائے فانی کی بربادی، خدائے تبارک وتعالیٰ کی بادشاہی، قیامت کی ہیبت ناکی اور روزِ جزا وسزا کا استعارہ بھی ہے۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

یہ تری رفتار سے طرزِ قیامت ہے عیاں
منہ لگا دیتا ہے اسرافیل ہر دم صورہ سے
(ناسخ)

● ضحاک:

قدیم ایران کا بے حد ظالم اور سنگ دل بادشاہ تھا۔ یہ عربی النسل تھا اور عرب کے مشہور قبیلے حمیر سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی بادشاہ نے عہدِ جمشید میں ایران پر حملہ کیا اور جمشید اسی کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

مٹایا دورِ ساقی محتسب نے
عدو جمشید کا ضحاک نکلا
(صباؔ)

فردوسی کے شاہنامے کے مطابق ضحاک نے ابلیس کے بہکاوے میں آ کر اپنے باپ کو قتل کر ڈالا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ پھر ابلیس ایک باورچی کا بھیس بدل کر اس کے ہاں ملازم ہو گیا اور اپنی خدمت گزاری سے ضحاک کا دل جیت لیا۔ اپنی خدمات کے صلے میں شیطان نے ضحاک کے دونوں کاندھوں پر بوسہ دیا اور غائب ہو گیا۔ اس کے بوسہ دینے کی جگہ پر دو سانپ نمودار ہو گئے۔ ان سانپوں کی تلمیح مارِ ضحاک کے نام سے استعمال ہوتی ہے۔

دل آزاری سے تیرے دوش پر گیسو نکلتے ہیں
یوں ہی ضحاک کے شانوں پہ اک جوڑا تھا کالوں کا
(ذوقؔ)

جیسے ہی ان سانپوں کے پھن قلم کیے جاتے وہ دوبارہ نکل آتے اور ضحاک کے چہرے پر حملہ آور ہو جاتے۔ جب علاج کی تمام تدبیریں ناکام ہو گئیں تو شیطان ایک مرتبہ پھر حکیم کے بھیس میں نمودار ہوا اور تجویز کیا کہ اس درد کا مداوا یہی ہے کہ روزانہ ان سانپوں کو دو انسانوں کے بھیجے کھلائے جائیں تاکہ یہ بادشاہ کو تنگ نہ کر سکیں۔ اب روزانہ حکومت کے دو جوانوں کو قتل کر ان کا مغز سانپوں کی خوراک بنا دیا جاتا۔

بال تو منہ میں ترے ٹوٹ کے رہ جاتا ہے
جس طرح شانۂ ضحاک میں تھا سانپ کا گھر
(امیرؔ)

ضحاک کی حکمرانی کا دور بہت طویل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے تقریباً ہزار سال تک حکومت کی تھی۔ انسانوں پر اس نے ہر طرح کے مظالم ڈھائے۔ آخر کار کاوہ نامی ایک لوہار نے عوام کو اس کے خلاف برگشتہ کرنا شروع کیا۔ کاوہ کے دو جوان بیٹے ،ضحاک کے سانپوں کی خوراک بن چکے تھے، وہ خود بھی درد کا مارا تھا۔ اس نے قدیم شاہی خاندان کے شاہزادے فریدوں کی قیادت میں لوگوں کو اکٹھا کیا، اپنا چرمی پیش بند ایک نیزے پر باندھا اور ضحاک کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ جنگ میں ضحاک کو شکست ہوئی اور فریدوں تخت نشین ہوا۔ فریدوں نے کاوہ کے اسی چرمی پیش بند کو ایران کا قومی جھنڈا قرار دیا اور درفشِ کادیانی اس کا نام رکھا۔

- ضربِ کلیم: تفصیل 'عصائے موسیٰ' کے تحت دیکھیں۔

- طاقِ کسریٰ: تفصیل 'قصرِ نوشیرواں' کے تحت دیکھیں۔

- طائرِ سدرہ، طائرِ سدرہ نشین: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔

- طلسمِ سامری: تفصیل 'سحرِ سامری' کے تحت دیکھیں۔

- طوفانِ نوح:

جب نوحؑ کی قوم کے سرکش افراد کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا وقت آ گیا اور قومِ نوح کے صالحین کی حفاظت کے لیے کشتی بن کر تیار ہوگئی تو عذابِ الٰہی کی شروعات ہوگئی۔ ایک طرف زمین کی تہ میں سے پانی کا چشمہ ابلنے لگا اور دوسری طرف آسمانوں کو حکم ہوا کہ برسنا شروع کریں۔ پہلے پہل طوفان کا پانی ایک تنور سے نکلا تھا۔

جلتے ہیں چشم و اشک یہ گرمی سے جوش میں
تجھ بن انکھیاں ہوئی ہیں یہ طوفان کا تنور
(آبرو)

تھیں میری آنکھیں الٰہی یا کہ طوفانِ تنور
ساتھ اپنے یہ جو اک عالم کو لے کر ڈوبیاں
(سودا)

پھر تو ساری زمین ہی چشموں کی طرح ابل پڑی اوپر سے آسمان کی بارش نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ بارش اور پانی سے تمام روئے زمین غرقِ آب ہو گئی۔ کشتی کے سواروں کے سوا ہر شے طوفان کی زد میں آ گئی۔ اور قوم نوحؑ کے سرکش اور متمردوں کو طوفانِ باد و باران نے غرق کر کے تباہ و برباد کر ڈالا۔

کل اک مژہ نچوڑے طوفانِ نوحؑ آیا
فکرِ فشار میں ہوں میرؔ آج ہر پلک کے
(میرؔ)

جہاں میں گریہ نہ پہنچا بہم مجھے دل خواہ
یہ نوحؑ کے سے طوفاں ہزار لایا ہوں
(میرؔ)

یہاں ایک دلچسپ نکتے کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کیا طوفانِ نوحؑ عام تھا یا خاص؟ یعنی یہ طوفان صرف قومِ نوحؑ کی غرقابی کے لیے آیا تھا یا اس کی زد میں تمام روئے زمین تھی۔ اس سلسلے میں چند علمائے اسلام، علمائے یہود و نصاریٰ اور بعض ماہرین طبقات الارض اور تاریخ طبیعیات کی رائے ہے کہ یہ طوفان قوم نوحؑ کی آبادی والے مخصوص علاقے میں ہی آیا تھا کیوں کہ بہ صورتِ دیگر اس کے آثار مختلف علاقوں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر ضرور ثبت ہوتے۔ دوسری جماعت کا خیال ہے کہ یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر حاوی تھا اور اس زمین پر متعدد بار ایسے طوفان آ چکے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ عراق و عرب کے علاوہ دنیا کے اور بہت سے علاقے کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایسے ایسے حیوانات کے ڈھانچے اور ہڈیاں بہ کثرت پائی گئی ہیں جو ایک لمحہ کے لیے بھی پانی کے باہر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اسی لیے کسی زمانے میں ایک ایسا ہیبت ناک طوفان ضرور آیا تھا جس کی طغیانی نے

پہاڑ کی چوٹی کو بھی غرقاب کر ڈالا تھا۔

نوح کا طوفان ہمارے کب نظر چڑھتا ہے میرؔ
جوش ہم دیکھے ہیں کیا کیا دیدۂ تر کے ترے
(میرؔ)

● عدلِ نوشیرواں:

نوشیرواں نے اپنے عہد میں مزدکیوں کو نیست ونابود کر دیا تھا۔ فارسی اور اردو ادبیات میں یہ شخص نوشیروانِ عادل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اپنے خاص محل قصرِ مدائن میں اس نے ایک عدالت خانہ بنا رکھا تھا، اس محل سے ایک زنجیر (زنجیرِ عدل، سلسلۂ نوشیرواں) لٹکتی رہتی تھی۔ جو شخص بھی اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا وہی زنجیرِ عدل کھینچتا اور بادشاہ اس کی فریادرسی کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک گدھے نے وہی زنجیرِ عدل کھڑکائی تھی اور بادشاہ کے حضور سے اسے انصاف بھی ملا تھا۔ سعدیؔ کی گلستاں میں نوشیرواں کی عدل گستری اور انصاف پروری کی متعدد حکایات منقول ہوئی ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ قصرِ نوشیرواں کی تعمیر کی راہ میں ایک بڑھیا کا خستہ حال جھونپڑا آڑے آ گیا۔ جھونپڑے کی وجہ سے محل کی شان وشوکت اور تجمل پر حرف آ رہا تھا۔ بادشاہ نے بڑھیا سے اپنے جھونپڑے سے دست بردار ہو جانے کی گزارش کی مگر بڑھیا اس کے لیے رضامند نہ ہوئی۔ آخر کار بادشاہ نے اپنے محل کی دیوار کو ٹیڑھی ہی تعمیر کر لیے جانے کا حکم دیا اور بڑھیا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

عدل سے تیرے برابر نہ ہو عدلِ کسریٰ
کہیے اس کو جو کوئی سوکھ گیا اس کا دہن
(انشاؔ)

پیغمبرِ اسلام نوشیروانِ عادل کے زمانے میں اس دنیا میں تشریف لائے تھے اور باوجود اس کے کہ نوشیرواں دین سے بے گانہ تھا مگر عدل وانصاف کو اس نے اپنا شعار بنا

رکھا تھا۔ اس کی اسی خوبی کی بدولت پیغمبرِ اسلام نے اس کے عہد میں پیدا ہونے پر فخر کا اظہار کیا تھا۔ آپ کا یہ قول بہت مشہور ہے ''ولدت انافی زمن السلطان العادل '' (میں سلطانِ عادل کے زمانے میں پیدا ہوا تھا)۔

● عرصۂ محشر: تفصیل ''روزِ قیامت' کے تحت دیکھیں۔

● عشقِ زلیخا: تفصیل 'خواب زلیخا' کے تحت دیکھیں۔

● عصائے موسیٰ، عصائے کلیم:

حضرت موسیٰ کوہِ طور کے دامن میں آگ کی تلاش میں گئے تھے، آگ تو نہ ملی مگر خدا نے شرفِ ہم کلامی بخش دیا اور منصبِ نبوت پر سرفراز فرمادیا۔ وادیِ ایمن کے درخت سے آواز آئی: 'اے موسیٰ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے۔' موسیٰ اس غیر متوقع سوال پر حیران رہ گئے اور حیرانگی کے عالم میں جواب دیا 'یہ میری لاٹھی ہے، اس پر بکریاں چراتے وقت سہارا لیا کرتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑ لیا کرتا ہوں اور بھی اس میں مجھے بہت سے فائدے ہیں' ندائے غیبی پھر کانوں میں آئی: 'موسیٰ اپنی اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو۔'

موسیٰ نے جیسے ہی لاٹھی زمین پر ڈالی وہ سانپ بن کر دوڑنے لگی۔ بہ تقاضائے بشریت موسیٰ گھبرا گئے اور بھاگنے لگے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا 'موسیٰ! اس کو بے خوف ہو کر پکڑ لو ہم اسے پہلی صورت میں واپس کر دیں گے۔'

(خدا اور بندے کے درمیان کا یہ مکالمہ سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر 21-17 میں مذکور ہے)

بہ ظاہر حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں لکڑی کا دوشاخہ تھا۔ گلہ بان اور چرواہے عام طور پر اس طرح کی لکڑی اپنے پاس رکھتے ہیں اور کم و بیش ان کا استعمال بھی وہی ہوتا ہے جو حضرت موسیٰ نے بتلایا تھا۔ مگر اس معمولی سی لکڑی میں خدائے تعالیٰ نے اتنے کمالات اور مظاہر کر دیے تھے کہ موسیٰ کی یہ لاٹھی، خود موسیٰ اور قومِ بنو اسرائیل کے لیے بارہا غموں اور

مصیبتوں سے نجات دہندہ بن گئی۔

غرضیکہ حکم الٰہی کی تعمیل میں موسیٰ نے جیسے ہی اپنی لاٹھی زمین پر ڈالی، وہ اژدہا بن گئی اور چاروں طرف دوڑنے لگی۔ موسیٰ کا خوفزدہ ہونا بالکل فطری تھا مگر خدا نے ان کے دل میں اطمینان اور سکون پیدا کر دیا اور بے خوف ہوکر اسے پکڑ لینے کا حکم دیا۔ جیسے ہی موسیٰ نے اژدہے کے منہ پر ہاتھ رکھا وہ پھر لکڑی کا دوشاخہ بن گیا۔

کھول کر زلف کہا اژدرِ موسیٰ کیا ہے
ہاتھ چمکا کے وہ بولے یدِ بیضا کیا ہے
(رشکؔ)

موسیٰ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد جب دربارِ فرعون میں پہنچے تو کئی مجلسوں میں فرعون اور موسیٰ کے درمیان مکالموں کا سلسلہ چلا مگر فرعون خدائے واحد کی حقانیت کا انکاری ہی رہا اور اپنے دعوائے ربوبیت اور الہیت سے دست بردار ہونے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوا۔ موسیٰ سے اس نے خدا کے نشان کا مطالبہ کیا تو موسیٰ نے بھرے دربار میں وہی لاٹھی زمین پر ڈال دی۔ لاٹھی نے فوراً اژدہے کی شکل اختیار کر لی۔ فرعونی پھر بھی راہِ حق پر نہ آئے بلکہ الٹے انھوں نے موسیٰ اور ہارون کو ماہر جادوگر کہہ دیا۔ اور اہلِ دربار کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ موسیٰ اور ہارون اس طرح جادوگری اور کرتب سے ہمارا ملک ہتھیانا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کا مقابلہ ملک کے ماہر جادوگروں سے کرا کر ان کو شکست دینا چاہیے۔ چنانچہ مقابلے کے لیے ان لوگوں نے ایک تاریخ بھی متعین کر دی۔ مقابلے کی تاریخ کا دن وہی مقرر کیا گیا تھا جو مصر کی تاریخ میں 'جشن کا دن' کہلاتا تھا۔

مقررہ تاریخ پر مصر کے جادوگر اکٹھا ہوئے، عوام الناس کا بحرِ بے پایاں بھی تماش بینی کے لیے امنڈ پڑا تھا۔ جادوگروں نے جیسے ہی اپنی لاٹھیاں، رسیاں اور بان زمین پر ڈالیں وہ اژدہے کی شکل میں دوڑنے پھرنے لگیں۔ میدان میں چاروں طرف سانپ ہی سانپ، اژدہے ہی اژدہے۔ موسیٰ ایک بار پھر خوف کھا گئے، مگر خدا نے انھیں تسلی اور

غالب ہونے کی خوشخبری عطا کی اور جیسے ہی موسیٰ نے اپنی لاٹھی زمین پر پھینکی وہ ناگاہ اژدہا بن گئی اور چشم زدن میں اس اژدہے نے مصری جادوگروں کے تمام شعبدوں کو نگل لیا اور تھوڑی ہی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔عصاے موسوی کا یہ کرشمہ دیکھ کر مصر کے جادوگروں نے برملا اعلانِ حق کر دیا اور سجدے میں گر پڑے۔اس طرح اسی لاٹھی کے فیض سے مصر کے ماہر جادوگر حلقہ بگوشِ دینِ موسوی ہو گئے۔

ترک کر اے رقیب فرعونی
آہ میری عصاے موسیٰ ہے
(ولی)

عصائے موسیٰ کا کمال ایک باراور اس وقت سامنے آیا جب موسیٰ بنواسرائیل کے چھ لاکھ افراد کو لے کر مصر سے ارضِ مقدس کی جانب عازمِ سفر ہوئے۔بنواسرائیل راتوں رات مصر سے نکلے تھے مگر کسی طرح فرعون کو خبر ہو گئی اور وہ بھی ان کے تعاقب میں لشکر جرار لے کر روانہ ہو گیا تاکہ ان کو مصر چھوڑنے سے باز رکھے۔اور انھیں گرفتار کر کے پھر اپنا غلام بنائے رکھے۔صبح دم دونوں جماعتیں بالکل آس پاس تھیں۔بنواسرائیل آگے آگے اور فرعون اور اس کا لشکر جرار ان کے تعاقب میں۔بنواسرائیل کے آگے بحرِ قلزم تھا اور پیچھے فرعونی، عجیب کشمکش کی حالت ہو گئی تھی نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔بنواسرائیل کو صبر وضبط کا یارا نہ رہا وہ موسیٰ کو برا بھلا کہنے لگے۔اسی وقت خدا کے حکم سے موسیٰ نے اپنی لاٹھی بحرِ قلزم کی لہروں پر دے ماری، ناگاہ دریا پھٹ گیا اور اس کے دونوں کنارے پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے بنواسرائیل بخیریت وعافیت دریا پار پہنچے۔ ان کی دیکھا دیکھی فرعون اور اس کے فوجی بھی بحرِ قلزم میں کود پڑے اور آخرکار غرقابی سے دوچار ہوئے۔اسی خصوصی واقعے کو ضربِ کلیمی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا
(اقبالؔ)

بنو اسرائیل نے قلزم پار کر کے عرب کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ یہ ایک چٹیل اور بے آب و گیاہ میدان تھا۔ یہاں کی گرمی اور موسم کی شدت سے بنو اسرائیل گھبرا اٹھے اور موسیٰ سے پانی کا مطالبہ کرنے لگے۔ موسیٰ نے بارگاہِ الٰہی میں التجا کی۔ وحی الٰہی آئی کہ ایک بار پھر اپنی لاٹھی زمین پر مارو۔ موسیٰ نے تعمیل ارشاد کی تو اسی پتھر سے بارہ چشمے ابل پڑے۔ بنو اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے ہر قبیلے کے لیے الگ الگ چشمے جاری ہو گئے۔ انھیں چشموں کو عیونِ موسیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ہزار چشمے ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیم پیدا کر
(اقبالؔ)

ان بارہ چشموں کے محلِ وقوع کے بارے میں عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں لکھا ہے:

"پانی کے وہ چشمے جن کا ذکر بنو اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے۔ بحر احمر کے مشرقی بیابان میں سویز سے زیادہ دور نہیں ہیں اور اب بھی 'عیونِ موسیٰ' (موسیٰ کے چشمے) کے نام سے مشہور ہیں، ان چشموں کا پانی اب بہت کچھ سوکھ گیا ہے، اور بعض کے تو آثر بھی قریب قریب معدوم ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں ان چشموں پر اب کھجور کے باغات نظر آتے ہیں۔"(32)

غرضیکہ عصائے موسیٰ صرف لکڑی کا دوشاخہ نہیں تھا بلکہ خدائے عزوجل نے معجزے کے طور پر اس میں بے پناہ مظاہر اور کمالات یکجا کر دیے تھے۔ کہیں وہ لاٹھی اژدہا بن کر دوڑنے پھرنے لگتی ہے تو کہیں اژدہا بن کر جادوگروں کے مظاہر کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتی ہے کہیں اس کی ضرب سے سمندر کا سینہ پھٹ جاتا ہے اور اس میں راستہ بن جاتا ہے اور کہیں اس کی چوٹ سے چٹیل میدان کے پتھر سے پانی کے چشمے رواں ہو جاتے ہیں۔

● عصمتِ یوسف:

جب زلیخا اپنے ارادۂ بد میں کامیاب نہ ہو سکی تو اس نے سارا الزام یوسف کے سر منڈھ دیا اور یوسف نے تمام معاملات سے اپنی برأت ظاہر کی تو زلیخا کے رشتے دار نے اصل بات کا پتہ لگانے کے لیے مشورہ دیا کہ اگر یوسف کا کرتا آگے سے پھٹا ہے تو عورت معصوم ہے اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے چاک ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یوسف بے گناہ۔ عزیزِ مصر نے دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہے، مطلب صاف تھا کہ یوسف معصوم ہے۔ وہ سچائی جان گیا مگر اپنی عزت و ناموس کی خاطر یوسف سے کہنے لگا کہ جانے دو معاملہ رفع دفع کر دو اور عورت سے گویا ہوا کہ 'یہ سب تمھارا مکر و فریب ہے اور تم عورتوں کا مکر و فریب بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔'

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر، وضعِ تکلف تو دیکھیے
انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے پیشتر
اک بار سوے دامنِ یوسف تو دیکھیے
(فیض)

عزیزِ مصر کی اس بات سے مصری معاشرت کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کہ 'عورتیں اس زمانے میں اپنے اعمال و تصرف میں بالکل آزاد تھیں ازدواجی زندگی میں ان کا پلہ بھاری رہتا اور اخلاقی حیثیت سے عصمت و بے عصمتی کا معاملہ عملاً غیر اہم ہو گیا تھا۔ مصر کی یہ حالت برابر رہی۔ امرأۃ العزیز کے عہد سے لے کر کلوپٹرا تک، وہ صرف نسوانی حسن و جمال ہی نہیں بلکہ ازدواجی زندگی کی بے باکیوں اور مطلق العنانیوں میں بھی شہرۂ آفاق رہا۔'

یوسف کی عصمت اور پاکدامنی کے ثبوت کے ضمن میں ایک اور نکتہ لائق توجہ ہے۔ بعض واقعات میں آتا ہے کہ یوسف کی پاکدامنی کی گواہی ایک شیر خوار بچے نے دی

تھی۔ شیر خوار بچے کی شہادت والی بات مستند روایات سے ثابت نہیں ہے۔ بخاری اور مسلم میں تین شیر خوار بچوں کے بات کرنے کی حدیث ہے اور ان تینوں میں اس بچے کا ذکر نہیں ہے جس کا حوالہ عام طور پر عصمتِ یوسف کی گواہی کے ضمن میں دیا جاتا ہے۔

اب نہیں گواہِ اطفال معتبر
محسوب ہے جو عصمتِ یوسف گناہ میں
(مومن)

اس واقعے کے ساتھ عشق زلیخا، خواب زلیخا، دامن یوسف اور عصمت یوسف کی تلمیحات وابستہ ہیں۔

- علم موسیٰ: تفصیل 'خضر و موسیٰ' کے تحت دیکھیں۔

- علی:

نبی کریم ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ اللہ کے رسول کی سب سے چھوٹی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا، آپ کے عقد میں تھیں۔ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما آپ کے صاحبزادے تھے۔ خلفاے راشدین میں آپ آخری اور چوتھے خلیفہ تھے۔ بہادری، شجاعت اور جواں مردی میں یکتا اور علم و دانائی اور قوت فیصلہ میں بے مثال تھے۔ حضرت علی کی شان میں اللہ کے رسول کے کئی فرمودات بھی ہیں۔ آپ کا سال وفات 661ء کے آس پاس ہے۔ مدت خلافت چار سال نو ماہ رہی۔ ایک خارجی عبدالرحمٰن ابن ملجم نے فجر کی نماز کے دوران، ایک زہر آلود خنجر سے، کوفہ کی مسجد میں آپ کو زخمی کر دیا تھا اور بالآخر یہی زخم جان لیوا ثابت ہوا۔ حضرت علی کا مزار عراق کے شہر نجف میں ہے، اسی رعایت سے آپ کو شاہ نجف بھی کہا گیا ہے۔

ادب اور شاعری بالخصوص مرثیوں میں حضرت علی کو مختلف اسما و القاب سے یاد کیا گیا ہے، ان میں سے کچھ اہم ناموں، القاب اور کنیتوں کی تفصیل یہ ہے۔

ابوتراب، اسداللہ، شیر ایزد، شیرِ خدا، حیدر، حیدر کرار، مرتضیٰ، ایلیا، ساقیِ کوثر، صاحب ذوالفقار، شاہ نجف، شاہ ولایت، فاتح خیبر، شہِ مرداں اور مشکل کشا وغیرہ۔

مشکل کشا خطاب ہے ان کا علی ہے نام
ہم نام ہیں وہ بندہ ہے پروردگار کا
(سوداؔ)

کہاتا ہے تو اے سوداؔ غلامِ ساقیِ کوثر
جو دولت دین و دنیا کی مجھے حاصل ہے شیشے میں
(سوداؔ)

جوں سرمہ کیوں نہ چشم میں قائم کے ہو جگہ
آخر وہ خاکِ پا ہے شہِ بوتراب کا
(قائمؔ)

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
(اقبالؔ)

حضرت علی شجاعت و جواں مردی میں بے مثل تھے۔ رسول خدا کی قیادت میں ہونے والی مختلف جنگوں میں آپ نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے تھے اور قریش و کفار کے نامور اور سر برآوردہ پہلوانوں اور سرداروں کو تہ تیغ کیا تھا۔ بدر و احد سے لے کر خندق و خیبر تک کفار و یہود کے کئی نامور پہلوانوں نے آپ کی تیغ تیز کا ذائقہ چکھا تھا اور کیفر کردار تک پہنچے تھے۔

حضرت علی کی تلوار کا نام ذوالفقار تھا۔ اس کو تیغِ حیدری بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شمشیر، نبی کریم نے حضرت علی کو عطا فرمائی تھی۔

ساقی پہنچ شتاب، کہ تجھ بن نہیں مجھے
موجِ مے دو آتشہ، کم ذوالفقار سے
(سوداؔ)

شیعوں کی روایات میں آتا ہے کہ حضرت علی، قیامت کے دن ساقیِ کوثر ہوں گے اور اپنے ہاتھوں سے امت محمدیہ کے پیاسوں کو پانی پلائیں گے۔ غیر شیعی روایات میں ساقی کوثر کے فرائض اللہ کے رسول انجام دیں گے۔

اللہ کے رسول نے شاہ مصر مقوقس کے نام خط بھیجا تھا اور اسے اسلام کی دعوت دی تھی۔ شاہ مصر مسلمان تو نہیں ہوا لیکن قاصد کو بصد عزت واحترام تحائف دے کر واپس بھیجا تھا۔ ان تحائف میں ایک خچر بھی تھا۔ یہی خچر، حضرت علی کی سواری میں آ گیا، اس کا نام دلدل تھا۔ حضرت علی کو شہ دلدل اسی رعایت سے کہا جاتا ہے۔ بعض وقائع نگاروں نے لکھا ہے کہ دلدل، ایک اونٹ تھا۔

ان تاریخی روایتوں کے علاوہ، حضرت علی کے تعلق سے بے شمار باتیں مرثیوں میں ذکر ہوئی ہیں، یہ سب باتیں شیعی روایتوں کی مرہون منت ہیں، تاریخ اس بارے میں خاموش ہے لیکن تلمیح کے نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

- **عمر جاوید:** تفصیل 'خضر' کے تحت دیکھیں۔

- **عمرِ نوح:**

حضرت نوح کی طویل العمری بطورِ تلمیح مشہور اور مستعمل ہے۔ حضرت نوحؑ کا سلسلۂ دعوت وتبلیغ برس دو برس نہیں چلا تھا۔ قرآن شریف نے صراحت کے ساتھ اس کو بیان کر دیا ہے۔ قرآن شریف کے الفاظ کا مفہوم ہے کہ "ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، وہ ان میں ساڑھے نو سو سال تک رہے پھر تو انھیں طوفان نے دھر پکڑا اور وہ تھے بھی ظالم"۔ معلوم ہوا کہ نوحؑ کی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ ساڑھے نو سو سال کو محیط ہے۔ ان کی پوری عمر کتنی ہے قرآن اس بارے میں خاموش ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چالیس سال نبوت سے قبل اور ساٹھ سال طوفان کے بعد۔ بہر حال حضرت نوحؑ نے کافی لمبی عمر پائی تھی اور تقریباً ہزار برس تک دعوت وتبلیغ کرتے رہے۔

اس کے وعدے کی وفا تک وہ کوئی ہووے گا جو
ہو معمر نوحؑ سا، صابر ہو پھر ایوبؑ سا
(میرؔ)

تمھارا حسن دیکھیا جب ہوا ہوں جیوں جمشید
تمھارے ذکر تھے پایا ہوں عمر میں جیوں نوحؑ
(قلیؔ)

● عوج بن عنق:

ایک فرضی اور افسانوی شخص جس کی شہرت کی وجہ اس کی طویل القامتی ہے۔ یہ شخص عوج بن عنق، عوج بن عوق یا عوج عناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص حضرت آدمؑ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا اور حضرت موسیٰ کے عہد تک زندہ رہا۔ طوفانِ نوح میں اگرچہ کشتی میں سوار نہیں تھا مگر اس کے باوجود طوفان کی ہلاکت خیزیوں سے محفوظ رہا۔ مجمل التواریخ والقصص میں لکھا ہے:

"طوفان کا پانی پہاڑ کی چوٹی سے چالیس چالیس گز اوپر تک بہ رہا تھا لیکن عوج بن عنق کی پنڈلیاں ہی اس میں ڈوب سکی تھیں۔"(33)

یوں بھی مشہور ہے کہ عوج بن عنق حضرت موسیٰ کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچا تھا۔ جب حضرت موسیٰ نے وادیِ تیہ کا رخ کیا تو عوج بن عنق ان کے مقابل آ گیا اور پہاڑ کی ایک بھاری چٹان اٹھا لایا تا کہ موسیٰ اور ان کی قوم کو ہلاک کر دے۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کی مدد کے لیے ہدہد کو بھیجا، ہدہد اسی چٹان پر بیٹھ گیا اور عوج بن عنق اس سے بے خبر رہا۔ جیسے ہی اس نے وہ چٹان حضرت موسیٰ کی جانب اچھالنے کا ارادہ کیا، خدا کے حکم سے ہدہد نے اس پتھر میں سوراخ کر دیا اور وہی چٹان خود اس کے گلے کا طوق بن گئی۔ پھر جبرئیل کے حکم سے موسیٰ نے اس پر وار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ خود بارہ گز لمبے تھے اور ان کی عصا کی لمبائی بھی بارہ گز تھی اور جب زمین سے بارہ گز اونچی چھلانگ لگا کر انھوں نے عوج بن عنق پر وار کیا تو ضرب اس کے ٹخنے پر پڑی تھی، آخر کار یہی زخم

جان لیوا ثابت ہوا۔

بات اہل کی چلی ہی آتی ہے
ہے مگر عوج بن عنق کی چال
(میرؔ)

ایک دل چسپ افسانہ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اس قدر لمبا تھا کہ سمندر کی گہرائی سے مچھلیاں نکالتا، اسے سورج کی شعاعوں پر بھون لیتا اور ہضم کر جاتا۔ ایسا بھی مانا جاتا ہے کہ اس کی ٹانگ کی ہڈی سے دریائے نیل پر ایک پل تعمیر کیا گیا تھا۔

پیدا کیا وہ اس نے بشر، عوج بن عنق
پل جس کے ساقِ پا سے بنا رودِ نیل کا
(ظفرؔ)

● عیونِ موسیٰ: تفصیل 'عصائے موسیٰ' کے تحت دیکھیں۔

● غار حرا:

ایک غار کا نام ہے جو مکہ سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک مختصر غار ہے جس کا طول 4 گز اور عرض پونے دو گز ہے۔ اس غار میں حضرت محمد ﷺ نبوت سے پہلے عبادت و ریاضت کے لیے جاتے رہتے تھے۔ تاریخی حقائق سے یہ ثابت ہے کہ آپ اس غار میں یکہ و تنہا چلے جاتے اور کئی کئی دن تک یاد الٰہی اور مراقبے میں مشغول رہتے۔ آپ کی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہ بھی اکثر آپ کے ہمراہ ہوتیں۔ وحی کا نزول سب سے پہلے اسی غار میں ہوا تھا۔ وحی الٰہی کے آغاز کی وجہ سے یہ غار متبرک خیال کیا جاتا ہے اور مرجع خلائق ہے۔ یہ غار موجودہ جبل نور کا حصہ ہے۔

کبھی میں غار حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جام آخریں میں نے
(اقبالؔ)

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
(حالیؔ)

- غبارِ قیس: تفصیل 'لیلیٰ مجنوں' کے تحت دیکھیں۔
- فاتحِ خیبر: تفصیل 'علیؓ' کے تحت دیکھیں۔
- فتنۂ دجال: تفصیل 'دجال' کے تحت دیکھیں۔
- فرعونِ مصر:

فرعون درحقیقت شاہانِ مصر کا لقب ہوا کرتا تھا، یہ کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں تھا۔ حضرت یوسف کے زمانے میں بھی مصر کا بادشاہ فرعون تھا اور موسیٰ کے عہد میں بھی فرعون ہی حکمران تھا اور ان دونوں پیغمبروں کے درمیان تقریباً ساڑھے چار سو برس کا فاصلہ ہے۔

> ''حضرت یوسف کے زمانے کا فرعون نسلی اعتبار سے عمالقہ میں سے تھا۔ مصر کی تاریخ میں ان کو 'ہائیکسوس' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان کی اصلیت کے بارے میں یہ تحقیق سامنے آئی ہے کہ یہ چرواہوں کی ایک قوم تھی یہ قوم عرب سے آئی تھی اور دراصل یہ عرب عاربہ ہی کی ایک شاخ تھی نیز قدیم قبطی اور عربی زبانوں کی مشابہت ان کے عرب ہونے کی مزید دلیل ہے۔''(34)

فرعون کی وجہ تسمیہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ ''مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان میں سب سے بلند تر 'آمن راع' تھا یعنی سورج دیوتا۔ نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشو ونما پا چکا تھا اور تاجدارانِ مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان کا لقب 'فاراع' اسی لیے ہوا کہ وہ راع یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔''(35) یہی فاراع عبرانی میں فارعن اور عربی میں فرعون کہلایا۔

تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر سکندر اعظم کے عہد تک فرعونوں کے اکتیس خاندانوں نے مصر پر حکمرانی کی ہے۔ سب سے آخری خاندان 332 ق۔م میں سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہو گیا۔ حضرت یوسف کے عہد میں سولہویں خاندان کا فرعون برسرِ اقتدار تھا اور ان سے تقریباً چار سو برس بعد انیسویں خاندان کا فرعون موسیٰ ریمسیس ثانی مصر پر حاکم تھا۔

ابھی تک فرعونِ موسیٰ کے بارے میں یہ تحقیق تھی کہ وہ بھی عمالقہ سے تھا اور اس کا نام ولید بن مصعب یا مصعب بن ریان تھا۔ مگر جدید تحقیق کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ عہد موسیٰ کا فرعون ریمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دورِ حکومت 1292 ق۔م سے شروع ہو کر 1235 ق۔م پر ختم ہوتا ہے۔

یہاں یہ نتیجہ نکالنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ موسیٰ جس فرعون کی آغوشِ تربیت میں پلے بڑھے وہ یہی ریمسیس ثانی تھا اور اس زمانے میں کافی معمر اور ضعیف ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی ہی میں اس کا بیٹا منفتاح حکومت کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ منفتاح ہی وہ فرعون ہے، موسیٰ سے جس کا مناظرہ بھرے دربار میں ہوا تھا اور جس نے موسیٰ کی تحقیر و تذلیل میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا یہی فرعون بالآخر غرقِ دریا کیا گیا۔

مصریوں میں یہ عام دستور تھا کہ وہ اپنے بادشاہوں کے مقبرے بڑے عالیشان تعمیر کرتے تھے۔ اہرامِ مصر دراصل انھیں فرعونوں کے مقبرے ہیں۔ ان مقبروں میں بادشاہ کی ممی شدہ نعش، اس کے لباس، زیور اور دوسرے باقیات ایک ساتھ دفن کر دیے جاتے تھے۔ کچھ تفصیلات، بادشاہ کی فتوحات اور کارناموں کے متعلق بھی ہوتی تھیں۔ بعض اہم واقعات کے بارے میں تفصیلی کتبے بھی لکھے جاتے تھے۔

فرعونِ موسیٰ منفتاح باوجودیکہ بڑی شان و شوکت اور کروفر والا بادشاہ تھا۔ اس کی موت عمرِ طبعی کے لحاظ سے قبل از وقت واقع ہوگئی یہ بات مصریوں اور قبطیوں کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ فرعون اس کم عمری میں چل بسے گا۔ اس کی بے وقت موت

سے مصری وہ سب رسومات بھی ادا نہ کر سکے، دستور جن کا مطالبہ کر رہا تھا اور عجلت میں منفتاح کو 'امنحتب' کے مقبرے میں ہی دفن کر دیا گیا۔ امنحتب اٹھارہویں خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس طرح اٹھارہویں اور انیسویں خاندان کی نعشیں ایک ہی جگہ رکھ دی گئیں۔ بعد میں منفتاح کی لاش مصری عجائب خانے میں محفوظ کر دی گئی اور آج بھی وہ ناک کٹی لاش سامانِ صد عبرت ہے۔ محمد احمد عدوی لکھتے ہیں:

''اس لاش کی ناک کے سامنے کا حصہ ندارد ہے غالباً دریائی مچھلی نے خراب کیا ہے۔''(36)

• تورات اور مورخین کی زبانی رقم ہے کہ فرعون کو منجموں اور کاہنوں نے بتلایا تھا کہ اس کی عظیم الشان حکومت کا زوال ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھوں ہوگا۔ اس پیشین گوئی کو باطل کرنے کے لیے اور حفظ ماتقدم کے طور پر فرعون نے اسرائیلی نوزائیدہ بچوں کو قتل کر دینے کا حکم صادر کر دیا اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھانا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں ایک اسرائیلی گھرانے میں موسیٰ پیدا ہوئے۔ شروع کے تین مہینے تو خاموشی سے گزر گئے مگر موسیٰ کی والدہ کو یقین ہو گیا کہ فرعون کے سراغ رسانوں سے اس بچہ کو محفوظ رکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ خدائے تعالیٰ نے موسیٰ کی والدہ کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ وہ تابوت نما صندوق میں بچے کو رکھ کر نذرِ دریا کر دے۔ موسیٰ کی ماں نے ایک صندوق تیار کیا اور فرمانِ الٰہی کے مطابق دریائے نیل میں بہا دیا اور صندوق کی نگہداشت کے لیے موسیٰ کی بڑی بہن کو مامور کر دیا ادھر خدائے تعالیٰ نے موسیٰ کی ماں کو یہ بشارت دے دی تھی کہ اس بچے کو تیری جانب واپس کر دیا جائے گا۔

دریائے نیل کی لہروں پر یہ صندوق تیرتا ہوا فرعون کے محل تک جا پہنچا۔ فرعون کی بیوی نے وہ صندوق نکلوایا اور شاہی محل میں لے آئی۔ جب صندوق کھولا گیا تو اندر ایک خوبصورت اور تندرست بچہ آرام سے لیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ خدا نے فرعون کی بیوی (آسیہ) کے دل میں اس بچے کی محبت ڈال دی۔ کچھ لوگوں کو شبہ گزرا کہ کہیں یہ اسرائیلی بچہ تو نہیں اور یہ بات رفتہ رفتہ فرعون کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے بچے کو قتل کرنے کا

منصوبہ بھی بنالیا مگر فرعون کی بیوی اس کی راہ میں حائل ہوگئی اور اس نے فرعون کو اس حرکت سے باز رکھا۔

تھا چشمۂ حیاتِ زلیخا بھی مصر میں
موسیٰ ہی کے لیے نہ فقط رودِ نیل تھا
(ذوقؔ)

خدا کی رحمت کی شان دیکھیے کہ یہ بچہ کسی دایہ کا دودھ ہی نہیں پیتا تھا۔ یہ دیکھ کر موسیٰ کی بہن نے جو اس وقت تک محل کی خادماؤں میں شامل ہو چکی تھی، کہا کہ میں ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جو اس کام کے لیے نہایت موزوں ہے۔ بہن کو حکم دیا گیا کہ وہ اس عورت کو اپنے ساتھ لے آئے۔ موسیٰ کی بہن شاداں و فرحاں گھر لوٹی اور پوری داستان سنانے کے بعد موسیٰ کی ماں کو دودھ پلائی کے لیے فرعون کے محل میں لے گئی۔ موسیٰ نے آخر کار اپنی ماں کے پستان سے ہی دودھ پیا۔ اور اس طرح خدائے تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔ موسیٰ فرعون کے دامنِ تربیت میں پرورش پا کر جوان ہو گئے۔ وہ مضبوط بدن کے بہادر جوان نکلے چہرے سے رعب ٹپکتا اور گفتگو کے دوران خاص وقار اور سنجیدگی ظاہر ہوتی تھی۔

موسیٰ جب اپنی آنکھوں سے بنواسرائیل پر فرعون کے مظالم دیکھتے تو ان کا خون کھول جاتا اور بنواسرائیل کے لیے ان کے دل میں ہمدردی کے جذبات امنڈ آتے کیوں کہ ان کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ قبطی یا مصری نہیں ہیں بلکہ بنواسرائیل کے ایک فرد ہیں۔ غرضیکہ موسیٰ گاہے بہ گاہے عبرانیوں (بنواسرائیل) کی مدد کرتے رہتے تھے۔

ایک دن نادانستگی میں ایک قبطی ان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ بات فرعون تک پہنچی، اس نے موسیٰ کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا مگر اس سے پہلے کہ موسیٰ گرفتار ہوتے کسی طرح ان کو یہ بات معلوم ہوگئی اور وہ خاموشی سے ارضِ مدین کی جانب روانہ ہو گئے۔

(یہاں درحقیقت فرعون کا ذکر کرنا مقصود ہے مگر درمیان میں موسیٰ کا واقعہ ضمنی طور پر اس لیے آ گیا ہے کہ فرعون اور موسیٰ کے واقعے باہم اس قدر پیوست ہیں کہ بغیر دونوں کا

ذکر کیے اصل واقعے کی تفصیلات بیان نہیں ہو پائیں گی)

موسیٰ پھر برسہا برس کے بعد ایک نبی کی حیثیت سے دوبارہ مصر میں داخل ہوئے۔ اس درمیان انھیں نبوت سے سرفراز کیا جا چکا تھا (تفصیلات، الگ الگ تلمیحات کے ذیل میں آئیں گی) اور خدا نے فرعون کی ہدایت و رہنمائی کی ذمہ داری انھیں سونپ دی تھی۔ فرعون کے بھرے دربار میں موسیٰ نے اپنی پیغمبری کا اعلان کیا اور انھیں دعوتِ حق دی مگر فرعون اپنی ربوبیت اور ملوکیت کے دعوے سے دست بردار نہ ہوا اور موسیٰ کے معجزوں کو جادو کہہ کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

دیکھتا اس بت مغرور کا گر جاہ و جلال
کبھی فرعون نہ دعوائے خدائی کرتا
(ذوقؔ)

اس نے موسیٰ اور جادوگروں کا مقابلہ بھی کرایا تا کہ موسیٰ اور موسیٰ کے خدا کی تکذیب کر سکے مگر مقابلے کے بعد جب جادوگروں نے موسیٰ کی رسالت کا اقرار کر لیا تو فرعون برسرِ عام ذلیل و رسوا ہوا مگر اعلانِ حق سے باز رہا اور بنو اسرائیل پر اس کے مظالم کا شکنجہ مزید کس دیا گیا۔ اس کا غرور اس حد تک پہنچا کہ اس نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ وہ ایک اونچا مینار تعمیر کرے کہ وہ اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکے۔

میں نخوتِ بتاں کو دلا تجھ سے کیا کہوں
فرعون کھائے تھا قسم ان کے غرور کی
(سوداؔ)

فرعون کا ظلم و ستم جب اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو موسیٰ کو اللہ نے مصر چھوڑ دینے کا حکم دیا کہ وہ بنو اسرائیل کو لے کر باپ دادا کی سرزمین میں چلے جائیں۔ موسیٰ راتوں رات بنو اسرائیل کے چھ لاکھ افراد کو لے کر مصر سے نکل پڑے۔ بنو اسرائیل کے نکلنے کی اطلاع فرعون کو ملی تو اس نے ایک زبردست فوج تیار کی اور موسیٰ کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا اور صبح ہوتے ہوتے بالکل ان کے قریب پہنچ گیا۔ بنو اسرائیل نے صبح کے وقت جب فرعون

کو اپنے سر پر پایا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور ان کی ہمت جواب دے گئی۔ موسیٰ کے لاکھ سمجھانے بجھانے پر بھی ان کی گھبراہٹ کم نہ ہوئی تو خدا کے حکم سے موسیٰ نے پانی پر اپنی لاٹھی سے ایک ضرب لگائی، پانی پھٹ گیا اور درمیان میں خشک راستہ بن گیا موسیٰ اور بنو اسرائیل اس راستے سے بحر احمر عبور کر گئے۔ فرعون بھی دیکھا دیکھی لشکر سمیت دریا میں اتر گیا مگر ابھی وہ بیچ دریا میں ہی تھا کہ خدا کے حکم سے پانی پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آ گیا اور فرعون مع اپنے لشکرِ جرار کے غرقاب ہوا۔

● قاب قوسین:

قوس کے معنی ہوتے ہیں کمان اور قاب بمعنی فاصلہ۔ قاب قوسین کا مطلب ہوا 'دو کمانوں کے بقدر فاصلہ' قاب قوسین کی ترکیب سورۂ والنجم کی آیت فکان قاب قوسین او ادنیٰ سے مستعار لی گئی ہے۔ اس آیت میں نبیؐ اور حضرت جبرئیل کی باہمی قربت کا بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور نبیؐ کی قربت کا اظہار نہیں ہے۔ آیت کا سیاق و سباق بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔ یہی وہ موقع ہے جب نبیؐ نے حضرت جبرئیل کو ان کی اصل شکل میں دیکھا اور یہ بعثت کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ دوسری مرتبہ اصل شکل میں معراج کی رات میں دیکھا تھا۔(37)

لیکن تلمیح میں عام طور پر قاب قوسین کی ترکیب اور اس کے مفہوم کا استعمال اللہ تعالیٰ اور نبیؐ کی باہمی قربت کے طور پر ہوتا ہے۔ معراج میں نبیؐ نے اللہ تعالیٰ سے انتہائی قریب ہو کر باتیں کی تھیں۔ اس قربت کا ذکر سورۂ والنجم میں نہیں بلکہ حدیثِ معراج میں ہوا ہے اور اس میں بہ صراحت رقم ہے کہ آپ اللہ کے اتنے قریب ہوئے کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ گویا قاب قوسین کی ترکیب دو مخصوص واقعات کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ایک تو وہ جس میں نبی کریم اور جبرئیل کی اس باہمی قربت اور نزدیکی کا ذکر ہے جب جبرئیل اللہ کے رسول کے پاس پیغامِ وحی لے کر آتے تھے اور دوسرا وہ

جس میں نبی کریم اور اللہ تعالیٰ کی قربت اور تدلی کا بیان ہے جب معراج کے سفر میں آپ نے اللہ تعالیٰ کو دو کمانوں کے بقدر فاصلے یا اس سے بھی کچھ کم کی دوری سے دیکھا تھا۔ ان ہر دو واقعات میں نبیؐ کے لیے قاب قوسین کی ترکیب استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو کبھی کبھی صاحبِ قاب قوسین کے لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔

کروں اس کی قدرت کا کیا میں بیاں
کہ تھا قاب قوسین ادنیٰ مکاں
(میرؔ)

قاب قوسین سے نزدیک ہو معبود جہاں
ایسی جا کون پہنچتا ہے سوائے احمد
(مجروحؔ)

● قابیل وہابیل:

قرآن نے اگرچہ آدم کے 'دو بیٹوں' کہہ کر مجمل چھوڑ دیا ہے مگر مفسرین نے ان کے نام قابیل اور ہابیل بتلائے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ نسلِ انسانی کے اضافے کے لیے ابتدا میں آدم وحوا کے ملاپ سے بیک وقت ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتی۔ دوسرے حمل سے پھر لڑکا لڑکی ہوتی۔ ایک حمل کے بھائی بہن کا نکاح دوسرے بہن بھائی سے کر دیا جاتا۔ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بہن قابیل کی بہن سے کم خوبصورت تھی الہامی دستور کے مطابق قابیل کی بہن کا نکاح ہابیل کے ساتھ ہونا تھا۔ قابیل کو یہ بات پسند نہ تھی۔ اس کی بہن زیادہ خوبصورت تھی اس لیے وہ اپنی ہی بہن سے نکاح کر لینے پر بضد تھا۔ حضرتِ آدم کے سمجھانے بجھانے پر بھی جب معاملہ ختم نہ ہوسکا تو انھوں نے دونوں بھائیوں کو بارگاہِ الٰہی میں قربانی پیش کرنے کا حکم دیا اور کہہ دیا کہ جس کی قربانی شرفِ قبولیت حاصل کرلے گی، قابیل کی بہن کا نکاح اس کے ساتھ کردیا جائے گا۔ دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی قربانیاں پیش کیں۔ ہابیل بھیڑیں پالتا تھا۔ اس نے ایک دنبہ قربانی کے لیے پیش کیا۔

قابیل کھیتی باڑی کرتا تھا، اس نے کھیتی کے غلہ سے چند بالیوں کی قربانی پیش کی۔ چنانچہ آسمان سے ایک آگ آئی اور اس نے ہابیل کی قربانی کو جلادیا۔ اس زمانے میں قربانی یا نذر کی قبولیت کا دستور یہی تھا۔

ہابیل کی قربانی قبول ہوگئی تو قابیل یہ توہین برداشت نہ کرسکا۔ غیظ وغضب کے عالم میں اس نے ہابیل سے کہا؛ میں تجھے قتل کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ ہابیل نے جواب دیا لیکن میں تیرے قتل کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ قابیل پر اس نصیحت اور درگزری کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اسی عالم غیظ وغضب میں اپنے سگے بھائی ہابیل کو قتل کردیا۔ اس طرح سے اس روئے زمین پر پہلا انسانی خون بہا۔ ایک بھائی کے ہاتھوں ہی دوسرا بھائی قتل ہوگیا۔

مت بھول دلا ربطِ مواخات جہاں پر
قابیل نے توڑی ہے نہ ہابیل کی گردن
(انشا)

قرآن عزیز میں شادی کا قصہ مذکور نہیں ہے۔ صرف قربانی کی قبولیت اور عدم قبولیت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ البتہ ہابیل کی نعش کے بارے میں مزید تفصیل یہ ہے۔

ابھی تک اولادِ آدم موت سے دوچار نہیں ہوئی تھی اور آدم نے مردوں کے بارے میں کوئی حکمِ الٰہی بھی نہیں سنایا تھا اس لیے قتل کے بعد قابیل حیران وششدر تھا کہ ہابیل کی نعش کا کیا کرے، ناگاہ اس نے ایک کوے کو دیکھا جو اپنے پنجوں سے زمین کرید کرید کر گڈھا کھود رہا تھا۔ قابیل کو تنبہ ہوا کہ وہ بھی اپنے مقتول بھائی کی لاش کو گڈھا کھود کر اس میں دفن کردے اور اس طرح سے اس نے اپنے بھائی کو سپردِ خاک کردیا۔

نہیں یہ جوشِ گل و لالہ نکل آیا ہے
دادخواہی کے لیے خاک سے خونِ ہابیل
(ذوق)

دمشق کے شمال میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو مقتلِ ہابیل

کے نام سے مشہور ہے۔

● قاصدِ سلیماں: تفصیل 'مرغِ سلیماں' کے تحت دیکھیں۔

● قصرِ ارم: تفصیل 'شداد' کے تحت دیکھیں۔

● قصرِ نوشیرواں:

مدائن میں نوشیرواں کا محل ایرانی بادشاہوں کے جاہ وجلال اور شان وشوکت کا نمونہ ہے۔ اس محل کا ذکر ایوانِ کسریٰ، ایوانِ مدائن، بارگاہِ کسریٰ اور طاقِ کسریٰ کے ناموں سے بھی ہوا ہے، اب اس محل کے صرف چند طاق باقی رہ گئے ہیں۔ اپنی عظیم جسامت اور فنی کاری گری کی بدولت یہ آج بھی دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ قصرِ نوشیرواں ہی وہ محل ہے جہاں شہنشاہِ ایران اپنے دربار منعقد کرتا اور احکامات وفرامین جاری کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول کی ولادت کے وقت نوشیروانی محل کے کئی کنگرے خود بخود زمین پر آرہے تھے۔ یہ عظیم ایرانی شہنشاہی کے زوال کی علامت تھا اور یہ بات اس وقت ثابت بھی ہوگئی جب عمر بن خطاب کے عہدِ خلافت میں اسلامی جرنیل سعد بن وقاص 637ء میں فاتحانہ شان سے اس محل میں داخل ہوئے۔ اسلامی فوجوں کو بے شمار مالِ غنیمت حاصل ہوا، اس مالِ غنیمت میں وہ پردۂ زرنگار بھی تھا جس پر خورشید اور شیر کے نقوش ابھارے گئے تھے۔ یہ پردہ بے شمار قیمتی جواہرات اور موتیوں سے آراستہ تھا۔

وہ کسریٰ کہ ہے شور جس کا جہاں میں
پڑے ہیں گے اس کے محل آج سونے
(میرؔ)

● قصرِ سلیماں: تفصیل 'بلقیس وسلیمان' کے تحت دیکھیں۔

- قطمیر: تفصیل 'اصحاب کہف' کے تحت دیکھیں۔

- قم باذن اللہ، قم عیسیٰ: تفصیل 'اعجاز مسیحا' کے تحت دیکھیں۔

- کاتبِ اعمال، کراماً کاتبین:

اسلامی عقیدے کے مطابق، اللہ تعالیٰ کا علم یوں تو ہر شے کو محیط ہے۔ وہ بحر و بر، دشت و جبل یہاں تک کہ انسانوں کے اندرون سے بھی باخبر ہے لیکن ہر انسان کے ذاتی اعمال کو ضابطہ تحریر میں لانے کے لیے اس نے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ یہ فرشتے انسان کے ایک ایک عمل اور چالوں کو قلم بند کرتے جاتے ہیں۔ ان فرشتوں کو اصطلاح میں کراماً کاتبین کہا جاتا ہے اور یہ اصطلاح قرآن کی ایک آیت سے ماخوذ ہے۔ وان علیکم لحافظینْ کراماً کاتبینْ یعلمون ماتفعلونْ (ترجمہ: یقیناً تم پر نگہبان؛ عزت والے لکھنے والے مقرر ہیں؛ جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں)[38]

قرآنی آیات کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کی ذاتی کارکردگی کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے، دو فرشتے مقرر ہیں جو انسان کے دائیں بائیں ہر وقت موجود رہتے ہیں؛ وہ انسان کی ہر بات اور ہر عمل کو نوٹ کرتے رہتے ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ "ایک فرشتہ نیکی تحریر کرنے کے لیے اور دوسرا بدی تحریر کرنے کے لیے مقرر ہے۔ کچھ مفسرین نے رات اور دن کے لیے دو فرشتوں کا ذکر کیا ہے۔ کچھ ایک نے رات کے دو فرشتے الگ اور دن کے دو فرشتے الگ۔"[39]

یہ فرشتے، ایک کتاب کے اندر انسان کے تمام بھلے برے اعمال درج کرتے رہتے ہیں۔ یہی وہ رجسٹر ہے جو نامۂ اعمال کہلاتا ہے اور قیامت کے دن یہی اعمال نامے سامنے لائے جائیں گے۔ یہ اعمال نامے انسانی زندگی کے ایسے مکمل ریکارڈ ہوں گے کہ جن میں کسی کمی بیشی کا امکان نہ ہوگا، انسان اسے دیکھ کر خود پکار اٹھے گا "یہ کیسا اعمال نامہ ہے جس نے چھوٹی بڑی چیز کسی کو بھی نہیں چھوڑا، سب کچھ ہی تو اس میں درج ہے۔"[40]

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
(غالبؔ)

نیکی اور بدی تحریر کرنے والے فرشتوں کے لیے کراماً کاتبین کے علاوہ کاتبِ اعمال کی اصطلاح بھی رائج ہے اور چونکہ ایک تصور یہ ہے کہ یہ فرشتے انسان کے کندھوں پر رہتے ہیں اس لیے 'مونڈھوں کے فرشتے' کی تلمیح بھی مروج ہے۔

کراماً کاتبین امید تشریف شفاعت میں
کہیں لکھیں نہ نام اپنا گنہگاروں کے دفتر میں
(محسنؔ)

جو بیٹھے تو فرشتے ہمارے مونڈھوں کے
ابھی تو عرش سے کرسی اتار لیتے ہیں
(رشکؔ)

● کرسیِ جم: تفصیل 'تختِ جمشید' کے تحت دیکھیں۔

● کشتیِ نوح:

جب بارگاہِ ایزدی میں نوح کی دعا مقبول ہوگئی اور کافروں کے لیے عذاب یقینی ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو ایک کشتی تیار کرنے کا حکم دیا تاکہ نوحؑ اور مومنین، اس عذابِ الٰہی سے محفوظ رہ سکیں۔ خدا نے ان کی حفاظت کا سامان کر دیا تھا۔ حکمِ الٰہی کے بموجب نوحؑ نے کشتی بنانی شروع کر دی تو کفار نے ہنسی مذاق اور تمسخر کرنا شروع کر دیا، کفار کا گزر جب کبھی ادھر سے ہوتا تو کہتے خوب! جب ہم غرق ہونے لگیں گے تب تو اور تیرے پیرو اس کشتی میں بیٹھ کر نجات پا جائیں گے۔ حضرت نوحؑ ان کی بات کا جواب انھیں کے طرز میں دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے۔ آخر کار سفینہ بن کر تیار ہو گیا۔ اب خدا کے عذاب کا وعدہ قریب آ گیا تھا۔ ناگاہ حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ زمین کی تہ

سے پانی کا چشمہ ابلنا شروع ہو گیا ہے۔ خدا کی وحی آئی اور نوحؑ نے اپنے خاندان کے افراد، ہر ذی روح مخلوق کے ایک ایک جوڑے اور مومنوں کی مختصر سی جماعت کو اس میں سوار کر لیا۔

وحی الٰہی کی تکمیل ہوتے ہی زمین و آسمان سے پانی کا سیلاب امنڈ پڑا۔ ہر چیز غرقاب ہو گئی مگر یہ کشتی خدا کے حکم سے پانی پر تیرتی رہی۔ طوفان ختم ہونے کے بعد یہ کشتی صحیح وسالم ایک پہاڑ پر جا رکی۔ نوح اور ان کی قوم نے نئے سرے سے اس زمین پر قدم رکھا۔

آئے طوفاں جو تیرے قہر کا طغیانی پر
کشتیِ نوحؑ بھی اعدا کو ہو گرداب صفت
(ذوقؔ)

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
(اقبالؔ)

● کوثر و تسنیم:

کوثر اور تسنیم، جنت کی دو نہروں کے نام ہیں، جن سے اہل ایمان مستفید ہوں گے۔ کوثر، عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'کثرت اور زیادتی' کے ہوتے ہیں:

> ''بعض مفسرین نے اس لفظ سے 'خیر کثیر' کا مفہوم مراد لیا ہے لیکن کچھ صحیح احادیث میں بتلایا گیا ہے کہ اس سے ایک نہر مراد ہے جو جنت میں نبی کریم ﷺ کو عطا کی جائے گی۔ اسی طرح بعض روایتوں میں کوثر سے مراد حوضِ کوثر لیا گیا ہے، جس سے اہل ایمان جنت میں جانے سے قبل، نبی کریم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے سیراب ہوں گے۔ اس حوض میں بھی پانی اسی جنت والی نہر سے آرہا ہوگا۔''(41)

کوثر کے پانی کے متعلق طبری نے لکھا ہے کہ ''یہ برف سے زیادہ ٹھنڈا، شہد سے

زیادہ میٹھا اور دودھ سے زیادہ سفید ہے"۔ اس نہر یا حوض کے متعلق عوام الناس میں بڑی دلچسپ کہانیاں مشہور ہیں مثلاً اس نہر کے کنارے، سونے اور مروارید کے ہوں گے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھا اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگا۔ سنگ ریزوں کے بجائے اس میں لعل و گہر تیرتے ہوں گے وغیرہ وغیرہ

بعض روایتوں کے مطابق، نبی کریم ﷺ اس نہر کا پانی جنتیوں میں تقسیم فرمائیں گے اور ایک دوسری روایت کے مطابق، حضرت علیؓ، اللہ کے رسول کے حکم سے مسلمانوں کو آب کوثر پلائیں گے۔ اسی رعایت سے نبی کریم ﷺ کو ساقیِ کوثر کہا گیا ہے۔ شیعی روایتوں کے مطابق حضرت علیؑ کو ساقیِ کوثر کہا جاتا ہے۔

بہت سہی، غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
(غالبؔ)

کہاتا ہے تو اے سوداؔ، غلامِ ساقیِ کوثر
جو دولت دین و دنیا کی تجھے حاصل ہے شیشے میں
(سودا)

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
(ولیؔ)

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال
حوض کوثر پہ جوں کھڑا ہے بلال
(ولیؔ)

تسنیم، جنت کی ایک اور نہر کا نام ہے۔ تسنیم کے معنی بلندی کے ہوتے ہیں۔ اس نہر کا پانی (شراب) بھی اہل جنت کا مقدر ہوگی۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جنتیوں کو جو شراب دی جائے گی اس میں تسنیم شراب کی آمیزش ہوگی، جو جنت کے بالائی علاقوں سے ایک چشمے کے ذریعے آئے گی، یہ جنت کی بہترین اور اعلیٰ شراب ہوگی۔ اسی رعایت

سے تسنیم کو ایک نہر سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
(اقبالؔ)

● کوہِ بے ستوں: تفصیل 'شیریں فرہاد' کے تحت دیکھیں۔

● کوہِ سینا، کوہِ طور: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔

● کوہ کن: تفصیل 'شیریں فرہاد' کے تحت دیکھیں۔

● کوہِ جودی:

جب قوم نوحؑ کے سرکش کافر اپنے اپنے انجام کو پہنچ چکے تو خدائے تعالیٰ نے زمین کو پانی کے نگلنے اور آسمان کو تھم جانے کا حکم دیا۔ عذابِ الٰہی ختم ہونے کے بعد نوحؑ کی کشتی جودی پہاڑ پر جا کر ٹھہر گئی۔ پانی آہستہ آہستہ خشک ہوتا گیا اور کشتی کے سواروں نے امن اور سلامتی کے ساتھ دوبارہ خدا کی زمین پر قدم رکھا اور بالکل نئے سرے سے یہ دنیا دوبارہ آباد ہوئی۔

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
(اقبالؔ)

جودی پہاڑ کو توریت میں ارارط بتایا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ کی دعوت و تبلیغ سرزمینِ دجلہ و فرات سے وابستہ تھی اور یہ دونوں دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکل کر الگ الگ بہتے ہوئے عراق کے زیریں حصے میں آ کر مل گئے ہیں اور پھر خلیجِ فارس میں جا گرے ہیں۔ چونکہ آرمینیا کے پہاڑ ارارط کے علاقے میں واقع ہیں اس لیے تورات نے ان کو ارارط کہہ دیا ہے۔ توریت کے شارحین کہتے ہیں کہ جودی دراصل وہ سلسلۂ کوہ ہے جو

اراراط اور جارجیا کے پہاڑی سلسلے کو باہم ملاتا ہے وہ اپنی دلیل میں سکندرِ اعظم کے عہد کی تحریروں کو پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگ جودی کو ملکِ عراق کے شہر موصل کے قریب بتلاتے ہیں۔ بہر حال آٹھویں صدی عیسوی تک اس جگہ ایک معبد اور ہیکل تھا جسے کشتی کا معبد کہا جاتا تھا۔

اب شور ہے مثالِ جودی اس خرام کو
یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو
(مومنؔ)

● گریۂ یعقوب:

حضرت یوسف کو کنویں میں ڈالنے کے بعد بھائیوں نے جب پیرہنِ یوسف کو یعقوبؑ کے سامنے پیش کیا تو یعقوبؑ پر سازش کے تمام پردے تو کھل گئے تھے مگر انھوں نے انتہائی صبر وضبط سے کام لیا۔ یوسف کے غم میں ان کا غمگین ہونا کچھ غیر فطری نہ تھا۔ چونکہ وہ یوسف سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بچپن میں ہی یوسف کی ماں کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے یعقوبؑ دونوں بھائیوں (یوسف اور بنیامین) کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ ایک اور بات یہ بھی تھی کہ یعقوبؑ خود بھی نبی تھے اور انھوں نے یوسف کی پیشانی میں نورِ احمدی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ یوسف کے غم میں برابر روتے رہتے تھے۔

نہ اک یعقوبؑ رویا اس الم میں
کنواں اندھا ہوا یوسف کے غم میں
(میرؔ)

یوسف کی جدائی اور غم میں خوابِ یوسف ہی ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا سہارا تھا۔ برسہا برس کے بعد جب برادرانِ یوسف قحط کے دنوں میں غلہ لینے مصر پہونچے اور بنیامین کو بھی عزیزِ مصر (یوسف) کے ہاتھوں چھوڑ کر چلے آئے اور باپ کو خبر پہنچائی تو

یعقوبؑ کے دل ودماغ میں یوسف کا غم ازسرِ نوتازہ ہوگیا۔رنج اورغم کی شدت سے ان کی آنکھیں سفید ہوچکی تھیں۔وہ نابینا ہوگئے تھے۔

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوار زنداں ہو گئیں
(غالبؔ)

کیا سوجھے اسے جس کے ہو یوسف ہی نظر میں
یعقوبؑ بجا آنکھوں سے معذور ہوا ہے
(میرؔ)

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر
(غالبؔ)

- **گلزارِ رضواں**: تفصیل 'رضواں' کے تحت دیکھیں۔
- **گلشنِ خلیل**: تفصیل 'شعلۂ نمرود' کے تحت دیکھیں۔
- **گلگوں**: تفصیل 'خسرو پرویز' کے تحت دیکھیں۔
- **گنجِ خسرو**: تفصیل 'خسرو پرویز' کے تحت دیکھیں۔
- **گنجِ قارون**:

قارون، بنواسرائیل کا ایک مال دارترین شخص تھا۔بعض مفسرین نے اسے حضرت موسیٰ کا چچا زاد بھائی کہا ہے؛ حضرت عبداللہ بن عباس سے یہی منقول ہے۔تاریخ اور وقائع نگار کہتے ہیں کہ جب بنواسرائیل مصر میں قیام پذیر تھے تو وہاں قارون دربارِ فرعون کا ملازم رہا تھا۔وہیں اس نے موقع پا کر دونوں ہاتھوں سے خوب دولت سمیٹی اور دنیوی اقتدار حاصل کیا۔اس کے پاس دولت کی اس قدر بہتات تھی کہ اس کے خزانے زر و جواہر سے بھرے ہوئے تھے کہ قوی ہیکل مزدوروں کی جماعت بھی اس خزانے کی

کنجیاں بہ مشکل اٹھا پاتی تھی۔

گنجِ قاروں کا سا یاں کس کے کنے تھا سو تو میرؔ
خاک میں ملتا ہے اب تک اپنے مال و زر سمیت
(میرؔ)

خدا نے جس قدر قارون کو مال و دولت کی فراوانی بخشی تھی اس کا بخل بھی اسی قدر بڑھا ہوا تھا۔ مزید سرمایہ داری اور تموّل نے اس کو انتہائی مغرور اور سرکش بھی بنا دیا تھا اور وہ دولت کے نشہ میں اس قدر بدمست تھا کہ اپنی ہی قوم کے لوگوں اور قرابت داروں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھاتا رہتا۔

حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے بعض افراد نے ایک بار قارون کو نصیحت کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو جو بے شمار دولت اور عزت وحشمت عطا فرمائی ہے تو اس کا شکر ادا کیا کر اور دین و دنیا کی بھلائی کے لیے غربا و مساکین کی مدد کرتا رہ۔ قارون کو نصیحت کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ اس کی مغرور، سرکش اور بخیل طبیعت میں جذبۂ انانیت جاگ اٹھا، وہ گویا ہوا 'یہ سب میری سمجھ اور فراست کی بنا پر دیا گیا ہے۔ یہ دولت و ثروت تیرے خدا کی عطا کردہ نہیں ہے۔'

ایک بار کا ذکر ہے کہ موسیٰ بنو اسرائیل کو نصیحت کر رہے تھے کہ قارون اپنے لاؤ لشکر سمیت وہاں آنکلا، اشارہ تھا کہ اگر موسیٰ کی تبلیغ کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو میں دولت اور جماعت کے بل بوتے پر انھیں شکست دوں گا۔ بہر حال مجمع میں موجود بعض لوگوں کے دل میں بھی قارون کی دولت و شوکت دیکھ کر جذبۂ رشک پیدا ہو گیا کہ اے کاش! ہم بھی اس دولت و شوکت کے مالک ہوتے۔ اسی طرح ایک بار قارون نے ایک پیشہ ور عورت کو کچھ روپیہ دے کر حضرت موسیٰ پر اس عورت سے ناجائز تعلقات رکھنے کا الزام بھی لگوایا تھا لیکن حضرت موسیٰ اس الزام سے باعزت بری ہو گئے تھے۔

غرضیکہ قارون کی مغرور طبیعت نے موسیٰ اور بنو اسرائیل کو تنگ کرنے کا کوئی دقیقہ

باقی نہیں رکھا تھا۔ اس کا غرور اور گھمنڈ جب اپنی حدوں کو جا پہنچا تو پاداشِ عمل کے طور پر خدائے تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا، زمین پھٹ گئی اور قارون اپنے خزانے اور محل کے ساتھ زمین میں دھنسا دیا گیا۔ حدیث کے الفاظ میں وہ قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔

جمع زر کرنے سے اپنی سربلندی تو نہ چاہ
لے گیا قارون کو تا تحت الثریٰ گنجینہ صاف
(سودا)

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا
(آتش)

ہے تہِ خاک بھی قارون کو سفرِ حشر تلک
نہیں تا تحت الثریٰ منزلِ آرام بخیل
(ذوق)

ہے قارون کے دفینے سے کنایت کہ کبھی
دہر میں پاس بخیلوں کے خزانہ نہ رہا
(مصحفی)

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ قارون علمِ کیمیا جانتا تھا اور اس کی ساری دولت اس کے اسی علم کی رہینِ منت تھی۔ مگر محققین نے صاف صاف لفظوں میں اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ کیمیا کی باتیں سب دوراز کار باتیں ہیں۔

پھنسا ہے اس طرح مجھ سا مفیدِ خلق مجلس میں
کہ علمِ کیمیا جیسے دلِ قاروں میں زندانی
(منیر)

- گوسالۂ زر: تفصیل 'سحرِ سامری' کے تحت دیکھیں۔

- لبِ عیسیٰ: تفصیل 'اعجازِ مسیحا' کے تحت دیکھیں۔

● لحنِ داؤدی:

اللہ تعالیٰ نے داؤد کو آسمانی کتاب زبور بخشی تھی۔ زبور کے لغوی معنی 'پارہ اور ٹکڑے' کے ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب تورات کی تکمیل اور تتمے کے طور پر نازل ہوئی تھی اس لیے اس کا نام زبور رکھا گیا۔ زبور، خدا کی حمد اور تسبیح کے نغموں سے معمور تھی۔ یہ ایسے قصائد اور مسجع کلمات کا مجموعہ تھی جس میں خدا کی حمد و ثنا، انسانی عبدیت اور عجز کا اظہار، پند و نصائح اور حکیمانہ اقوال پر مبنی خیالات تھے۔ ایک تو زبور، یعنی کائناتِ ارضی کے خالق کی تخلیق اور پھر حضرت داؤد کی خوش الحانی اور سحر آگیں ترنم، سونے پر سہاگا، وہ سماں بندھتا تھا کہ چرند پرند، پیڑ پودے اور پہاڑ تک وجد میں آجاتے اور خدا کی حمد و ثنا میں نغمہ سرائی کرنے لگتے۔ لحنِ داؤدی کی یہی وہ تاثیر ہے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جب اللہ کے رسول، حضرت ابوموسیٰ اشعری کا حسنِ صوت سنتے تو فرماتے: ''ابوموسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے 'لحنِ داؤد' عطا فرمایا ہے''۔

لحنِ داؤدی میں اثر، سوز و گداز اور رقتِ جذبات کے علاوہ بلا کی برق رفتاری اور روانی بھی تھی۔ بلا کی اس روانی اور برق رفتاری کے باوصف، تمام کلمات صاف صاف اور وضاحت کے ساتھ ادا ہوتے تھے۔ بخاری کی ایک حدیث میں منقول ہے کہ حضرت داؤد، پوری زبور کو اتنے مختصر وقت میں تلاوت کر لیا کرتے کہ جب وہ گھوڑے کی زین کسنا شروع کرتے تو تلاوت بھی شروع کرتے اور جب کس کر فارغ ہوتے تو پوری زبور ختم کر چکے ہوتے۔

لحنِ داؤدی کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ حضرت داؤد جب زبور کی تلاوت فرماتے رہتے تو ان کے وجد آفریں نغموں سے انسان تو انسان، وحوش و طیور تک وجد میں آجاتے۔ اڑتے پرند ٹھہر جاتے، آپ کے گرد پرا باندھ کر جمع ہو جاتے اور خدا کی حمد و ثنا اور تسبیح میں زمزمہ خوانی کرنے لگتے۔ چرند پرند اور حیوانات تک ہی یہ بات محدود نہ تھی، پہاڑ بھی اس سریلی اور پرکیف آواز سے گونج اٹھتے تھے اور خدا کی تحمید و تسبیح میں داؤد کی آواز میں آواز

ملانے لگتے تھے۔

بسکہ گایا ہوں سرودِ عشق تیری یاد میں
دل یہ میرا لہجۂ داؤد رکھتا ہے ہنوز
(ولی)

ترے جو ذکر میں رہتے ہیں ذاکراں دائم
ہے ان کو حضرت داؤد کی خوش الحانی
(ولی)

اس کے حلقوم میں ہے نغمۂ داؤد کا گھر
اور گلے میں ہے کیا اس کے صفائی نے وطن
(انشا)

ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی
اک تماشا ہے حسنِ کنعانی
(حالی)

● لقا کی ڈاڑھی:

لقا اور عمرو عیار دونوں، مشہور طولانی داستان، داستانِ امیر حمزہ کے مرکزی کردار ہیں۔ لقا، مشرکین کا بادشاہ اور خود ساختہ خدا تھا۔ اس داستان میں اول تا آخر، اسی بادشاہ کے مختلف کارناموں اور مہمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت امیر حمزہ نے اس کافر بادشاہ کو راہِ راست پر لانے کی بہت جدوجہد کی لیکن ہر کوشش ناکام گئی اور وہ کسی بھی حالت میں دعوائے ربوبیت سے دست بردار نہیں ہوا۔ بالآخر حق و باطل کی مختلف معرکہ آرائیوں میں لقا کو شکست ہوئی لیکن ہر بار وہ ذلیل و رسوا ہوتا اور پھر دھوکا دے کر راہِ فرار اختیار کرتا۔ امیر حمزہ پھر اس کا تعاقب کرتے اور یہ سلسلہ مدتِ دراز تک جاری رہا۔

داستانِ امیر حمزہ کی روایت کے مطابق لقا کا قد ننانوے ارنج کا تھا اور اس کی ڈاڑھی بھی کئی گز لمبی چوڑی تھی جو ہر وقت ہیرے جواہرات سے مرصع اور مزین رہتی تھی۔

اس ڈاڑھی کے ہر بال میں موتی پروئے جاتے تھے۔ عمرو عیار کا معمول تھا کہ جب بھی اسے موقع ملتا وہ، لقا کی ڈاڑھی مونڈ کر اپنی زنبیل میں ڈال لیا کرتا۔ کچھ دنوں کے بعد جب لقا کی ڈاڑھی پھر اپنی سابقہ حالت پر پہنچ جاتی، عمرو عیار دوبارہ اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا۔ اسی وجہ سے عمرو عیار کا لقب 'ریش تراشندۂ کافراں اور سربرندۂ جادوگراں' مشہور تھا۔ تلمیحاً اب ہر ایسی ڈاڑھی کو، جس میں بناؤ سنگار بہت ہوتا ہو اور مختلف تدبیروں سے آراستہ پیراستہ کی جاتی ہو، لقا کی ڈاڑھی کہا جاتا ہے۔

درِ معنی سے مرا صفحہ: لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ: عمرو کی زنبیل
(غالبؔ)

● لحنِ داؤد: تفصیل 'لحنِ داؤدی' کے تحت دیکھیں۔

● لیلیٰ مجنوں:

عربی ادب کے ان دو کرداروں نے نہ جانے کتنے شاعروں اور ادیبوں کو ان کے تخیلات کے اظہار کے لیے سنگ وخشت فراہم کیا ہے۔ نہ صرف عربی ادب میں بلکہ ترکی، فارسی اور اردو ادب میں بھی سیکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار ایسے نکل آئیں گے جن کے معانی ومفاہیم کا احاطہ یہی داستانِ عشق کرتی ہے۔ عرب کی وادیِ نجد سے نکلی حسن وعشق اور محبت کی یہ داستان کتنے شاعروں اور ادیبوں کی کشتِ خیال کو سرسبز وشاداب کرتی ہے؛ اس کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان وادب کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہوگا جس نے دو چار اشعار ایسے نہ کہے ہوں جن کا محور وماخذ، لیلیٰ مجنوں کی یہ مشہور داستان نہ ہو۔

حقیقت میں لیلیٰ مجنوں کی کہانی ایک عام عشقیہ کہانی سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن بعد کے زمانے میں داستان سراؤں اور وقائع نگاروں نے اس میں نئے نئے رنگوں کی آمیزش کی، اپنے قلم کی جولانیاں اور طبیعت کا زور دکھلایا اور زیبِ داستان کے

لیے درد، اثر، رقت، کیفیت، وصال، جدائی، آہ وزاری، نالہ وفریاد، بے کسی ومجبوری، صحرانوردی اور بادیہ پیمائی، عشق اور وفاداری کے اتنے پر پیچ پہلو پیدا کر دیے کہ یہ داستان ایک غیر معمولی داستانِ عشق ووفا بن کر ادب میں ایک نیا مقام پیدا کر لیتی ہے۔

سرزمین عرب کے نجد علاقے میں لیلیٰ اور مجنوں کا قبیلہ بود وباش کرتا تھا۔ دونوں ایک ہی قبیلے بنو عامر کے چشم وچراغ تھے۔ مجنوں کا باپ اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اس کے نام کے بارے میں مورخین متفق الرائے نہیں ہیں، کسی نے عبداللہ تو کسی نے معاذ ذکر کیا ہے لیکن مختلف روایتوں سے جس نام کی تصدیق ہوتی ہے وہ ملوح بن فراخم تھا۔ یہ شخص قبیلۂ بنی عامر کا رئیس اور سردار تھا۔ مجنوں بھی اپنے اصل نام سے بہت زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکا۔ تاریخ میں مجنوں کا لفظ جس شخص کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے وہ قبیلۂ بنی عامر کا شخص قیس عامری ہے۔ یہ صاحبِ دیوان شاعر تھا اور اس کے عربی دیوان سے اس کی داستانِ عشق ترتیب دی جا سکتی ہے۔ تاریخی طور سے قیس کا زمانہ ہشام بن عبدالملک (764ء) کے آس پاس کا ہے۔ مورخین نے مجنوں کا سالِ وفات 80 ہجری تحریر کیا ہے۔ لیکن جس طرح مجنوں کی پوری شخصیت اور اس کی داستانِ عشق پر تحقیقی طور سے سوالیہ نشان لگا ہوا ہے، اس کا سالِ وفات بھی بعض مورخین محلِ نظر مانتے ہیں۔ ابن خلکان اور ابن خلدون جیسے بلند پایہ مورخ بھی اسے شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ابوالفرج اصفہانی لکھتا ہے:

> ”تین شخصیتیں ایسی ہیں جو عوام الناس میں مشہور ومقبول تو ہیں لیکن حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی شخصیتیں انھیں تینوں میں سے دو ہیں۔“(42)

ابن الکلبی کے نزدیک مجنوں کا سارا قصہ فرضی ہے اور اسے بنوامیہ کے کسی مصنف نے تصنیف کیا تھا۔ بہر حال، مجنوں اور لیلیٰ کی داستانِ عشق ایک عام کہانی سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی، یہی سچائی ہے لیکن بعد کے مصنفین نے زیبِ داستان کے لیے اس قصے میں نئے نئے پہلو شامل کر دیے ہیں۔

قیس وفرہاد کے وہ عشق کے شور
اب مرے عہد میں فسانے ہیں
(میرؔ)

لیلیٰ اور مجنوں مشہورِ زمانہ عاشق و معشوق تھے۔ یہ عشق دوطرفہ تھا، عشق ووفا کی آگ دونوں طرف روشن تھی۔ دونوں ایک ہی قبیلے کے فرد تھے۔ بچپن میں ہی مجنوں کی دلچسپی لیلیٰ میں ہوگئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلچسپی اور لگاؤ نے محبت کا روپ اختیار کرلیا۔ دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھنے جاتے تھے۔ جب دونوں جوانی کی سرحد میں داخل ہوئے تو ان کے عشق کے چرچے گلیوں اور کوچوں میں عام ہو گئے۔ ان کی شخصیتیں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ یہ دیکھ کر لیلیٰ کے باپ نے خاندان کی عزت وناموس کی خاطر لیلیٰ پر پابندی لگادی۔ گھر سے باہر نکلنے اور مکتب جانے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ یہ ایک طرح کی قدغن تھی۔ مجنوں اسے برداشت نہ کرسکا اور جنون ووارفتگی کا شکار ہوگیا۔ گلیوں میں دیوانہ وار گھومنا اور ازخودرفتہ رہنا، یہی اس کا معمول بن گیا تھا۔ ادھر لیلیٰ بھی مجنوں کے عشق میں دیوانی تھی۔ لیلیٰ کے باپ نے اس پر مزید پابندیاں عائد کردیں۔ گھر سے باہر نکلنے کا سلسلہ تو مدت ہوئی بند ہوگیا تھا، اب اس کا پردہ بھی کرادیا گیا۔ ان پابندیوں نے مجنوں کی دیوانگی کو تیز تر کردیا اور آتشِ عشق دوآتشہ ہوتی رہی۔

مجنوں بھی نہ رسوائے جہاں ہوتا نہ وہ آپ
مکتب میں جوکم آتی، یہ لیلیٰ تھی دوانی
(میرؔ)

جوششِ درد سے مجنوں کے گریباں کی طرح
چاک در چاک ہوا آج ہر اک پردۂ ساز
(فیضؔ)

عرب کے ریگستانوں میں آمدورفت کے لیے اونٹوں کا سہارا تھا۔ لیلیٰ بھی کبھی اپنے ناقے پرسوار نکلتی تو اس کی گھنٹیاں مجنوں کو اس کی آمد کا پتہ دے دیا کرتی تھیں

اور مجنوں اس ناقے کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا چلا جاتا اور دور تک اس کا تعاقب کرتا (لیلیٰ کی یہی سواری ناقۂ لیلیٰ کی تلمیح ہے) لیلیٰ بھی اپنے محمل کے پردے کو ذرا سرکا دیتی اور عاشق و معشوق نعمتِ دیدار سے محظوظ ہوتے۔ یہی محمل، شاعری میں 'محملِ لیلیٰ' کی تلمیح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں
(اقبالؔ)

نکل کر وادیِ وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ
(انشاؔ)

مجنوں کے باپ نے لیلیٰ کے عشق میں جب اس کا یہ عالم دیکھا تو وہ لیلیٰ اور مجنوں کی شادی کرنے پر رضامند ہو گیا مگر لیلیٰ کا باپ کسی طرح اس کام کے لیے تیار نہیں ہوا۔ مجنوں پر جنون کا غلبہ بڑھتا ہی گیا۔ وہ گلی کوچوں سے نکل کر صحرائے نجد میں جا پہنچا اور نجد کی وادیوں کو اپنے نالہ و فریاد اور آہ و زاری سے نغمہ زار کرنے لگا۔ نجد کا یہ صحرا ایک انتہائی لق و دق اور غیر آباد ریگستان ہے۔ اس صحرا میں اب مجنوں کے ہجریہ اشعار گونجتے تھے۔ صحرا میں اس نے جنگل کے جانوروں کو اپنا رفیق و دمساز بنا لیا۔ اس وادی اور صحرا کے لیے وادیِ مجنوں، وادیِ قیس، وادیِ نجد، صحرائے نجد اور صحرائے مجنوں کی تلمیحات مستعمل ہیں۔

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
(اقبالؔ)

سنا جب انس تھا ہرنوں کو صحرا بیچ مجنوں سے
کیا شہری غزالوں کے تئیں سوداؔ نے رام اپنا
(سوداؔ)

شیریں کی ایک میں نہ کہوں، ورنہ بارہا
لیلیٰ جدھر تھی، وادیِ مجنوں ادھر گئی
(سوداؔ)

اسی ریگستانی وادی میں وہ شب و روز لیلیٰ کی یاد میں آہ و زاری کرتا اور درد و اثر میں ڈوبے ہجریہ اشعار کہتا۔ قبیلے والوں نے اسے واپس لانے کی کوشش کی۔ کئی بار اسے پکڑ پکڑ کر لائے لیکن ہر بار مجنوں واپس اسی صحرا میں پہنچ جاتا اور پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ صحرانوردی اور بادیہ پیمائی کرنے لگتا۔ غبارِ قیس کی تلمیح اسی صحرانوردی اور بادیہ پیمائی کا استعارہ ہے۔

کوئی محمل نشیں، کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے
(اصغرؔ)

لیلیٰ کا باپ چونکہ دونوں کے عشق کا مخالف تھا۔ اس نے لیلیٰ کی شادی ورد بن محمد العقیلی سے کردی۔ کچھ لوگوں نے اس کی کنیت ابن السلام لکھی ہے۔ شادی میں لیلیٰ کی مرضی شامل نہ تھی۔ لیلیٰ بھی مجنوں کے عشق میں گھٹ گھٹ کر جیتی رہی۔ آخرکار مجنوں کی حسرت دل میں لیے ایک دن وہ اس دنیا سے چل بسی۔ مجنوں بھی اس کی موت اور جدائی کا غم برداشت نہ کرسکا اور قبر لیلیٰ پر پہنچ کر اپنی جان، جانِ آفریں کے حوالے کردی۔ لیلیٰ کی قبر کے پہلو میں مجنوں کی قبر بھی بنادی گئی اور دنیا میں ناکام یہ عاشق و معشوق مرنے کے بعد ایک دوسرے کے پہلو میں محوِ خواب ہیں۔

مجنوں کا اصل نام قیس تھا۔ مجنوں کے معنی پاگل اور دیوانے کے ہوتے ہیں۔ قیس، لیلیٰ کے عشق میں جنون کی انتہائی حدوں تک جا پہنچا تھا، اس لیے عشق کی دیوانگی کے سبب اسے مجنوں کے لقب سے ملقب کردیا گیا۔ اسی طرح لیلیٰ کے معنی کالی، شب رنگ، سیاہ فام اور سانولی کے ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ لیلیٰ بہت خوبصورت نہ تھی، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، وہ کالی یا سانولی تھی۔ کئی بار قیس کو لیلیٰ کی خوبصورتی (بدصورتی) کی وجہ سے نشانہ

ملامت بھی بننا پڑا تھا لیکن اس کا جواب ہوتا 'لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھیے'۔

عربی زبان کی ایک خاصیت ہے کہ اس میں اشخاص کے نام ان کی صفات کی بنیاد پر رکھے جانے کا رواج تھا۔ ایسے بے شمار اشخاص ہیں جن کے نام، لقب یا کنیت ان میں موجود خوبیوں یا خامیوں کی بنا پر رکھے گئے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں تو اس کا بہت زیادہ چلن تھا۔ اسلامی دور میں بھی اس کا رواج رہا۔ ابولہب، ابوجہل، عمر فاروق، ابوبکر صدیق اور مشہور شاعر اعشیٰ اس کی محض چند مثالیں ہیں۔ لیلیٰ اور مجنوں کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔

> ''لیلیٰ مجنوں کی اس داستانِ محبت اور صحرائے نجد کے اس افسانۂ عشق کو فارسی ادب میں لانے کا سہرا مولانا نظامی گنجوی کے سر ہے۔ ان کا قاصد لیلیٰ مجنوں فارسی نظم میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ اسی عنوان سے دوسرے شعرا نے بھی طبع آزمائی کی ہے، جن میں امیر خسرو اور جامی کا نام فارسی میں؛ حمدی اور فضیلی کا نام ترکی میں؛ اور نظیر اکبرآبادی کا نام اردو زبان میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔''(43)

اٹھتے ہیں آج ناقۂ لیلیٰ کے جلد پانو
سرگشتہ کیا کوئی عقبِ کارواں نہیں
(نامعلوم)

بے پردہ سوے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے
(غالبؔ)

جب وادیِ مجنوں سے چلا قافلہ آگے
بے ساختہ واں ناقۂ لیلیٰ کو غش آیا
(انشاؔ)

● مارِ ضحاک: تفصیل 'ضحاک' کے تحت دیکھیں۔

● ماہِ سیام، ماہِ سیماب: تفصیل 'ماہِ نخشب' کے تحت دیکھیں۔

● ماہِ کنعاں: تفصیل 'حسن یوسف' کے تحت دیکھیں۔

● ماہِ مقنع، ماہِ نخشب:

ایک مصنوعی چاند جسے حکیم بن عطا نے اجزاے سیمابی کی مدد سے تیار کیا تھا۔ اس شخص کی کنیت ابن مقنع تھی۔ یہ شخص خلیفۂ مہدی کے زمانے میں خراسان میں قیام پذیر تھا اور سن 169 ہجری میں خلیفہ کے ہاتھوں مغلوب ہوا۔ تاریخ میں اس کے مریدوں اور پیروکاروں کو سفید جامگان یا مبیضہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ثعالبی اپنی تصنیف ثمار القلوب میں لکھتا ہے کہ ابھی بھی اس کے پیروکار کش اور نسف کے علاقوں میں آباد ہیں۔

حکیم بن عطا نے مختلف اجزا کو ترتیب دے کر ایک چاند تخلیق کیا تھا۔ یہ چاند روزانہ شہر نخشب میں ایک کنویں سے طلوع ہوتا تھا۔ شہر نخشب، جیحون اور سمرقند کے درمیان کہیں آباد تھا۔ کنویں سے طلوع ہو کر یہ چاند سارے شہر کو منور کرتا تھا اور صبح کو پھر اسی کنویں میں غروب ہو جاتا تھا۔ یہ کنواں کوہِ سیام کے دامن میں واقع تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس کی روشنی چار فرسنگ (تقریباً تیرہ میل سے کچھ زیادہ) تک پہنچتی تھی۔ کچھ دنوں تک روشنی بکھیرنے کے بعد کسی وجہ سے اس کا نظام بگڑ گیا اور اس کی روشنی ختم ہو گئی۔

ماہِ نخشب کی طرح ہوتا عیاں ہوں برسرِ کوہ
اور ابھی پل میں جو دیکھو تو عیاں ہوں نہ نہاں
(ذوقؔ)

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خرشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
(غالبؔ)

حکیم بن عطا کے اس مصنوعی چاند کو تلمیح نگاروں نے مختلف ناموں سے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ کبھی اس کو ماہِ مقنع سے تعبیر کیا ہے، کبھی ماہِ نخشب سے، کبھی ماہِ مزوّر اور ماہِ

کاشغر سے، کبھی ماہِ سیام اور ماہِ سیماب سے۔ اور جس کنویں سے یہ چاند نکل کر آسمان دنیا پر جلوہ افروز ہوتا تھا اسے چاہِ نخشب، چاہِ مقنع اور چاہِ سیام جیسے ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

روشنی چاند سے مکھڑے پہ اسی چاہ سے ہے
چاہِ نخشب اسے میں کہوں یا چاہِ ذقن
(آتش)

- محملِ لیلیٰ: تفصیل 'لیلیٰ مجنوں' کے تحت دیکھیں۔

- محمود وایاز:

سلطان محمود، تاریخ میں محمود غزنوی کے نام سے مشہور ہے، غزنی کا بادشاہ اور سبکتگین کا بیٹا تھا۔ اس کا دور حکومت 1030-998 عیسوی کے درمیان تھا۔ عہد وسطیٰ کے مسلم مورخین نے محمود کو اسلام کا ایک زبردست ہیرو قرار دیا ہے۔ اس نے ایک طرف وسطی ایشیا کے ترک قبائل سے لوہا لیا تو دوسری طرف ہندوستان پر حملہ کرتا رہا۔ یہاں کے مندروں سے اس نے بے پناہ دولت اکٹھا کی۔ کہا جاتا ہے کہ محمود نے ہندوستان پر سترہ بار حملہ کیا تھا۔ اس کا آخری حملہ گجرات کے مشہور سومنات مندر پر تھا۔ سومنات پر حملے سے جہاں محمود کو بے پناہ دولت وخزانہ اور مال غنیمت ہاتھ لگے وہیں دوسری طرف اسے اسلام کا حامی، غازی اور بت شکن بھی کہلانے کا زریں موقع ہاتھ آیا۔ 'ہندوستان میں اسے ایک لٹیرے اور مندروں کو تباہ کرنے والے حملہ آور کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔'(44)

محمود کا انتقال 1030ء میں بمقام غزنی ہوا۔

ہماری بت شکنی کے جدا فسانے ہیں
حدیثِ غزنوی وذکر سومنات نہیں
(فراقؔ)

محمود نے سلطنت کے دائرے کو وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ ایرانی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ فردوسی، محمود کا درباری شاعر تھا۔ اس کا شاہنامہ ایرانی

نشاۃ ثانیہ کا ایک زریں باب ہے۔ ملک گیری اور جہاں داری کے ساتھ ساتھ محمود نے فارسی زبان وادب کی بھی حوصلہ افزائی کی اور وسط ایشیا کے ایک مشہور دانش ور البیرونی کو ہندوستان بھیجا۔ البیرونی کی کتاب 'الہند' ہندستانیوں کی زندگی اور طرزِ بودوباش کا ایک مستند ماخذ ہے۔

ایاز، اسی محمود غزنوی کا معتمد اور مقرب غلام تھا۔ محمود اپنے اس غلام سے بے پناہ محبت کرتا اور عزیز رکھتا تھا۔ محمود کو ایاز سے اس قدر لگاؤ اور والہانہ وابستگی تھی کہ شاعروں اور داستان نگاروں نے ان دونوں کے تعلق کو عشق ومحبت کا روپ دے کر داستانوں کا محبوب موضوع بنا دیا ہے۔ ایاز کو خدا نے حسنِ ظاہری کے ساتھ ساتھ خوش خلقی، بہی خواہی اور عقل سلیم سے بھی نوازا تھا۔ انھیں اوصاف کی وجہ سے محمود نے اسے جواہر خانے کا نگراں مقرر کر رکھا تھا۔ ایاز، باوجودیکہ بادشاہ کا مقرب اور معتمد تھا لیکن اسے اپنی حقیقت اور اوقات کا ہمیشہ خیال رہا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے:

> ''جواہر خانہ اس کے سپرد تھا، جب وہ وہاں جاتا، اپنا غلامی کا لباس جو اس نے محفوظ رکھا تھا، پہن لیتا۔ درباری اس سے رشک کرتے تھے۔ ایک دن سلطان کو اس کی اطلاع دی گئی کہ خدا معلوم، ایاز تنہا جواہر خانہ میں کیا کیا کرتا ہے۔ بادشاہ نے اس معمہ کو حل کرنا چاہا اور اپنی آنکھوں سے ایاز کے اس تبدیل پوشاک کے واقعہ کو دیکھا۔ وجہ دریافت کی۔ جواب ملا کہ میں اپنی پہلی حالت کو روزانہ یاد کر لیتا ہوں تاکہ غرور سر میں نہ سما جائے۔ بادشاہ اس پر خوش ہوا اور مراتب ومناصب میں ترقی کی۔''(45)

محمود کے دل میں ایاز کے لیے اگر پیار اور محبت کا جذبہ تھا تو ایاز بھی اپنے بادشاہ اور حکمراں کی خدمت سے غافل نہیں تھا۔ وہ بھی اس کا اتنا ہی خیال رکھتا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ''مستی کے عالم میں ایک رات محمود نے ایاز کو حکم دیا کہ اپنی لمبی لمبی زلفوں کو آدھی آدھی کاٹ دو۔ ایاز نے فوراً حکم کی تعمیل کی لیکن محمود صبح کو اس حکم سے بے حد نادم ہوا۔''(46)

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
(اقبال)

فارسی اور اردو ادبیات میں محمود ایک بت شکن سلطان؛ ایاز، ایک فرماں بردار، معتمد اور محبوب غلام کی حیثیت سے مشہور ہے۔ عشق محمود و ایاز اور زلفِ ایاز بھی تلمیحاً استعمال ہوتے رہے ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
(اقبال)

● مرغِ سلیماں:

ہد ہد، حضرت سلیمان کی حکومت میں ایک پرندہ تھا۔ حقیقت میں تو وہ صرف ایک پرندہ تھا مگر اس کے ذمہ حکومت کے کئی کام تھے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ہد ہد، پرندوں کے ساتھ مل کر لشکر سلیمان پر سایہ افگنی کرتا تھا اور وہ حضرت سلیمان کے لیے پانی کا کھوجی تھا۔ زمین کے اندر جس جگہ بھی پانی ہوتا اور لشکر کو ضرورت پڑتی، تو ہد ہد پانی کی نشان دہی کر دیتا تھا۔ مگر سب سے اہم کام جو ہد ہد کے ذمہ تھا وہ تھا حالات سے باخبر رکھنے کا پیغام رسانی اور نامہ بری کا۔ قرآن نے بہت صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ حضرت سلیمان کا قاصد ہد ہد پرندہ تھا۔ چنانچہ ہد ہد نے ہی سب سے پہلے ملکۂ سبا کے بارے میں حضرت سلیمان کو اطلاع دی اور جب انھوں نے اسلام کی دعوت ملکہ کو بھیجی تو یہی ہد ہد، سلیمان کا قاصد بن کر ملکۂ سبا کے پاس ان کا خط لے کر گیا تھا۔ ہد ہد کی انھیں ذمہ داریوں اور دربارِ سلیمانی میں خاص حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے اسے مرغِ سلیماں اور قاصدِ سلیمان کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور انھیں خصوصیات کے پیشِ نظر اسے مبارک پرندہ بھی کہا جاتا ہے۔

عاشق اس غیرتِ بلقیس کا ہوں میں آتش
بام پر جس کے کبھی مرغِ سلیماں نہ گیا
(آتش)

خبر لیا یا ہے ہدہد میرے تئیں اس یار جانی کا
خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں رازِ نہانی کا
(قلی)

سیہ کاروں کے سر پر افسرِ عزت نظر آئے
بنے ہیں مرغِ عیسیٰ ان دنوں مرغِ سلیمانی
(منیر)

● مرغِ عرشی: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔

● مرغِ عیسیٰ:

حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے جن چار معجزوں سے نوازا تھا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ مٹی کے پرند بنا کر اس میں پھونک مارتے تھے تو خدا کے حکم سے اس کھلونے میں جان پڑ جاتی تھی اور وہ اڑنے لگتا تھا۔ قرآن شریف میں دو مقامات پر اس معجزے کا ذکر ہوا ہے۔ قرآن میں مرغِ عیسیٰ کی تخصیص کسی پرندے کے ساتھ نہیں کی گئی ہے لیکن تفسیر کی کتابوں میں مرغِ عیسیٰ کی جگہ پر چمگادڑ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اب مرغِ عیسیٰ، چمگادڑ کے مترادف کے طور پر عام ہے۔

انجیل متیٰ میں ایک دلچسپ واقعے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ ''بچپن کے دنوں میں عیسیٰ مٹی کے کھلونے بنا بنا کر کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ایک پرندہ بنا ڈالا اور اس سے اڑنے کے لیے کہا؛ پرندہ اڑ چلا۔''(47)

یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ نے چمگادڑ بناتے وقت اس کے مقعد کا دھیان نہیں رکھا۔ نسیان اور سہو انسانی سرشت کا خاصہ ہے۔ چنانچہ چمگادڑ آج بھی غیر معمولی پرندہ ہے یعنی یہ منہ سے پاخانہ کرتا ہے اس کے چار پانو ہوتے ہیں۔ اس کی مادہ کو حیض آتا ہے اور وہ

اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔

سیہ کاروں کے سر پر افسرِ عزت نظر آئے
بنے ہیں مرغِ عیسیٰ ان دنوں مرغِ سلیمانی
(منیرؔ)

''برہانِ قاطع میں مرغِ عیسیٰ کے ذیل میں آیا ہے کہ مٹی سے خفاش (چمگادڑ) کی شکل کا ایک پرندہ حضرت عیسیٰ نے بنایا تھا اور اس کے پاخانے کا سوراخ بنانا بھول گئے تھے۔ خدا کے حکم سے اس پرندے میں جان پڑ گئی اور وہ اڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا لیکن کہیں جا کر زمین پر گر پڑا اور مر گیا۔ پھر خدائے تعالیٰ نے اسی پرند کی شبیہ کا ایک اور پرندہ تخلیق کر دیا۔''(48)

● مرکبِ جم: تفصیل 'تختِ جمشید' کے تحت دیکھیں۔

● مریمؑ:

حضرت مریم علیہا السلام، مشہور پیغمبر حضرت عیسیٰ کی والدہ تھیں۔ یہ بنو اسرائیل کی انتہائی پاک دامن، عابدہ، زاہدہ اور باعصمت خاتون تھیں۔ بنو اسرائیل میں عمران نامی ایک عابد و پرہیز گار آدمی تھے، حضرت مریم انھیں کی صاحبزادی تھیں۔ عمران اور ان کی بیوی حنہّ لاولد تھے۔ حنہّ نے خدا کے حضور دستِ دعا دراز کیے اور نذر مانی کہ میرے جو اولاد ہوگی، میں اسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے نذر کر دوں گی۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت مریم کی ولادت ہوئی۔ ولادت کے وقت تک ان کے والد عمران کا انتقال ہو چکا تھا۔ مریم کی والدہ نے لڑکی ہونے کے باوجود انھیں بیت المقدس کی نذر کر دیا۔ مشہور پیغمبر حضرت زکریا علیہ السلام ان کے کفیل مقرر کیے گئے۔ وہ حضرت مریم کے خالو بھی تھے۔

حضرت مریم، شب و روز عبادتِ الٰہی میں مصروف رہنے والی خاتون تھیں۔ بنو اسرائیل میں ان کی زہادت، پاکدامنی اور تقویٰ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے

تھے۔ خود ان کے مربی اور کفیل حضرت زکریاؑ ان کی عبادت وریاضت اور تقویٰ و پاکیزگی سے انتہائی متاثر رہا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مریم پر انعاماتِ الٰہی اور فیضان و کرم کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ غرضیکہ حضرت مریم، خدائے عزوجل کی عبادت میں مستغرق رہتیں اور بیت المقدس کی خدمت بجالاتی تھیں، انھیں دنیا اور دنیا کے لوازمات سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ مریم، عفت و پاک دامنی، عصمت وحیا اور زہد و اتقا کا استعارہ ہیں۔

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجات دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم
(فیض)

- مسندِ جم: تفصیل 'تختِ جمشید' کے تحت دیکھیں۔
- مسیح، مسیحا: تفصیل 'ابن مریم' کے تحت دیکھیں۔
- معراجِ نبوی:

پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل کی معیت میں آسمانوں کی سیر کرائی گئی تھی جہاں آپ نے مختلف انبیائے کرام سے ملاقاتیں کیں، جنت و دوزخ کا مشاہدہ کیا اور خدا کے جمالِ جہاں آرا کی جھلک بھی دیکھی۔ یہ پورا واقعہ معراج کہلاتا ہے۔ قرآن میں یہ واقعہ بہت تفصیل سے تو مذکور نہیں ہے صرف دو مقامات پر اس کا ذکر کیا گیا ہے، البتہ مختلف حدیثوں میں اس اہم واقعے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ واقعۂ معراج مکی زندگی کے بالکل آخری ایام میں پیش آیا تھا اور یہ رات ماہ رجب کی 27/تاریخ تھی۔ 'معراج' عروج سے مشتق ہے جس کے معنی بلند ہونے اور چڑھنے کے ہیں اسی لیے زینے کو معراج بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ آدمی اس کی مدد سے بلندی کی جانب چڑھتا ہے۔ گویا اس خاص لفظ میں رفعتِ انسانی کے تمام مظاہر پیش کر دیے گئے ہیں کہ آسمانوں کی رفعتیں بھی اس آدمِ خاکی کے قدموں کی زد سے پرے نہیں ہیں۔

تفصیل اس واقعے کی یہ ہے کہ ایک رات جب نبی کریم محوِ خواب تھے، رات کے ایک حصے میں جبرئیل آئے اور بیدار کر کے خانۂ کعبہ میں اٹھالائے، وہاں لا کر کے آپ کا سینہ چاک کیا، اور دنیا کی کدورتوں اور آلائشوں سے اسے پاک کیا پھر ایمان اور حکمت کی خوبیوں سے بھر دیا اور تب آپ کو براق نامی ایک تیز رفتار جانور پر سوار کر کے مکہ سے بیت المقدس تک لے آئے۔ آپ نے وہاں نزول فرمایا اور انبیا کی امامت فرماتے ہوئے نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آسمان پر پرواز کرنے کی تیاری شروع ہوگئی۔ براق پر سوار ہو کر آپ جبرئیل کی معیت میں آسمان تک پہنچے اور مختلف آسمانوں پر مختلف نبیوں اور رسولوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ چنانچہ پہلے آسمان پر حضرت آدم، دوسرے پر حضرت عیسیٰ اور حضرت یحیٰؑ، تیسرے آسمان پر حضرت یوسف، چوتھے آسمان پر حضرت ادریس، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون، چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم سے ملاقات کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ تمام پیغمبروں نے آپ کو خوش آمدید اور مرحبا کہا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

اللہ کے رسول کو وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا۔ سدرۃ المنتہیٰ ایک بیری کا درخت ہے اس درخت کے آگے نبیؐ کے علاوہ کسی انسان، نبی یا فرشتے کا گزر نہیں ہوسکا ہے۔ یہیں پہنچ کر حضرت جبرئیل کے قدم رک گئے، اس کے آگے ان کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ بہر حال رسولِ پاک اس سے بھی آگے گئے اور خدا تعالیٰ سے باتیں کیں اور خدا کی خاص تجلی اور نور کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کیا۔ آپ اللہ کے اتنے قریب تھے کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ اتنی نزدیک سے خدائے تعالیٰ سے باتیں کرنے کا شرف صرف محمد ﷺ کو ہی حاصل ہے۔

تو ہے حق ستی ہم زباں ہم کلام
ترا قاب قوسین ادنیٰ مقام

(ولیؔ)

سفرِ معراج کی اور بہت سی خصوصیتوں کے ساتھ ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ طویل ترین سفر رات کے ایک قلیل حصے میں ہی مکمل ہو گیا تھا۔ یہ اپنے آپ میں ایک بڑا معجزہ ہے۔ رسولِ پاک پہلے پہل مسجد حرام سے بیت المقدس تک گئے، صرف مسجد حرام سے بیت المقدس کا فاصلہ اس قدر تھا کہ اس زمانے میں آمد و رفت کے جو وسائل اور ذرائع مہیا تھے، ان سے یہ سفر چالیس دنوں میں طے کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہاں سے آسمانوں کی سیر، انبیا سے ملاقاتیں، جنت و دوزخ کا مشاہدہ اور خدائے تعالیٰ سے ہم کلامی، یہ تمام واقعے، معجزے کا ہی حصہ ہو سکتے ہیں۔

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات
(اقبال)

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
(اقبال)

- **معلم الملکوت:** تفصیل 'ابلیس' کے تحت دیکھیں۔

- **من و سلویٰ:**

فرعون کی قہر مانی سے صحیح سلامت بچ کر نکل آنے کے بعد بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے پہلا مطالبہ پانی کا کیا تھا اور موسیٰ کی ضربِ کلیمی سے پتھر کی چٹان سے بارہ چشمے جاری ہو گئے تھے۔ اب بنو اسرائیل نے کھانے کا مطالبہ کیا۔ موسیٰ نے بارگاہِ ایزدی میں دستِ دعا دراز کیے۔ اور ان کی دعا کو شرفِ قبولیت بھی بخشا گیا۔ ہوا یہ کہ رات تو بیت گئی اور صبح ہوئی تو بنو اسرائیل نے دیکھا کہ زمین اور درخت کے پتوں پر جا بجا سفید دانے کی طرح، شبنم کی صورت میں، آسمان سے کوئی چیز برس کر گری ہوئی ہے؛ کھایا تو نہایت شیریں حلوے کی مانند تھی یہ 'منّ' تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دن میں تیز ہوا چلی تو بٹیروں

کے غول کے غول آ کر زمین پر پھیل گئے۔ بنواسرائیل نے بآسانی ان کو پکڑ لیا اور بھون کر کھانے لگے۔ یہ 'سلویٰ' تھا۔ من کا ذائقہ شیریں تھا اور سلویٰ کا مزا نمکین تھا۔

دل میں شعر نمکین ، منھ میں زبانِ شیریں
من و سلویٰ بھی ہے خالق نے اتارا ہم کو
(قدر)

گویا رحمتِ الٰہی کی شان دیکھیے کہ بنواسرائیل اس طرح روزانہ آسمان سے نازل شدہ نعمتیں کھاتے اور گزر اوقات کرتے۔

یہی وہ قوم ہے جس کے لیے کھانوں کے مینہ برسے
کہ اترے من و سلویٰ جس کی خاطر آسماں پر سے
(حفیظ)

مگر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ قومِ بنواسرائیل اس آسمانی نعمت سے گھبرا گئی۔ ایک دن سب جمع ہو کر کہنے لگے کہ ہم کو من و سلویٰ کی ضرورت نہیں ہے اپنے خدا سے کہو کہ وہ ہمیں کھیرا، ککڑی، مسور، لہسن اور پیاز وغیرہ چیزیں دے۔ اس ناشکری اور کفرانِ نعمت کی پاداش میں بنواسرائیل پر من و سلویٰ کا نزول روک دیا گیا اور ان پر ذلت و مسکنت طاری کر دی گئی۔

سیر رکھتا ہے طبیعت کو کلام شیریں
من و سلویٰ ہے یہ اپنے لیے گویا اترا
(آتش)

● منصور انا الحق:

حسین بن منصور حلاج، ایران کے ایک مشہور عارف اور صوفی تھے۔ ان کی تاریخِ ولادت 858ء کے آس پاس ہے۔ چالیس سال تک گوشہ نشین رہنے کے بعد آخر کار انھوں نے عوام سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا اور خراسان اور فارس کے مختلف علاقوں میں صحرا نوردی کرتے رہے۔ 908ء میں اپنے وطنِ عزیز کو واپس لوٹے۔ ان کی بے خودی اور وارفتگی کا یہ

عالم تھا کہ زبان سے انا الحق انا الحق کا نعرہ بلند کرتے رہتے۔ شدہ شدہ یہ خبر بادشاہِ وقت کے پاس پہنچی، علمائے شریعت نے ظاہری اعمال پر حدِ شرعی نافذ کردی اور انھیں کوڑوں کی سزا تجویز کی گئی، پھر بھی ان کے عالمِ وارفتگی و سرمستی میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ مسلسل انا الحق انا الحق کا ورد کرتے رہے۔ آخر کار خلیفۂ وقت مقتدر عباسی کے وزیر حامد بن عباس کے حکم سے منصور کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور 921ء میں شہر بغداد میں سرِراہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی
حق جو کہے ہے اس کو یاں دار کھینچتے ہیں
(میرؔ)

منصور کی نعرہ زنی اور اس پر حدودِ شرعی نافذ کرنے کے بارے میں علمائے شریعت اور عارفانِ طریقت کے مابین اختلاف کی ایک خلیج حائل ہے۔ اس اختلاف کی پشت پر یہ خیال ہے کہ کیا منصور کی نعرہ زنی شرک تھی یا وہ خدائے واحد وقہار کے سربستہ رازوں سے آگاہی رکھتا تھا اور اس نے ان رازوں سے پردہ اٹھا دیا تھا، جس کی وجہ سے علمائے شریعت نے اس پر حد نافذ کردی۔ اس امر میں صاف بات یہ ہے کہ اہلِ شریعت ہمیشہ ظاہری اقوال و اعمال پر ہی اپنا فیصلہ دیتے ہیں اور منصور کے ظاہری اقوال حدودِ شرعی میں آتے تھے، اس لیے اس کی یہ سزا تجویز کی گئی۔ دنیا اہلِ عشق کی بے باکی و جرأت پر ہمیشہ سے سزا دیتی آئی ہے۔

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش
(اقبالؔ)

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
(اقبالؔ)

کہا جاتا ہے کہ جب منصور کو سولی پر چڑھایا گیا تب بھی ان کا جسد خاکی اناالحق کی صدا بلند کرتا رہا۔ یہ دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے، سر قلم کر دیا گیا، ان کی لاش کو نذرِ آتش کر دیا گیا اور راکھ دریائے دجلہ میں بہادی گئی پھر بھی اناالحق اناالحق کی صدا سے ساری فضا معمور تھی۔

صدا ہے خون میں بھی منصور کے اناالحق کی
کہے اگر کوئی توحید اس قدر تو کہے
(ذوقؔ)

یہاں ایک نکتے کی جانب اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ عارف باللہ اور بزرگ صوفی جسے پھانسی پر لٹکایا گیا تھا اس کا اصل نام حسین بن منصور تھا مگر تاریخ میں یہ شخص اپنے اصل نام سے نہیں بلکہ اپنے باپ منصور کے نام سے مشہور ہوا۔ سولی حسین کو دی گئی تھی منصور کو نہیں مگر شعر و ادب اور تاریخ کی کتابوں میں بیش تر جگہوں پر سولی کے ساتھ منصور کا نام جڑا ہوا ہے حقیقت میں یہ مصلوب شخص حسین ہیں اور حسین منصور، منصور اور منصور حلاج کے نام سے ان کا ذکر ہوتا آیا ہے۔

حسین بن منصور کو حلاج کے لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ حلاج کے معنی 'روئی دھننے والا' کے ہوتے ہیں۔ عطار، حسین منصور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ان کو حلاج اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک بار یہ روئی کے انبار پر سے گزرے تھے اور روئی کی طرف کچھ اشارہ کیا تھا۔ فوراً ہی روئی سے دانے پھوٹ پھوٹ کر باہر نکلنے لگے اور خلقِ خدا اسے دیکھ دیکھ کر متحیر تھی"۔

● منکر و نکیر:

ان دو فرشتوں کے نام ہیں جو قبر میں مردے سے سوال و جواب کرتے ہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ "قبر میں یہ فرشتے، مردوں سے اس کے رب اور پیغمبر اور دنیا میں اس کے اعمال کے بارے میں سوالات کرتے ہیں، اگر بندہ مومن اور باعمل رہتا ہے تو ان کے سوالات کا صحیح صحیح جواب دیتا ہے اور فرشتے انعام کے طور پر اس کی قبر کو کشادہ کر دیتے

ہیں اور جنت کی خوش خبری سناتے ہیں۔ اور اگر بندہ دنیا میں ضلالت اور گمراہی کی راہ پر چلتا رہا ہے تو لاجواب رہ جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کی قبر تنگ کردی جاتی ہے جہاں وہ عذاب دائمی کا شکار رہتا ہے۔"(49) قبر کے ان دو فرشتوں کو منکر نکیر کے علاوہ نکیرین بھی کہا گیا ہے۔

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا
(سودؔا)

بغیر از گور زاہد کنج تنہائی کہاں، سو بھی
نکیر و منکر اس جا ہوں تو پھر معلوم تنہائی
(سودؔا)

● مور و سلیمان:

فارسی زبان میں مور، چیونٹی کو کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں حضرت سلیمان اور چیونٹی کے واقعے کو کافی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سورت میں اس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے، واقعے کی اہمیت کے پیشِ نظر اس سورت کا نام ہی سورۂ نمل رکھ دیا گیا ہے۔ نمل، عربی زبان میں چیونٹی کو کہتے ہیں۔ واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان اپنے عظیم الشان لشکر کے ساتھ کہیں جا رہے تھے تمام لشکری اپنے اپنے قرینے سے قطار در قطار رواں دواں تھے۔ چلتے چلتے ان کا گزر ایک ایسی وادی سے ہوا جہاں چیونٹیاں بے شمار تھیں اور پوری وادی چیونٹیوں کا مسکن معلوم ہو رہی تھی۔ چیونٹیوں کی سردار نے جب لشکرِ سلیمان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو حفظ ما تقدم کے طور پر چیونٹیوں سے گویا ہوئی کہ تم تمام لوگ اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ، ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں تم کو روند ڈالے۔ حضرت سلیمان نے، جن کو 'علم منطق الطیر' سے نوازا گیا تھا، یہ عاقلانہ تدبیر سنی تو پہلے مسکرائے اور پھر ہنس پڑے۔ اور چیونٹی جیسی کم مایہ اور حقیر مخلوق کی گفتگو سن کر

ان کے دل میں شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ فرطِ سرور ونشاط سے انھوں نے خدائے تعالیٰ کی نعمتوں پر تشکر واحسان مندی کا اظہار کیا۔

'چیونٹیوں کی وادی' کے محل وقوع کے بارے میں مورخین اور مفسرین نے کئی مقامات کا تعین کیا ہے، مگر اکثر لوگ یہ وادی، عسقلان کے قریب بتلاتے ہیں، کچھ لوگوں نے شام کے کسی علاقے میں اس کی تعیین کی ہے۔ چیونٹیوں کی جسامت اور قد کے بارے میں بھی مفسرین ایک رائے نہیں ہیں۔ نوف بکالی کے بقول "ان چیونٹیوں کا قد بھیڑیے کے برابر تھا" ایک مصری عالم احمد زکی پاشا نے چیونٹیوں کے معنی 'انبوہِ انسانی' مراد لیے ہیں، مگر یہ تمام دلائل اور تفاسیر دور از کار اور اسرائیلیات سے متاثر ہیں۔ قرآن میں واضح طور پر ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہی منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس واقعے میں جن چیونٹیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہی کم مایہ، حقیر اور بے بضاعت چیونٹیاں ہیں، ورنہ چیونٹیوں کی سرداران سے بلوں میں گھسنے اور قدموں تلے روندے جانے کے امکان کا ذکر نہ کرتی۔

قرآن نے صرف اسی ایک واقعے کا ذکر کیا ہے لیکن بعض کتابوں میں حضرت سلیمان اور چیونٹی کے متعلق ایک آدھ واقعات کا مزید ذکر ملتا ہے۔ غالباً ان کا مصدر و مرجع اسرائیلی روایات ہوں گی۔ اسی ضمن میں وہ روایت بھی آتی ہے "جس میں ایک چیونٹی نے ایک مرتبہ حضرت سلیمان اور ان کے بے حد وحساب لشکر کی ضیافت کا اہتمام کیا، تمام لشکر نے شکم سیر اور آسودہ ہو کر کھایا مگر کھانا پھر بھی بچ رہا۔ حضرت سلیمان اس ضیافت سے بہت متاثر ہوئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جو قدرت اور سخاوت میرے اندر ہے وہ ایک حقیر کیڑے کو بھی بخشی گئی ہے۔"(50)

کس کو معلوم نہیں حوصلۂ مورِ ضعیف
جس نے دعوت میں سلیماں کا بلایا لشکر

(اسیرؔ)

اسی طرح ابن ابی عساکر اور ابن ابی حاتم نے ذکر کیا ہے کہ ایک بار حضرت

سلیمان کے زمانہ میں بارش نہیں ہوئی۔قحط کی حالت دیکھ کر نمازِ استسقا کی غرض سے حضرت سلیمان میدان میں نکلے۔ناگاہ ان کی نظر ایک ایسی چیونٹی پر پڑی جو اپنے اگلے قدم اٹھائے آسمان کی جانب نظریں کیے، بارش کی دعا مانگ رہی تھی۔حضرت سلیمان نے یہ دیکھ کر واپس ہونے کا حکم دیا کہ چلو، ایک حیوان کی دعا نے ہمارا کام کر دیا ہے اب تمھاری طلب کے بغیر ہی بارش ہوگی۔محدثین کے نزدیک ان روایتوں کو نبیؐ کی جانب نسبت کرنا محلِ نظر ہے۔

کم مت سمجھیو شاہ گدائے ضعیف کو
واں قدر ایک سی ہے سلیمان و مور کی
(سوداؔ)

خط کا آخر کوں ہوا رخ پہ پری رو کے گزر
مور کو راہ ملی ملکِ سلیمانی میں
(ولیؔ)

مت ہو مغرور اے کہ تجھ میں زور ہے
یاں سلیماں کے مقابل مور ہے
(میرؔ)

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
(اقبالؔ)

● مونڈھوں کے فرشتے: تفصیل 'کاتب اعمال' کے تحت دیکھیں۔

● مہرِ سلیمانی: تفصیل 'خاتم سلیمانی' کے تحت دیکھیں۔

● مہرِ نبوت:

رسول اللہ ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان ایک ابھرا ہوا نشان تھا،اسی کو مہر

نبوت کہا جاتا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں آتا ہے کہ ''آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت تھی جو کبوتر کے انڈے جیسی اور جسم مبارک ہی کے مشابہ تھی۔ یہ بائیں کندھے کی کرّی (نرم ہڈی) کے پاس تھی۔ اس پر مسوں کی طرح تلوں کا جمگھٹ تھا۔''[51]

عشق کے داغ کو دل مہرِ نبوت سمجھا
ڈر ہے کافر کہیں دعوائے نبوت نہ کرے
(ذوقؔ)

کچھ لوگوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ پشت مبارک کے اس نشان سے کلمۂ طیبہ ترتیب پاتا تھا جو آپ کی نبوت کا ثبوت تھا، مگر اس طرح کی روایتیں اور عقیدے بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔ لوگوں کو مہر نبوت کے لفظ سے تسامح ہوگیا ہے، چونکہ پشتِ مبارک کے اس مخصوص نشان کو بھی مہر کہا گیا ہے اور انگوٹھی پر منقش اس عبارت کو بھی مہر کہتے ہیں جس کا عکس کاغذ پر چھاپ کر کاغذات کو تصدیق شدہ بنایا جاتا ہے۔ مہر کے ان ہر دو معانی نے لوگوں کے ذہن میں ایک نیا مفہوم پیدا کردیا اور لوگوں نے مہر کے دونوں معنوں کو خلط ملط کردیا، جب کہ دونوں معنی اپنی الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ''جب رسول اللہ نے شاہان عرب کے نام خطوط لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ سے کہا گیا کہ بادشاہ اسی صورت میں خطوط قبول کرتے ہیں جب ان پر مہر لگی ہو۔ اس لیے نبی کریم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ نقش تھا۔ یہ نقش تین سطروں میں تھا۔ محمد ایک سطر میں، رسول ایک سطر میں اور اللہ ایک سطر میں۔''[52] سب سے اوپر اللہ کندہ تھا، پھر اس کے نیچے رسول اور سب سے آخری سطر میں محمد۔ اب تک نبیؐ نے کوئی مہر نہیں بنوائی تھی۔ اسی خاص غرض کے لیے آپ نے چاندی کی انگوٹھی تیار کرائی تھی جو مہر کا بھی کام دیتی تھی۔ یہ انگوٹھی رسول اللہ کے بعد ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اپنی خلافت کے زمانے میں پہنتے رہے، حضرت عثمان سے، آخر عہد خلافت میں یہ انگشتری مدینہ کے ایک چاہ 'بیر اریس' کے اندر گر گئی تھی، بہت تلاش کی گئی نہ ملی۔[53]

صفت مہرِ نبوت کا بیاں ہو کیوں کر
خامشی مہرِ دہن اور سخن ہے ششدر
(محسنؔ)

کیا مہرِ نبوت نے یہ ثابت
کہ ہے اب ختم فرمانِ رسالت
(مجروحؔ)

● میدانِ حشر: تفصیل 'روزِ قیامت' کے تحت دیکھیں۔

● ناقۂ لیلیٰ: تفصیل 'لیلیٰ مجنوں' کے تحت دیکھیں۔

● ناقۂ صالح:

حضرت صالحؑ قوم ثمود میں نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اس قوم کا نام ان کے جدِ اعلیٰ ثمود کے نام پر پڑا تھا۔ ثمود کا سلسلۂ نسب سام بن نوحؑ سے جا کر ملتا ہے اس طرح قوم ثمود ایک سامی قوم تھی۔ تاریخی اعتبار سے قوم ثمود حضرت ابراہیمؑ کی بعثت سے بہت پہلے ہلاک ہو چکی تھی۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے وادی قریٰ میں مدائن صالح کے نام سے ایک جگہ پڑتی ہے یہی علاقہ اس قوم کا مسکن تھا۔ فج الناقۃ اور حجر اس علاقے کے مختلف نام ہیں۔ مدینہ اور تبوک کے درمیان آج بھی اس قوم کے نشانات اور کھنڈرات سامانِ عبرت ہیں۔ قومِ عاد کی ہلاکت کے بعد ہود کے جو ہمراہی اس طوفانِ عظیم کی ہلاکت سے محفوظ رہ گئے تھے ثمود انھیں کی اولاد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو انواع واقسام کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ زراعت اور باغبانی کر کے یہ قوم آسودہ حال تھی، پہاڑوں کو تراش کر عالیشان محل اور کوٹھیاں تعمیر کر لیتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب شرک وبدعت نے اس قوم میں بھی اپنے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کیے۔ زرخیز میدان اور مرغزاروں پر شکریہ ادا کرنے کے بجائے یہ لوگ کفرانِ نعمت کا ارتکاب کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے صالحؑ کو اس قوم میں نبی بنا کر بھیجا مگر سابقہ اقوام کی طرح یہ لوگ بھی شرک وبدعت کے راستے سے پلٹنے کے بجائے خود خدا

کے فرستادہ پیغمبر کی تذلیل وتحقیر کرنے لگے اور صالح اور ان کے متبعین کی غربت اور بے سروسامانی پر طنز وتضحیک کے تیر برساتے رہے۔

آخر کار صالح کی پیغمبرانہ صداقت کے ثبوت کے لیے قوم نے حضرت صالح سے یہ مطالبہ کیا کہ اگر تم سچے نبی اور رسول ہو تو معجزے کے طور پر سامنے کے پہاڑ سے ایک اونٹنی ظاہر کردو جو حاملہ ہو اور فوراً بچہ دے دے۔ حضرت صالح نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی، ناگاہ لوگوں نے دیکھا کہ سامنے پہاڑ کی چٹان سے ایک اونٹنی ظاہر ہوئی اور ظاہر ہوتے ہی اس نے ایک بچے کو جنم دیا (اسے ناقۃ اللہ بھی کہا گیا ہے) قومِ صالح پھر بھی اقرار نبوت سے گریز کرتی رہی۔ اب صالح نے قوم کے افراد کو آگاہ کر دیا کہ یہ خدا کا فیصلہ ہے کہ پانی کی باری مقرر ہو۔ ایک دن اونٹنی کے لیے اور ایک دن قوم اور اس کے چوپایوں کے لیے۔ جس دن تمھاری باری ہوگی اونٹنی اس دن گھاٹ پر نہیں آئے گی اور جس دن اونٹنی کی باری ہوگی تمھیں گھاٹ پر آنے کی اجازت نہیں ہے۔

کچھ دنوں تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ اونٹنی آزادانہ اپنی باری پر گھاٹ سے پانی پیتی اور بلا روک ٹوک گھاس چارا کھا کر گزارا کرتی۔ حضرت صالح کی قوم اس کا دودھ دوہتی اور فائدہ اٹھاتی۔ دن اور مہینے گزرنے کے ساتھ ساتھ قوم کے دماغ میں شیطنت اور بدنیتی کروٹیں لینے لگی۔ وہ خدا کی اونٹنی کے درپے آزار ہو گئے اور کچھ سرکش اور مغرور افراد نے اونٹنی کے قتل کا تانا بانا بن ڈالا۔ آخر کار اونٹنی ایک دن پہاڑ کے غار سے نکل کر گھاٹ کی جانب چلی آ رہی تھی قوم کے بدبخت ترین شخص قیدار بن سالف نے کمین گاہ سے نکل کر اس کی کوچیں کاٹ ڈالی اونٹنی زمین پر گر پڑی قیدار بن سالف نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اونٹنی کا بچہ یہ دیکھ کر بھاگتا ہوا پہاڑ کی وادیوں میں غائب ہو گیا۔

معجزِ انصاف سے تیرے سرِ دشت وجبل
ہر غزالہ ناقۂ صالح ہے گویا بے زمام
(ذوقؔ)

اس واقعے کی اطلاع جب حضرت صالح کو ملی تو وہ آبدیدہ ہو کر گویا ہوئے ''اب تمھیں صرف تین دن کی مہلت ہے چوتھے دن تمھیں ہلاک کر دیا جائے گا۔وقتِ موعود آ پہنچا اور ایک زبردست چیخ بجلی اور کڑک نے پوری قومِ ثمود کو موت کی آغوش میں سلا دیا۔

● نامۂ اعمال: تفصیل 'کاتب اعمال' کے تحت دیکھیں۔

● نخلِ طور: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔

● نخلِ مریم:

حضرت مریم ،ایک دن بیت المقدس کے مشرقی جانب ،لوگوں کی نگاہوں سے دور یکہ وتنہا بیٹھی تھیں کہ خدا کا فرشتہ انسانی شکل میں نمودار ہوا۔ایک انسان کو اس طرح بے حجابانہ دیکھ کر حضرت مریم گھبرا گئیں۔فرشتے نے ان کو تسلی اور دلاسا دیا اور ساتھ ہی ساتھ بیٹے کی بشارت بھی سنائی۔حضرت مریم نے کہا ''میں نہ تو شادی شدہ ہوں اور نہ ہی زانیہ ہوں پھر یہ کیسے ممکن ہوگا'' فرشتے نے یہ سن کر حضرت مریم کے گریبان میں پھونک ماری، اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا اور چند ہی دنوں کے بعد وہ خود کو حاملہ محسوس کرنے لگیں۔وضع حمل کی مدت جوں جوں نزدیک آتی گئی ،حضرت مریم کی اضطراب و بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ قوم چونکہ حقیقتِ حال سے باخبر نہیں ہے اس لیے وہ اتہام والزام تراشی سے باز نہیں آئے گی۔یہ سوچ کر وہ بیت المقدس سے تقریباً نو میل کے فاصلے پر کوہِ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلے پر چلی گئیں یہ جگہ اب 'بیت اللحم' کے نام سے مشہور ہے۔یہاں پہنچ کر چند دنوں کے بعد دردِ زہ شروع ہو گیا ،وہ ایک درخت کا سہارا لے کر بیٹھ گئیں۔تکلیف اور اضطراب کے عالم میں ان کے منہ سے چند ایسے کلمات نکل پڑے جن سے موت کی خواہش کا اظہار ہوتا تھا۔اسی وقت فرشتے نے پہاڑ کے نشیب سے آواز دی کہ مریم! غمگین نہ ہو، تیرے خدا نے تمھارے تلے نہر جاری کر دی ہے ،تو کھجور کا تنا پکڑ کر اپنی جانب ہلا اور پکے اور تازہ کھجور کھا پی۔اور بچے کے

دیدار سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا۔ پہاڑ کی اسی وادی میں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تھے اور کھجور کا یہی درخت، نخلِ مریم کے نام سے جانا جاتا ہے۔

- نخلِ موسیٰ: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔

- نسخۂ عیسیٰ: تفصیل 'اعجاز مسیحا' کے تحت دیکھیں۔

- نغمۂ داوٗد: تفصیل 'لحنِ داوٗدی' کے تحت دیکھیں۔

- نفس عیسیٰ: تفصیل 'اعجاز مسیحا' کے تحت دیکھیں۔

- نکیرین: تفصیل 'منکر و نکیر' کے تحت دیکھیں۔

- نگینِ سلیمانی: تفصیل 'خاتم سلیمانی' کے تحت دیکھیں۔

- نل دمن:

جس طرح لیلیٰ مجنوں کی داستان عشق و محبت صحرائے عرب کے ریگستانوں میں گونجی تھی، شیریں اور فرہاد کے عشقیہ نغموں سے کوہ بے ستون کی وادیاں نغمہ زار بن گئی تھیں اسی طرح نل دمن کے عشقیہ افسانے نے ہمالیہ کی وادیوں میں رہنے والوں کو عشق و وفاداری کا پیغام دیا تھا۔ نل دمن کا افسانہ سرزمین ہند کا ایک عشقیہ افسانہ ہے جس کے پہلو میں محبت، حسن اور وفاداری کے کئی دلچسپ پہلو پوشیدہ ہیں۔

نل، اجین کا راجا تھا۔ ایک رات اس نے دکن کے راجا کی بیٹی کو خواب میں دیکھا اور اس پر نادیدہ عاشق ہوگیا۔ کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ اسی شب راجا کی بیٹی دمن نے بھی خواب میں ایک شخص کو دیکھا تھا اور اس کے حسن و جمال پر دل و جان سے فریفتہ ہوگئی تھی، وہ شخص یہی راجا نل تھا۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے نادیدہ عاشق تھے، پھر کسی طرح ان کے عشق کا چرچا راجا نل کے باپ کے کانوں تک پہنچا، اس نے نیک ساعت دیکھ کر دونوں

کی شادی کردی۔ بدقسمتی سے شادی کے بعد نل اپنا سب راج پاٹ بھول گیا۔

نل کا چھوٹا بھائی پشکر اس سے حسد رکھتا تھا اس نے نل کو چوسر، شطرنج اور دوسرے لہو ولعب کا عادی بنادیا اور جوے میں نل کا سارا خزانہ، مال وزیور اور حکومت بھی جیت لی۔ نل کو جنگلوں کی خاک چھاننے پر مجبور ہونا پڑا۔ جنگل میں اس کے ہمراہ اس کی بیوی دمن بھی تھی۔ وہ ہر حال میں اس کی مونس وغم خوار تھی۔ بیوی کی بے کسی اور اداسی نل سے دیکھی نہ گئی۔ ایک دن دمن عالم خواب میں تھی کہ نل اسے چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ نیند سے جاگنے کے بعد جب دمن نے نل کو غائب پایا، بہت پریشان ہوئی اور جنگل جنگل قریہ قریہ اسے تلاش کرتی ہوئی کسی طرح ایک راجا کے محل میں پہنچ گئی۔

نل، جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتا رہا۔ اس کی آزمائش کے دن ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ جنگل میں ایک سانپ نے اسے ڈس لیا اور اس کا سارا بدن سیاہ ہوگیا، اس کی شکل وصورت اتنی مسخ ہوگئی تھی کہ پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔ دمن، مختلف آزمائشوں اور منزلوں سے گزرتی ہوئی اپنے ماں باپ کے محل میں واپس پہنچ گئی لیکن اسے نل کی یاد برابر ستاتی رہی۔ ایک برہمن نے اسے بتایا تھا کہ نل ابھی زندہ ہے۔ نل بھی گھومتے گھماتے دمن کے محل میں جا پہنچا لیکن کالی رنگت اور بدصورتی کے سبب دمن اسے پہچان نہ سکی۔ پھر کسی طرح دونوں آپس میں مل جل گئے اور ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ نل نے اپنی کھوئی ہوئی دولت وحکومت اور مال وزر بھی واپس پالیا۔ کچھ دنوں کے بعد نل اس دنیا سے چل بسا۔ دمن بھی اس کی چتا کے ساتھ ستی ہوگئی اور اس طرح دونوں عاشق ومعشوق اپنی اپنی منزل مقصود کو پہنچے۔ نل دمن کا قصہ عشق ومحبت، پاکیزگی، وفاداری؛ اور نامساعد حالات کے باوجود رفاقت نباہنے کا استعارہ ہے۔

وہ نظر نظر کی فسوں گری، وہ سکوت کی بھی سخنوری
تری آنکھ جادوئے سامری، ترے لب فسانۂ نل دمن
(فراق)

● نمرود:

قدیم زمانے میں جس طرح شاہانِ مصر فرعون کہلاتے تھے اور روم وایران کے فرماں روا قیصر وکسریٰ کے نام سے دنیا پر حکمرانی کرتے تھے اسی طرح شاہانِ عراق کا لقب نمرود ہوا کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم کے زمانے میں عراق کا بادشاہ نمرود تھا۔ (یاد رہے کہ ابراہیم کا آبائی وطن عراق کا ایک شہر اُر تھا) اس زمانے میں بادشاہ نہ صرف ملک وقوم کے حکمراں ہوتے تھے بلکہ رعایا انھیں اپنا معبود بھی تسلیم کرتی تھی اور ان کی پرستش کرتی تھی۔ نمرود کا ذکر قرآن شریف میں تو نہیں ہوا ہے مگر اسرائیلی روایتوں اور قدیم داستانوں میں یہ نام کثرت سے آیا ہے اور اب یہ نام اس قدر زبان زدِ خاص وعام ہو چکا ہے کہ ابراہیمؑ کا نام آتے ہی یہ نام بھی ہمارے ذہن پر رقص کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ابراہیمؑ کو آگ کے حوالے کیا گیا تھا تو بھی اس کا ذکر آتشِ نمرود جیسی ترکیبوں اور تلمیحوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

الغرض ابراہیمؑ کے زمانے میں نمرود بادشاہ نے اپنی خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی وہ خدائی کے دعوے سے دست بردار نہیں ہوا بلکہ الٹے ابراہیمؑ اور ان کے خدا سے دودو ہاتھ کرنے پر بضد رہا۔ داستانوں میں آیا ہے کہ نمرود نے جب خدا سے لڑائی کا ارادہ کرلیا تو چار نیزوں پر گوشت کے چار پایوں سے چار بڑے بڑے کرگس باندھ دیے اور خود اس صندوق میں سوار ہو گیا۔ کرگس اسے لے کر آسمان کی جانب پرواز کر گئے۔ اوپر جا کر نمرود نے آسمان کی جانب ایک تیر چھوڑا، خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرت سے وہ تیر خون آلودہ لوٹا دیا۔ نمرود نے یقین کرلیا کہ اس نے ابراہیمؑ کے خدا کو زخمی کر دیا ہے۔

نمرود نے دوبارہ خدا سے جنگ آزمائی کا ارادہ کیا۔ اس بار اس نے لاکھوں کی فوج تیار کی اور ابراہیمؑ اور ان کے خدا کو للکارنے لگا۔ اچانک آسمان سے مچھروں کا لشکر نمودار ہوا اور چشم زدن میں لشکر نمرودی نیست ونابود ہو گیا۔ ایک کمزور اور لنگڑا مچھر نمرود کی ناک کے راستے دماغ میں گھس گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مچھر نے نمرود کے دماغ پر حملہ کرنا

شروع کر دیا جب اس کے سر پر جوتے برسائے جاتے، اسے آرام ملتا اور جیسے ہی جوتوں کی بارش تھم جاتی، مچھر پھر حرکت میں آجاتا۔ ایک دن کسی ملازم نے نمرود کے سر پر ضربِ کاری لگائی جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور آخر چالیس دن تک شب و روز اس عذاب میں مبتلا رہ کر نمرود ہلاک ہو گیا۔

دماغ جھڑ گیا آخر ترا نہ اے نمرود
چلا نہ پسے سے کچھ بس تری خدائی کا
(سودا)

نمرود نے چونکہ خدائی کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا، اس لیے ناقص خدائی کے لیے نمرود کی خدائی کی تلمیح استعمال کی جاتی ہے اور جس مچھر نے نمرود کو ہلاک کیا تھا، اس کے لیے پشۂ نمرود کی تلمیح عام ہے کہ کس طرح بظاہر ایک معمولی، بے بضاعت اور چھوٹا سا کیڑا نمرود جیسے جابر و سرکش بادشاہ اور خدائی کا دعویٰ کرنے والے حکمراں کی ہلاکت کا سبب بنا اور اتنا ظالم و جابر اور سرہنگ حکمراں ایک معمولی مچھر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکا۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
(غالبؔ)

● نوحؑ:

حضرت نوحؑ، خدا کے ایک برگزیدہ پیغمبر اور آدمِ ثانی کے لقب سے ملقب تھے۔ ان کے اور حضرت آدم کے درمیان دس قرنوں یا دس پشتوں کا فاصلہ ہے۔ حضرت نوحؑ سے کچھ پہلے تک تمام لوگ عقیدۂ توحید پر قائم و دائم تھے۔ رفتہ رفتہ عوام الناس میں شیطان نے اپنی جگہ بنالی اور قوم کے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا۔ جب قوم کے صالحین فوت ہو گئے تو شیطان کے مشورے سے لوگوں نے ان کی تصویریں اور مجسمے بنا لیے کہ خدا کی عبادت کرنے میں ان صالحین کی مشابہت اختیار کرتے رہیں گے۔ زمانہ گزرنے کے

ساتھ ساتھ عقیدوں کا زوال شروع ہو گیا۔ مجسمے بجائے خود خدا بن بیٹھے اور ان کی پوجا شروع ہو گئی ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر جو قومِ نوحؑ کے صالحین تھے، معبود بنا دیے گئے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے نوحؑ کو نبی بنا کر بھیجا۔ نوح نے اپنی قوم کو خدا کے دین کی طرف پکارا اور سچے مذہب کی دعوت دی۔ انھوں نے بار بار یہ بھی تنبیہ کی کہ میں مال و جاہ اور منصب کا طلبگار بھی نہیں؛ میرا اجر وثواب تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ہزار کوششوں کے باوجود قوم پر ان کی نصیحتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ قوم ذلت وحقارت کے ساتھ راہِ کفر وشرک پر گامزن رہی۔ قوم کے امراء اور رؤسا نے تکذیب وتحقیر کا کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ شب وروز کی محنت اور تگ و دو کے بعد تقریباً چالیس افراد ہی حضرت نوحؑ کے پیروکار بن سکے، وہ بھی سماج کے کمزور، کم صاحب حیثیت لوگ۔ قوم حضرت نوح سے یہ مطالبہ بھی کرتی کہ تو پہلے ان کمزور اور غریب افراد کو اپنے پاس سے نکال دے تب ہم تیری بات سنیں گے۔ یہ ہمارے مرتبے کے نہیں کہ ہم اور یہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی مقام پر بیٹھ سکیں۔ حضرت نوحؑ کے انکار پر یہ لوگ زِچ ہو کر کہنے لگے کہ نوح! تو نے ہم سے خوب بحث کر لی اب ہم سے جنگ وجدل نہ کر جا اپنے خدا کا عذاب لے آ۔ آخر کار ناامید اور تنگ ہو کر حضرت نوح نے اپنی قوم کے لیے بددعا کی اور آسمانی طوفان نے پوری قومِ نوح کو غرقاب کر ڈالا، صرف وہ افراد صحیح سلامت اور محفوظ رہ گئے تھے جو نوحؑ کی تبلیغ کی بدولت مسلمان ہو گئے تھے۔

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
(اقبالؔ)

● نوشیرواں:

ایران کا مشہور بادشاہ نوشیرواں، عدل گستری اور انصاف پروری کا استعارہ ہے۔ یہ ساسانی بادشاہ قباد کا بیٹا، ہرمز کا باپ اور خسرو پرویز کا دادا تھا۔ اسی بادشاہ کے عہد میں

شطرنج ہندوستان سے ایران پہنچا اور کلیلہ ودمنہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ نوشیرواں 531ء میں تخت نشین ہوا اور 28 برس حکومت کرنے کے بعد 579ء میں فوت ہوا۔

● وادیِ ایمن، وادیِ سینا: تفصیل 'وادیِ مقدس' کے تحت دیکھیں۔

● وادیِ قیس، وادیِ مجنوں: تفصیل 'لیلیٰ مجنوں' کے تحت دیکھیں۔

● وادیِ مقدس:

حضرت موسیٰ نے مدین میں ایک لمبا عرصہ گزار دیا، اس دوران وہ اپنے خسر کے مویشیوں کی گلہ بانی کرتے رہے۔ ایک دن موسیٰ مع اہل وعیال بکریاں چراتے چراتے مدین سے کافی دور نکل گئے۔ گلہ بان چرواہوں کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ موسیٰ چلتے چلتے ایک پہاڑ کی وادی میں جا پہنچے۔ یہ کوہِ سینا کا مشرقی گوشہ تھا اور مدین سے ایک دن کی مسافت پر بحرِ قلزم کے دوشاخے (خلیج عقبہ اور خلیجِ سویز) کے درمیان، مصر کے راستے پر واقع تھا۔ کوہِ سینا ہی کو کوہِ طور اور طورِ سینا بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں 'طور سینین' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

موسیٰ پہاڑ کی وادی میں پہنچے تو رات ہو چکی تھی اور راستہ بھی نا معلوم تھا۔ سردی سخت تھی، اس لیے گرمی اور آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ موسیٰ نے چقماق (ایک پتھر جس سے آگ نکلتی ہے) استعمال کیا مگر سخت خنکی اور ٹھنڈک کی وجہ سے اس نے کام نہیں کیا۔ انھوں نے جب پہاڑ کی جانب نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں آگ کے شعلے چمک رہے ہیں۔ بیوی سے کہنے لگے تم یہیں ٹھہرو میں آگ لے آؤں، تاپنے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی راہبر مل گیا تو راستے کی بھی نشان دہی ہو جائے گی۔

یہ کہہ کر موسیٰ آگ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جب آگ کے قریب آئے تو دیکھا کہ ایک درخت ہے جس سے روشنی آ رہی ہے، سارا درخت بقعۂ نور بنا ہوا ہے مگر عجیب آگ ہے نہ تو درخت کو جلاتی ہے اور نہ ہی گل ہو جاتی ہے۔ موسیٰ یہ سوچتے

ہوئے آگے بڑھے جا رہے تھے مگر روشنی تھی کہ ان سے دور ہوئی جاتی تھی۔ اچانک موسیٰ کے دل میں خوف پیدا ہوا، اور انھوں نے پلٹنے کا ارادہ کیا۔ واپس ہوا ہی چاہتے تھے کہ اسی روشن درخت سے ندائے غیبی ان کے کانوں میں آنے لگی۔

''اے موسیٰ، میں ہوں تیرا پروردگار، پس تو اپنی جوتی اتار دے، تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔''(54)

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف
(اقبال)

ایک اور جگہ قرآن کی زبانی ارشاد ہے:

''پس جب موسیٰ وہاں پہنچے تو اس بابرکت زمین کے میدان کے دائیں کنارے کے درخت میں سے آواز دیے گئے کہ اے موسیٰ! یقیناً میں ہی اللہ ہوں، سارے جہانوں کا پروردگار۔''(55)

معلوم ہوا کہ آواز وادیِ مقدس کے کنارے سے آ رہی تھی جو مغربی جانب سے پہاڑ کے دائیں طرف تھی، یہاں درخت سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے جو دراصل رب کی تجلی کا نور تھا۔ اسی وادیِ سینا کے دامن میں خدائے تعالیٰ نے موسیٰ کو شرفِ کلامی سے نوازا اور انھیں منصب نبوت سے سرفراز کیا۔ اور معجزے کے طور پر 'عصائے موسیٰ' اور 'ید بیضا' کی کرامات بخشیں۔ چونکہ موسیٰ واحد ایسے نبی ہیں جن کو خدا نے شرف ہم کلامی بخشا تھا اسی رعایت سے ان کو کلیم اللہ کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لطف ہے
اہل تپش کو آتشِ سینا نہ چاہیے
(اصغر)

لیتے ہی دل جو عاشق دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھا کیا آئے کیا چلے
(ذوقؔ)

بہ ظاہر یہ ایک مختصر سا واقعہ ہے مگر اس اختصار کے باوجود اپنے دامن میں بے شمار تلمیحی پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ کوئی پہلو ایسا نہیں رہ گیا ہے جس پر شاعروں کی دور رس نگاہیں نہ پہنچی ہوں، شاعروں نے چند الفاظ، واقعات اور کیفیات سے سیکڑوں تلمیحی مرکبات تیار کیے ہیں۔ مثال کے طور پر موسیٰ جس وادی میں آگ تلاش کرنے گئے تھے اور ندائے غیبی سنی تھی اس کو وادیِ ایمن، وادیِ مقدس، وادیِ سینا اور وادیِ کوہِ طور کہا جاتا ہے۔

وہ قصہ موسیٰ پھر اے سوزِ جگر کہنا
کس آگ کی چنگاری دی وادیِ ایمن نے
(فانیؔ)

شب برات آ گیا ہے سب جگ کے تائیں روشن
جوں نور موسوی تھے روشن ہوا ہے ایمن
(قلیؔ)

یہ وادی جس پہاڑ کے دامن میں واقع تھی وہ طور پہاڑ تھا۔ اسی طور پہاڑ کو طورِ سینا اور کوہِ سینا بھی کہا گیا ہے، روشنی اور آگ جس درخت سے آ رہی تھی اور جس مبارک درخت پر موسیٰ نے نورِ الٰہی کی جھلک دیکھی تھی؛ اس کو نخلِ طور، نخل موسیٰ، شجرِ ایمن، شجرِ طور، درختِ مبارک، شجرِ کلیم اور شجرِ وادیِ ایمن بھی کہا جاتا ہے۔ گویا سامنے طور پہاڑ ہے اور نیچے کی وادی، وادیِ ایمن۔

وہ دیکھ سامنے ہیں نشیب و فرازِ شوق
بڑھ اور دو قدم کہ یہ ایمن وہ طور ہے
(فانیؔ)

کھاتا ہوں محبت میں اس آداب سے میں گل
گویا شجر وادیِ ایمن کا ثمر ہے
(مومنؔ)

بزمِ خوباں بسکہ جوشِ جلوہ سے پر نور ہے
پشت دشتِ عجزیاں ہر برگ نخلِ طور ہے
(غالبؔ)

گویا شجر وادیِ ایمن میں لگی آگ
کچھ اور بڑھا جذبِ دلِ موسیٰ عمراں
(محشرؔ)

پہاڑ کی وادی کے درخت پر جو شعلہ نورِ الٰہی کا مظہر تھا اس روشنی کو شرارۂ ایمن، شعلۂ ایمن، شعلۂ سینا، شمعِ ایمن، شمعِ سینا، آتشِ سینا، آتشِ وادیِ ایمن اور آتشِ موسیٰ وغیرہ ترکیبوں کے ساتھ بھی استعمال میں لایا گیا ہے۔

پتہ ملتا نہیں اب آتشِ وادیِ ایمن کا
مگر مینائے مے کی نور افشانی نہیں جاتی
(اصغرؔ)

تکلم ہے ترا یا شعلۂ وادیِ ایمن ہے
تبسم زیرِ لب ہے یا کلی کھلتی ہے جنت کی
(اصغرؔ)

یہاں ہم نے دانستہ طور پر کوہِ طور اور آتشِ کوہِ طور کا ذکر نہیں کیا ہے کیوں کہ برسہا برس کے بعد موسیٰ جب مصر سے واپس ہوئے اور بنو اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزاد کرا لائے تو دوبارہ کوہِ طور پر گئے تھے اور تجلی الٰہی کا دیدار حاصل کیا تھا۔ اس لیے دیدارِ الٰہی سے متعلق تفصیلات الگ جگہ بیان کی جائیں گی کیوں کہ یہ واقعہ دوسرے موقعے سے متعلق تھا۔

- وادیِ نجد: تفصیل 'لیلیٰ مجنوں' کے تحت دیکھیں۔

- ہاتف: تفصیل 'جبرئیل' کے تحت دیکھیں۔

- ہاروت ماروت: تفصیل 'چاہ بابل' کے تحت دیکھیں۔

● ہد ہد: تفصیل 'مرغ سلیماں' کے تحت دیکھیں۔

● ہفت خوانِ رستم: تفصیل 'رستم' کے تحت دیکھیں۔

● یاجوج وماجوج:

یاجوج وماجوج کا اطلاق ایک ایسی قوم یا مجموعۂ قبائل پر ہوتا ہے جو شر وفساد میں طاق، وحشت وبربریت جن کی سرشت، اور قتل وغارت گری جن کا شیوہ ہے۔ یہ قوم تہذیب وتمدن کی برکتوں اور روشنی سے کوسوں دور ہے۔ شاعری میں ان کا ذکر فسادی، وحشی، فتنہ پرور اور انتہائی طاقتور قوم کی حیثیت سے آیا ہے۔ اس قوم کے افراد اپنی پناہ گاہوں سے طوفانِ بلاخیز کی طرح اٹھتے اور مہذب ومتمدن قبائل پر حملہ آور ہو کر قتل و غارت گری اور لوٹ مار مچاتے تھے۔ یہی وہ قبائل ہیں جن کی روک تھام کرنے کے لیے ایران کے عظیم الشان بادشاہ سائرس نے لوہے اور تانبے کی آمیزش سے ایک مضبوط ومستحکم دیوار تعمیر کرادی تھی، جسے سدِ سکندری کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

یاجوج وماجوج کون ہیں؟ اور آخر یہ کہاں بستے ہیں کہ تہذیب وتمدن کی روشنی ان کی وحشت وبربریت کے اندھیروں کو روشن نہ کرسکی؟ اس بارے میں مفسرین اور مورخین نے بے شمار روایتوں کا ذخیرہ نقل کردیا ہے جن میں سے اکثر روایتیں اسرائیلیات کی دین ہیں جو عقلاً ونقلاً کسی طرح اعتماد کے لائق نہیں ہیں۔ ان تمام روایتوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یاجوج وماجوج ایسے قبائل کا مجموعہ ہیں جو جسمانی اور معاشرتی اعتبار سے عجیب وغریب زندگی کے حامل ہیں مثلاً وہ بالشت ڈیڑھ بالشت یا زیادہ سے زیادہ ایک گز کا قد رکھتے ہیں اور بعض غیر معمولی طور پر طویل القامت ہیں اور ان کے دونوں کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک اوڑھنے اور دوسرا بچھانے کے کام آتا ہے۔ چہرے، چوڑے چکلے اور قد کے ساتھ غیر متناسب ہیں اور یہ کہ یاجوج وماجوج ایک ایسی برزخی مخلوق ہیں جو آدمؑ کے صلب سے تو ہیں مگر حوا کے بطن سے نہیں ہیں۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ یاجوج وماجوج وہ قبیلے

ہیں جو یافث بن نوح کی نسل سے ہیں۔

ان مختلف روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ یاجوج وماجوج بھی اسی دنیا کی مستقل مخلوق ہیں وہ کوئی عجوبۂ روزگار مخلوق نہیں۔ اب رہا سوال ان کے مسکن و موطن کا، تو محققین لکھتے ہیں کہ یاجوج وماجوج کا وطن اور مسکن چینی ترکستان اور منگولیا کا وہ علاقہ رہا ہے جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا بلند اور مرتفع حصہ ہے۔ ان علاقوں میں جو قبائل مدتوں سے رہتے بستے چلے آئے ہیں صرف انھیں ہی یاجوج وماجوج کہا جاتا ہے لیکن اپنے مرکز اصلی سے ہٹ کر جو قبائل دوسرے مقامات میں جا آباد ہوئے اور تہذیب و تمدن سے آشنا ہو گئے تو انھوں نے اپنی شناخت کے لیے نئے نئے ناموں کا اختراع کر لیا اور ان کا تعلق اپنے مرکز اصلی سے اس طرح منقطع ہو گیا کہ ایک ہی نسل کے مختلف قبائل باہم دیگر حریف بن گئے۔ ان متمدن ومہذب قبائل پر یاجوج وماجوج کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ کے اوراق میں یہ بات رقم ہے کہ ماقبل تاریخ کے عہد سے لے کر پانچویں صدی عیسوی تک منگولیا کے اس علاقے سے مختلف قبائل اٹھتے رہے ہیں۔ ان کی ہمسایہ چینی قوم، ان کے دو بڑے قبائل کو 'موگ' اور 'یوچی' کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ پس یہی موگ ہے جو تقریباً چھ سو برس قبل مسیح یونان میں میگ اور میگاگ بنا اور عربی میں معرب ہو کر ماجوج ہو گیا اور غالباً یہی 'یوچی' یونانی میں یوگاگ اور عبرانی وعربی میں متصرف ہو کر 'جوج' اور 'یاجوج' کہلایا۔ اس طرح سے گویا ان تمام قوموں اور قبائل پر یاجوج وماجوج کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جو مغرب میں بحر کاسپین یا بحر اسود سے لے کر مشرق میں چین اور منگولیا کے علاقے تک پھیلے ہوئے ہیں اور جو ابھی بھی تہذیب و تمدن سے عاری اور بے بہرہ ہیں، وحشت و بربریت اور فتنہ و فساد کے خصائص ان میں ابھی بھی پوری طرح موجود ہیں۔

یاجوج وماجوج کی وحشت وخونخواری اور فتنہ و فساد کے بارے میں ایک اور بات بھی بیان کی جاتی ہے کہ قربِ قیامت میں ان کا اپنے علاقے سے خروج ہوگا اور وہ لوگ پوری دنیا میں قتل وغارت گری اور فتنہ و فساد کا بازار گرم کر دیں گے۔ ان کے اس طوفانی

حملے کے بعد قیامت آنے میں صرف صور پھونکنے کا مرحلہ باقی رہ جائے گا۔

یاجوج وماجوج کی فتنہ پردازیوں اور سدسکندری کے استحکام کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ قربِ قیامت میں یہ دیوار شکست وریخت سے دوچار ہو جائے گی اور یاجوج وماجوج اس دیوار کو توڑ کر باقی دنیا پر چھا جائیں گے اور عام قتل وغارت گری برپا کردیں گے۔ اس تصور کی پشت پر حدیثِ نبوی کے الفاظ موجود ہیں:

> ''وہ ہر روز اس دیوار کو کھودتے ہیں پھر کل کے لیے چھوڑ دیتے ہیں، لیکن جب اللہ کی مشیت ان کے خروج کی ہوگی تو پھر وہ کہیں گے کل انشاء اللہ اس کو کھودیں گے اور پھر دوسرے دن وہ اس سے نکلنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ زمین میں فساد پھیلائیں گے حتیٰ کہ لوگ قلعہ بند ہوجائیں گے، یہ آسمانوں پر تیر پھینکیں گے جو خون آلودہ لوٹیں گے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ ان کی گدیوں پر ایسا کیڑا پیدا فرمادے گا جس سے ان کی ہلاکت واقع ہوجائے گی۔'' (56)

حالانکہ اصول حدیث کی روشنی میں اس روایت کی حیثیت ایک اسرائیلی قصے سے زیادہ نہیں رہ جاتی مگر تلمیح کی صنعت کے نقطۂ نظر سے سدسکندری کا استحکام، یاجوج وماجوج کی فتنہ پردازیاں اور قربِ قیامت میں ان کا اپنے مرکز اصلی سے خروج کرنا اور تمام مہذب ومتمدن دنیا پر حملہ آور ہوجانا وغیرہ کچھ ایسے نکات ہیں شاعروں اور تلمیح نگاروں نے جس سے استفادہ کیا ہے۔

یاجوج ہو رقیب جب آیا تجن کے پاس
پیدا کیا حجاب سکندر کی سد کے تئیں
(ولی)

● **یدِ بیضا:**

حضرت موسیٰ کو وادیِ مقدس میں کلیم اللٰہی کے ساتھ ساتھ دو معجزے عطا کیے گئے

تھے ایک تو معجزہ وہی تھا جو ان کی لاٹھی کی شکل میں موجود تھا اور دوسرا معجزہ تھا یدِ بیضا کا۔ جب 'عصائے موسیٰ' کو 'اژدرِ موسیٰ' کی خصوصیت مل چکی تو خدا تعالیٰ نے درخت کے پیچھے سے پھر آواز دی اور حکم دیا کہ اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جا کر بغل سے مس کیجیے، وہ مرض سے پاک اور بے داغ چمکتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ دوسری نشانی ہے۔ موسیٰ نے جیسے ہی اپنا ہاتھ اپنی بغل سے مس کر کے باہر نکالا وہ سورج کی مانند روشن ہو گیا۔ اس میں سے تیز روشنی نکل رہی تھی۔

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
(اقبالؔ)

یدِ بیضا کے لغوی معنی ہیں 'سفید اور چمکتا ہوا ہاتھ' اور اس معجزے میں سفیدی اور چمک کی دونوں خاصیتیں موجود تھیں۔ معجزۂ یدِ بیضا کے متعلق مفسرین ایک دلچسپ کہانی نقل کرتے آئے ہیں۔ حالانکہ قرآن اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔ شاید یہ کہانی تورات میں رقم ہو۔ کہانی کا خلاصہ ہے کہ حضرت موسیٰ، زمانۂ طفلی میں ایک دن فرعون کی گود میں بیٹھے تھے۔ فرعون کی ڈاڑھی، موتیوں اور جواہرات سے مرصع تھی۔

دستِ فراش میں جاروب ہے ریشِ فرعون
فرش پہ پتلیوں میں الجھے جو صد ہا گوہر
(ذوقؔ)

بچوں کی عادت کے مطابق، موسیٰ نے فرعون کی ڈاڑھی پر ہاتھ چلا دیا۔ موتی کے چند دانے تو نکلے ہی، فرعون کی ڈاڑھی کے چند بال بھی ساتھ میں اکھڑ آئے۔ فرعون چراغ پا ہو گیا اور چاہا کہ اس معصوم بچے کو قتل کرا دے۔ فرعون کی بیوی راہ میں حائل ہو گئی اور عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ "یہ بچہ ہے اس کو مارنے سے درگزر کرو۔ اس کے نزدیک تو تمرہ (کھجور) اور جمرہ (چنگاری) دونوں برابر ہیں"۔ بادشاہ کو راہ سوجھی، اس نے کہا میں ابھی اس کا امتحان لیتا ہوں اگر اس نے انگارے کو دیکھ کر ہاتھ کھینچا تو ضرور قتل کرا دوں گا۔

لہذا جب فرعون نے کھجور کے چند دانے اور دہکتی آگ کے کچھ سرخ انگارے منگا کر موسیٰ کے سامنے رکھے تو فطرتِ طفلانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے موسیٰ نے جھٹ سے ہاتھ آگے بڑھایا اور ایک سرخ انگارہ اٹھا کر منھ میں رکھ لیا۔ وقفہ نہ گزرا تھا مگر آگ نے اپنا کام کرڈالا۔ زبان پر داغ پڑ گیا اور اسی وقت سے موسیٰ کی زبان میں لکنت آ گئی، ان کا ہاتھ بھی جل گیا تھا اور عیب دار ہو گیا تھا۔ اسی عیب دار ہاتھ کو وادیِ مقدس میں خدائے تعالیٰ نے معجزے میں تبدیل کر دیا تھا۔

خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر افشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ یدِ بیضا کروں
(ولیؔ)

گر کرے معجز نمائی جلوۂ رخسارِ یار
وہ کفِ آئینہ سے ہو جو یدِ بیضا سے ہو
(ذوقؔ)

ہے دست مری نبض کی تف سے یدِ بیضا
یہ معجزۂ تازہ، مسیحا کے لگا ہاتھ
(مومنؔ)

طلبِ حق میں اگر بادیہ پیما ہوتا
مرا ہر آبلۂ پا یدِ بیضا ہوتا
(ذوقؔ)

● یوسف:

حضرت یوسفؑ کی زندگی کے واقعات کی ایک ایک کڑی داستانی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی اور جوانی سے لے کر زندگی کے آخری ایاّم تک تحیر خیزی، تجسس، امتحان وآزمائش، حسن وعشق کی بلاخیزی، صبر واستقامت، عروج وزوال، بادشاہی وفقیری، گردشِ روزگار کی نیرنگیاں اور ستم ظریفی کے ہزار پہلو ہیں، یوسف کی

زندگی جنھیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، واقعات کی ان تمام کڑیوں کو سورۂ یوسف میں بڑی تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اور اس قصے کو 'احسن قصص' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کے فرزند اور حضرت اسحٰق و ابراہیمؑ کے پوتے پڑپوتے تھے۔ گویا پیغمبری اور نبوت کا یہ چوتھا سلسلہ تھا جو یوسفؑ پر اختتام پذیر ہوا۔ یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کی بیوی راحیل بنت لابان کے بطن سے تھے۔ راحیل کے بطن سے یعقوبؑ کا ایک اور بھی بیٹا، بنیامین، حضرت یوسف کا سگا بھائی تھا۔ مجموعی طور پر حضرت یعقوبؑ کے بارہ لڑکے تھے۔ حضرت یوسف کے گیارہ بھائی اور خود حضرت یوسف۔ حضرت یعقوب، حضرت یوسف سے بے پناہ محبت کرتے تھے ان کا یہ لگاؤ عشق کی منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ حضرت یوسف کو ایک لمحے کے لیے بھی وہ اپنی آنکھوں سے دور نہیں رکھتے تھے۔ جدائی کا ایک لمحہ بھی ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ لیکن قسمت کا رنگ دیکھیے کہ بچپن میں ہی یوسف اپنے والد سے جدا ہو گئے تھے اور برسہا برس کے بعد دوبارہ ان لوگوں کی ملاقات دیارِ مصر میں ہوئی جب یوسف مصر کے حاکم اعلیٰ بن چکے تھے۔

یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا
پاکیزہ گوہروں کی عزت نہیں وطن کے بیچ
(میرؔ)

● یوسف کی غلامی اور فروختگی:

برادران یوسف نے تو یوسف کو کنویں میں ڈال کر اطمینان سے گھر کی راہ لی اور وہاں یعقوبؑ کو من گھڑت ڈرامہ سنا کر مطمئن ہو گئے مگر تقدیر الٰہی کی کرشمہ سازیاں ابھی باقی تھیں۔ حسن اتفاق سے حجازی اسماعیلیوں کا ایک قافلہ سامان تجارت لے کر شام سے مصر جا رہا تھا۔ اس قافلے کا ادھر سے گزر ہوا۔ قافلے والوں نے کنویں سے پانی نکالنے کے لیے جیسے ہی ڈول لٹکایا، اندر یوسف نے سمجھا کہ شاید بھائیوں کو میری حالت زار پر رحم آ گیا ہے اور وہ میری رہائی کا سامان کرنے آئے ہیں۔ فوراً ہی ڈول پکڑ کر لٹک گئے۔ تاجر نے جب

ڈول نکالا تو اس میں ایک خوش شکل بچے کو دیکھ کر خوشی کے مارے چلانے لگا کہ 'غلام ہاتھ آیا، غلام ہاتھ آیا' قافلے والوں نے یوسف کو کنویں سے نکال کر اپنا غلام بنالیا۔

باہر نہ جاتا چاہ سے یوسف جو جانتا
لے کارواں مرے تیئں بازار جائے گا
(میرؔ)

اس زمانے میں مصر کے اندر غلاموں کی خرید و فروخت عام بات تھی۔ یوسف کو بھی قافلے والوں نے مصر کے بازار میں ایک غلام کی حیثیت سے بہت ہی معمولی قیمت میں فروخت کر ڈالا۔ یوسف جیسے نیک دل، فرشتہ صفت اور خوش شکل بچے کی صحیح قدر و قیمت قافلے والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی اور چند درموں کے بدلے انھوں نے یوسف جیسا غلام فروخت کر دیا۔

دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنس گراں کا
(سوداؔ)

دیارِ مصر پر اس وقت ریان بن ولید کی حکمرانی تھی۔ اس کا وزیر اعظم، جسے عزیزِ مصر کہا جاتا ہے، سیر کے لیے بازار سے گزر رہا تھا کہ یوسف پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اس نے یوسف کی معمولی قیمت ادا کی اور اپنے گھر لے آیا۔

گھر پر عزیزِ مصر نے جس کا نام 'فوطیفار' بتلایا گیا ہے، اپنی بیوی سے کہا کہ "اس بچے کو عزت و احترام سے رکھنا، کچھ عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ بخشے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں"۔

غرضیکہ اس طرح نسلِ ابراہیمی کا یہ خوش شکل بچہ یکہ و تنہا کنعان کے ایک تنگ و تاریک کنویں سے نکل کر تہذیب و تمدن کے گہوارہ، مصر کے ایوانوں تک جا پہنچا۔

تجھ کو یوسف کی خبر ہے کہ نہیں اے یعقوبؑ
بک گیا مصر میں ہو روئے نکو ہاتھوں ہاتھ
(سوداؔ)

● یونس:

حضرت یونس کو قرآن نے 'ذوالنون' اور 'صاحب الحوت' کہہ کر مخاطب فرمایا ہے۔ دونوں ہی الفاظ کے معنی 'مچھلی والے' کے ہوتے ہیں۔ ان القاب کی وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ یونس کو ایک سمندری مچھلی نے اپنے پیٹ میں ایک مدت تک بحفاظت رکھا تھا، اسی تعلق سے ان کو ان القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت یونس بن متّیٰ کا عہد، امام بخاری کی ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد کے درمیان کا ہے۔ یعنی یہ عہد تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح سے لے کر ایک ہزار سال قبل مسیح کے درمیان کا ہو سکتا ہے۔ حضرت یونس، عراق کے علاقے نینویٰ کے باشندوں کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے یہ شہر آشوریوں کا پایۂ تخت تھا اور اس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ سے کچھ اوپر تھی۔

بہر حال حضرت یونس نے اپنی قوم میں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا مگر اقوامِ سابقہ کی طرح ان کی قوم بھی تمرد و سرکشی سے باز نہ آئی اور حضرت یونس کی پیغمبرانہ شان و صداقت کی تکذیب کرتی رہی۔ اس رویّے سے دل برداشتہ ہو کر حضرت یونس نے اپنی قوم کو عذابِ الٰہی کی دھمکی دی اور عالمِ غیظ و غضب میں شہر چھوڑ کر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد قوم کو عذاب کے کچھ کچھ آثار نظر آنے لگے، انھوں نے یونس کی تلاش شروع کر دی تاکہ ان کے ہاتھوں اطاعت و فرماں برداری کی بیعت کریں کیونکہ وہ حضرت یونس کی پیغمبرانہ شان کے قائل تو تھے ہی، اعتراف نہیں کرتے تھے۔ الغرض تمام باشندگانِ شہر کھلے میدان میں نکل آئے اور خدا کے حضور صدق دلی سے توبہ و استغفار کے طالب ہوئے۔ خدا نے ان کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور عذاب سے نجات بخشی۔

ادھر حضرت یونس، دریائے فرات کے کنارے پہنچے۔ ایک کشتی مسافروں سے لدی روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ حضرت یونس اس میں سوار ہو گئے۔ جب کشتی روانہ ہوئی تو بیچ راہ میں سمندری موجوں نے آ گھیرا، کشتی ہچکولے کھانے لگی، مسافروں کو یقین

ہو گیا کہ اب یہ کشتی غرق ہو جائے گی۔ کشتی والوں نے کہا ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے، جب تک اسے کشتی سے الگ نہیں کیا جائے گا، نجات مشکل ہے۔ یونسؑ فوراً سمجھ گئے کہ یہ خدائی اشارہ ہے کیونکہ میں شہر سے خدا کی وحی کا انتظار کیے بغیر نکل آیا ہوں۔ انھوں نے کشتی والوں کے سامنے اپنے آپ کو سمندر کے حوالے کر دینے کی پیش کش رکھی مگر وہ لوگ رضا مند نہ ہوئے۔ آخر کار قرعہ اندازی کی نوبت آئی اور قرعے میں حضرت یونس کا نام آیا اور طوعاً و کرہاً انھیں سمندر کی موجوں کے سپرد کرنا پڑا۔ سمندر میں جانا تھا کہ ایک مچھلی خدا کے حکم سے انھیں صحیح سالم نگل گئی اور یوں حضرت یونس اللہ کے حکم سے مچھلی کے پیٹ میں پہنچ گئے، شکم ماہی ان کے لیے قید خانہ بنا دیا گیا۔

جب یونس نے خود کو شکم ماہی میں زندہ و سلامت پایا تو خدا سے دعا گو ہوئے اور عفوِ تقصیر کے طالب ہوئے۔ خدا تعالیٰ نے مچھلی کو دوبارہ حکم دیا اور مچھلی نے حضرت یونس کو صحیح سلامت ساحلِ سمندر پر اگل دیا، وہ انتہائی نحیف و ناتواں اور مضمحل ہو گئے تھے۔ اسی وقت اس چٹیل میدان میں اللہ نے ایک بیل دار درخت اگا دیا اور اس کے سایے میں حضرت یونس کو عافیت بخشی۔ حضرت یونس دوبارہ قوم میں واپس آ گئے اور ہدایت و رہنمائی کا فرض ادا کرتے رہے۔ مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونس کتنے دنوں تک رہے تھے؟ قرآن و حدیث اس ذکر سے خالی ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ چالیس دن تک اس میں قید رہے۔

فضل سے اللہ کے سالم رہے
حضرتِ یونس میانِ بطن حوت
(مصحفی)

نکل کر مہر ماہی کے شکم تے
ہوا یونس نمن مفروق غم تے
(ابن نشاطی)

• • •

حوالہ جات

(فرہنگ)

(1) قصص القرآن، حفظ الرحمان سیوہاروی، ج 1، ص:153
(2) املانامہ، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، ص:12
(3) شرح سودی ج 1، ص:45 بحوالہ فرہنگ تلمیحات، شیروس شمسیا
(4) اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات، حامد حسین، ص:24
(5) افاداتِ سلیم، وحیدالدین سلیم، ص:159
(6) تلمیحات، ممتاز حسین، ص:78
(7) ایضاً، ص:85
(8) تلمیحات، محمود نیازی، ص:48
(9) قرآن شریف، تفسیر حاشیہ، ص:1049
(10) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج1، ص:717
(11) قصص القرآن، حفظ الرحمان سیوہاروی، ج 1، ص:300
(12) تلمیحات، ممتاز حسین، ص:69
(13) قرآن شریف حاشیہ، ص:1492
(14) ایضاً
(15) لغاتِ کشوری، تصدق حسین، ص:547
(16) قرآن شریف حاشیہ، ص:42
(17) حضرت یوسف، ابوالکلام آزاد، ص:6
(18) صحیح بخاری، تفسیر سورۂ کہف، ص:212
(19) سورۂ یوسف:11
(20) سورۂ یوسف:13
(21) تفسیر ماجدی، عبدالماجد دریابادی، ج 1، ص:28

(22) شرح مثنوی شریف، ج1، ص:172
(23) ایران بعہد ساسان، اقبال، ص:677-681
(24) افادات سلیم، وحیدالدین سلیم، ص:166
(25) الفاروق، شبلی نعمانی، ص:55-56
(26) قرآن شریف، حاشیہ، ص:873
(27) ترجمان القرآن، ابوالکلام آزاد، ج2، ص:464-465
(28) تلمیحات، محمود نیازی، ص:23
(29) تاریخ اسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ج2، ص:59
(30) فرہنگ تلمیحات، شیروس شمسیا، ص:221
(31) قصص القرآن، حفظ الرحمان سیوہاروی، ج2، ص:181
(32) قصص القرآن، حفظ الرحمان سیوہاروی، ج1، ص:480
(33) فرہنگ تلمیحات، شیروس شمسیا، ص:415
(34) قصص القرآن، حفظ الرحمان سیوہاروی، ج1، ص:304
(35) ترجمان القرآن، ابوالکلام آزاد، ج2، ص:462
(36) قصص القرآن، حفظ الرحمان سیوہاروی، ج2، ص:366
(37) قرآن شریف حاشیہ، ص:1493
(38) سورۂ انفطار:9-12
(39) قرآن شریف حاشیہ، ص:1466
(40) سورہ الکہف:49
(41) قرآن شریف حاشیہ، ص:1749
(42) فرہنگ تلمیحات، شیروس شمسیا، ص:508
(43) تلمیحات، محمود نیازی، ص:379
(44) عہد وسطیٰ کا ہندوستان، ستیش چندر، ص:55
(45) مطالعہ تلمیحات واشارات اقبال، اکبر حسین قریشی، ص:353
(46) فرہنگ تلمیحات، شیروس شمسیا، ص:536

(47) ایضاً،ص:428

(48) ایضاً،ص:428

(49) مشکوٰۃ، ج1،ص:35

(50) تلمیحات،محمود نیازی،ص:212

(51) الرحیق المختوم،صفی الرحمان مبارک پوری،ص:757

(52) ایضاً،ص:547

(53) رحمت للعالمین،محمد سلیمان منصور پوری، ج1،ص:150

(54) سورۂ طہٰ:12

(55) سورۂ قصص:30

(56) قرآن شریف حاشیہ،ص:829

کتابیات

مصنف/مولف/مرتب	تالیف	مطبع	سن اشاعت
ابن نشاطی	پھول بن	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	1998ء
ابوالکلام آزاد	ترجمان القرآن جلد دوم	شیخ مبارک علی، لاہور	سن ندارد
ابوالکلام آزاد	حضرت یوسف	زمزم پریس، دہلی	1987ء
ابومحمد سحر	انتخاب قصائد اردو	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	1989ء
احتشام حسین	کلیاتِ میر	رام نرائن لال بینی مادھو، الہ آباد	1972ء
احمد عبدالعزیز نائطی	آصف اللغات	عزیز المطابع، حیدرآباد	1330ھ
احمد فراز	خانہ بدوش چاہتیں (ہندی)	جیا پرکاشن، نئی دہلی	2001ء
اصغر گونڈوی	سرودِ زندگی	ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی	سن ندارد
اقبالؔ	کلیاتِ اقبال	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1997ء
اکبر حسین قریشی	مطالعۂ اشارات وتلمیحات اقبال	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	1970ء
اکبر حیدری	مراثی دبیرؔ	اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ	1980ء
اکبر شاہ نجیب آبادی	تاریخ اسلام (جلد اول تا سوم)	تاج کمپنی، دہلی	1994ء
امام بخش صہبائی	حدائق البلاغت (ترجمہ)	نول کشور پریس، لکھنؤ	1931ء
انشاء اللہ خاں انشا	کلیاتِ انشاؔ	مجلس ترقی ادب، لاہور	1969ء

برج موہن دتاتریہ کیفی	کیفیہ	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	1975ء
تصدق حسین	لغات کشوری	دارالاشاعت اردو بازار، کراچی	سن ندارد
تنویر احمد علوی	کلیات ذوق	مجلس ترقی ادب، لاہور	1967ء
جگر مرادآبادی	شعلۂ طور	ادارہ بقائے اردو، حیدرآباد	1947ء
جوش ملیح آبادی	نقش ونگار	مکتبہ اردو، لاہور	1943ء
جوش ملیح آبادی	سیف وسبو	مکتبہ اردو، لاہور	1958ء
حالی	مقدمۂ شعروشاعری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1998ء
حامد حسین	اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات ومصطلحات	پاشا پرنٹنگ پریس، بھوپال	1977ء
حسرت موہانی	کلیات حسرت	کمل پرنٹنگ پریس، دہلی	1959ء
حفظ الرحمان سیوہاروی	قصص القرآن جلد اول تا چہارم	مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور	1994ء
حفیظ صدیقی	کشاف تنقیدی اصطلاحات	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	1985ء
داغ	مہتاب داغ	جدید اردو ٹائپ، لاہور	1962ء
دیا شنکر نسیم	مثنوی گلزار نسیم	اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ	1995ء
دیبی پرشاد سحر	معیار البلاغت	نول کشور پریس، لکھنؤ	1860ء
ذکاء الدین شایاں	اٹھارہویں صدی کی اردو شاعری کی فرہنگ	لیتھو پریس، علی گڑھ	1989ء
رشید حسن خان	انتخاب سودا	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	
رشید حسن خان	دیوان غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی	1986ء
رشید حسن خاں	دیوان ناسخ	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	1972ء
ساحر لکھنوی	فرہنگ تلمیحات ومصطلحات	ارتقا پبلشرز، لکھنؤ	1986ء
ساحر لدھیانوی	تلخیاں	نیا ادارہ، لاہور	1971ء

ستیش چندر	عہد وسطیٰ کا ہندوستان	این سی ای آر ٹی، نئی دہلی	1990ء
سید احمد دہلوی	فرہنگ آصفیہ	مطبع گلزار، شملہ	1888ء
سید حسین شاہ	خزینۃ الامثال	نول کشور پریس، لکھنؤ	سن ندارد
سید مہدی علی رضوی	آئینۂ تلمیحات	اصغر بک ڈپو، لکھنؤ	1934ء
سیدہ جعفر	کلیات قلی قطب شاہ	ترقی اردو بیورو، دہلی	1985ء
شاہ معین الدین احمد ندوی	تاریخ اسلام جلد دوم	دار المصنفین، اعظم گڑھ	1982ء
شبلی نعمانی	سیرت النبی جلد دوم	دار المصنفین، اعظم گڑھ	1920ء
شبلی نعمانی	شعر العجم، ج5	معارف پریس، اعظم گڑھ	1980ء
شبلی نعمانی	موازنۂ انیس و دبیر	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	1998ء
شبلی نعمانی	الفاروق	معارف پریس، اعظم گڑھ	1998ء
شجاعت علی صدیقی	حالی بحیثیت شاعر	سرفراز پریس، لکھنؤ	1981ء
شمس الرحمٰن فاروقی	درس بلاغت	ترقی اردو بیورو، دہلی	1981ء
شمس قیس رازی	المعجم	کتاب فروشی، تہران	سن ندارد
شیروس شمسیا	فرہنگ تلمیحات	خیابان دانش گاہ، تہران	1375ھ
صالحہ عابد حسین	انیس کے مرثیے جلد اول و دوم	ترقی اردو بیورو، دہلی	1990ء
صفی الرحمٰن مبارک پوری	الرحیق المختوم	المجلس العلمی، علی گڑھ	1988ء
ضیاء احمد بدایونی	دیوانِ مومن	شانتی پریس، الہ آباد	1933ء
ظہیر احمد صدیقی	کلیات آتش	رام نرائن لال بینی مادھو، الہ آباد	1972ء
ظہیر احمد صدیقی	کلیات فانی	ترقی اردو بیورو، دہلی	1992ء
عابد علی عابد	تلمیحات اقبال	مجلس ترقی ادب، لاہور	1959ء
عبد الرحمٰن	مراۃ الشعر	جید برقی پریس، دہلی	1929ء

عبدالسلام ندوی	شعرالہند	دارالمصنفین، اعظم گڑھ	1977ء
عبدالماجد دریا آبادی	تفسیر ماجدی	تاج کمپنی لاہور	سن ندارد
غلام ربانی	الفاظ کا مزاج	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	1983ء
غیاث الدین رام پوری	غیاث اللغات	نول کشور پریس، لکھنؤ	1826ء
فانی بدایونی	کلیات فانی	ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی	سن ندارد
فراق گورکھ پوری	رمزو کنایات	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	1977ء
فراق گورکھ پوری	گل نغمہ	سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	1947ء
فراق گورکھ پوری	روپ	سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	1977ء
فضل الحق	دیوان شاکر ناجی	یونین پریس، دہلی	1968ء
فیض احمد فیض	نسخہ ہائے وفا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1994ء
کالی داس گپتا رضا	کلیات چکبست	ساکار پبلشرز، بمبئی	1981ء
کرشن کانت	کلیات جگر	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	1977ء
گوپی چند نارنگ	املا نامہ	ترقی اردو بیورو، دہلی	1990ء
لالہ ٹیک چند بہار	جواہرالحروف	....	1739ء
محمد اقبال	ایران بعہد ساسان	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	1941ء
محمد جونا گڑھی	قرآن شریف (تفسیر)	شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کامپلکس، مدینہ	1417ھ
محمد حسن	دیوانِ آبرو	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	1990ء
محمد سلیمان منصور پوری	رحمت للعالمین جلد اول تا سوم	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1980ء
محمد علی فیضی	گلشن فیضی	جامعہ سلفیہ بنارس	1993ء
محمد فیروزالدین	لغات فیروزی (عربی)	فیروز پرنٹنگ ورکس، لاہور	1888ء
محمود نیازی	تلمیحات	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	1973ء

محمود نیازی	تلمیحات غالبؔ	غالب اکیڈمی، دہلی	1972ء
محمود الحسن	قرآن شریف (تفسیر)	شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کامپلکس، مدینہ	1993ء
محی الدین حسن	دلی کی بیگماتی زبان	نئی آواز، جامعہ نگر، دہلی	1976ء
مرزا محمد عسکری	آئینۂ بلاغت	صدیق بک ڈپو، لکھنؤ	1937ء
مرزا محمد عسکری	کلام انشاؔ	ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد	1952ء
مرزا مہذب لکھنوی	مہذب اللغات	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	1962ء
مسیح الزماں	کلیات مومن	رام نرائن لال بنی مادھو، الہ آباد	1971ء
معلوف الیسوع	المنجد	پرنٹنگ آفس، بیروت	1908ء
مفتی غلام سرور	جامع اللغات	....	1890ء
ممتاز حسین جون پوری	تلمیحات	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	1937ء
منشی چندر لال ویش	ذخیرۂ ادب	تعلیمی بک ہاؤس، مظفر نگر	1934ء
مولوی فیروز الدین	فیروز اللغات	زکریا بک ڈپو، سہارن پور	1992ء
میر حسن	مثنوی سحر البیان	اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ	1995ء
نائب حسین نقوی	فرہنگ انیسؔ جلد اول	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	1975ء
نثار احمد فاروقی	کلیات مصحفیؔ	کوہ نور پرنٹنگ پریس، نئی دہلی	1968ء
نجم الغنی	بحر الفصاحت	نول کشور پریس، لکھنؤ	1926ء
نور الحسن	نور اللغات	نیر پریس، لکھنؤ	1934ء
وحید الدین سلیم	افادات سلیم	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	1994ء
ولی دکنی	کلیات ولیؔ	انجمن ترقی اردو ہند، اورنگ آباد	1927ء
وہاب اشرفی	تفہیم البلاغت	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	2002ء
ہاجرہ ولی الحق	غزلیات سوداؔ	....	
یونس اگاسکر	اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی پہلو	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1988ء

●Dr. Abdul Haque,Advanced Twentieth Century Dictionary, Educational Publishing House,New Delhi, 1985

●Betler, Conscell's New English Dictionary

●P K Gode, The Practical Sanskrit-English Dictionary

●Ram Chandra Verma, Urdu-Hindi Shabd-kosh, Mumbai, 1967

●Ram Chandra Verma, Barmanik Hindi Shabd-kosh, Time Table Press, Banaras, 1946

●Sally Wehmeier, Oxford Advanced Learner's Dictionary, Oxford University Press, 2004

●VT Grigh, Encyclopaedia

●●●

اشاریہ

شخصیات

مقامات

• • •

FARHANG-E-TALMIHAT

By

Sauban Sayeed

انسان ہمیشہ اس بات کا متلاشی رہا ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے موثر ترین طریقے اور ترسیل خیالات کے نئے اسالیب کا استعمال کرے۔ ساتھ ہی ادائے مطلب کے دوران دامنِ ادب بھی ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔ جس کے لیے اس نے رمزواشارہ اور کنایے کے دامن میں پناہ لی، جہاں کچھ اور بھی ذرائع اس کے ہاتھ لگے۔ تشبیہ، استعارہ اور علم معانی وبدیع کی مختلف صنائع کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ ان تمام خوبیوں کو برتنے کے پیچھے یہی جذبہ اور محرک کام کرتا رہا کہ ادائے خیالات کے نئے نئے سانچے مہیا ہوں اور مخاطب کے دل ودماغ میں اشیا اور محسوسات کی صحیح تصویر کشی ہو سکے...... تلمیح بھی انھیں طریقہ ہائے اظہار میں سے ایک موثر طریقہ ہے، جس سے کلام میں وسعت پیدا ہوئی اور کلام، اختصار کی وادیوں سے نکل کر ایجاز کی سرحدوں میں پہنچ گیا۔

تلمیح میں ہمارے آبا واجداد کی نشانیاں، نقش ہائے قدم، اوہام وعقائد اور روایات کا ذخیرہ پوشیدہ ہے۔ افراد وقوم کے رمزیات، کنایات، اشارات اور تخیلات کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جو نسلاً بعد نسل خاندانی روایات اور عقائد کے طور پر اگلی نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہے...... تلمیح، تاریخ سے زیادہ قدیمی وجود رکھتی ہے۔ جب مورخ نے ابھی تدوینِ تاریخ کا آغاز بھی نہیں کیا تھا، تلمیح ارتقا کے کئی منازل طے کر چکی تھی اور اس کے دامن میں تلمیحات کے بھرپور خزانے موجود تھے۔ اساطیری داستانوں اور واقعات سے تاریخ کا دامن خالی ہے لیکن تلمیحات کے خزانے میں اساطیری داستانوں اور ان سے متعلقات کے بارے میں تفصیلی وضاحتیں درج ہیں اور وہ تلمیح کے انمول سرمایے ہیں۔

تلمیح کا رواج کسی نہ کسی انداز میں دنیا کی بیشتر زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ لاطینی، مصری، یونانی، انگریزی، عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ، ان سبھی زبانوں میں تلمیحات کے خزانے موجود ہیں۔ تلمیحات کا یہ خزانہ ہمیں اس نتیجے تک لے جاتا ہے کہ کسی زمانے میں ان مختلف قوموں یا ملکوں کا اس زبان وادب سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ ان تلمیحات کی مدد سے ہم ان قوموں یا دور افتادہ ملکوں کے رہن سہن اور رسم ورواج کے بارے میں واقفیت حاصل کر پاتے ہیں۔ تاریخ کی ان منتشر کڑیوں کو تنظیم وترتیب کی لڑی میں پرو دیا جائے تو اس امتزاج سے ایک بین الاقوامی تاریخِ ادب ومعاشرت مرتب ہو جائے گی جو نہ صرف گوناگوں واقعات اور عقائد سے مملو ہوگی بلکہ دل آویزی اور اثر آفرینی میں اپنی مثال آپ ہوگی۔

(مقدمہ سے ماخوذ)

ISBN 93-80934-13-0
9789380934136

M.R.Publications

Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books
10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com